مجموعۂ مجالس

(حصّہ اوّل)



مولانا سیّد محمد جعفر زیدی شہید

افتخار بک ڈپو (رجسٹرڈ) اسلام پورہ لاہور۔ پوسٹ کوڈ 54000

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجموعہ مجالس

(حصہ اول)

از مولانا سید محمد جعفر زیدی شہید رضوان اللہ علیہم اجمعین

(سابق خطیب شیعہ جامع مسجد، کرشن نگر لاہور)

ناشر

ڈاکٹر نصیر عالم زیدی

ملنے کا پتہ:

افتخار بک ڈپو (رجسٹرڈ) اسلام پورہ لاہور 042-37223686

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نام کتاب: ——— مجموعہ مجالس (حصہ اول)

خطیب: ——— مولانا سیّد جعفر زیدی شہید

بار: ——— سوئم

تعداد: ——— 500

ہدیہ: ——— -/225

انتساب

حضرت امام حسین علیہ السلام اور اُن کے
عظیم الشان ساتھیوں کے نام جنہوں نے
حق پرستوں کو راہِ حق میں جان کا نذرانہ
پیش کرنے کا سلیقہ سکھایا۔

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

(علامہ سید نیاز محمد ہمدانی صاحب مدظلہ)

حضرت امام حسینؑ کی مجالس عزا ایک عظیم عبادت ہیں۔ لیکن ہر عبادت کی ظاہری شکل و صورت کے ساتھ ساتھ اس کی ایک باطنی حقیقت بھی ہوتی ہے جو اس عبادت کی روح ہوتی ہے۔ اس قانون کا اطلاق مجالس عزا پر بھی ہوتا ہے۔ مجالس عزا کے برپا کرنے کی حکمت اور غرض و غایت یہ ہے کہ ان کے ذریعے سے حضرت امام حسینؑ کے مقصد کے بارے میں آنے والی انسانی نسلوں میں زیادہ سے زیادہ آگاہی پیدا کی جائے تاکہ وہ حسینیت اور یزیدیت کو پہچان لیں اور اس کے بعد حسینیت کا راستہ اختیار کریں اور یزیدی کردار سے دوری اختیار کریں۔ یہ اس صورت میں ہی ممکن ہے کہ مجالس عزا سے خطاب کرنے والے خود مقصد امام عالی مقام کی معرفت رکھتے ہوں اور اس کے ساتھ مخلص بھی ہوں۔ جب تک ہماری مجالس عزا میں اس حقیقت کی پاسداری کی گئی، ان مجالس عزا کی روشنی سے نہ صرف عزادارانِ امام شہدا کے قلوب و اذہان کو روشنی ملی بلکہ دوسرے اسلامی فرقہ سے تعلق رکھنے والوں میں سے ایک قابل ذکر تعداد ان مجالس کے ذریعے راہِ حق کی طرف ہدایت پاتی رہی۔

مگر بدقسمتی سے تقریباً گزشتہ دو یا تین عشروں سے مجالس عزا کا سٹیج ایسے غیر ذمہ دار افراد کے ہاتھ میں آگیا ہے جو مقصد شہادت امام حسینؑ سے آگاہی رکھتے ہیں اور نہ ہی ان کا اپنا مقصد تبلیغ حسینیت ہے۔ ان کے پیش نظر سامعین کو خوش کرنا ہے خواہ اللہ اور اسکا رسولؐ ناراض ہو جائیں۔ اس صورت حال کا سب سے بُرا اثر یہ ہوا ہے کہ عزادارانِ امام حسینؑ میں مقصدِ شہادت

سے ناواقفیت روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اگرچہ اب بھی بہت سے واعظین اور خطباء اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ایمانداری سے اپنا فرض ادا کر رہے ہیں لیکن ان کی تعداد انتہائی کم اور تبلیغی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ ان حالات میں ذمہ دار علماء کی تقاریر و خطابات کے مجموعہ جات بھی ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ مولانا سید محمد جعفر زیدی شہید اعلی اللہ مقامہ کی ذاتِ گرامی بھی ان معدودافراد میں سے ہے جنہوں نے زندگی بھر حق کے پرچار کو ہر حال میں ہر چیز پر مقدم رکھا اور اسی راہ میں جامِ شہادت نوش کیا۔

زیر نظر کتاب ان کی ایمان افزاء تقاریر کا ایک مجموعہ ہے جو اُن کی پوتی نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ترتیب دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس سعی کو قبول فرمائے اور انہیں اس کا اجر کثیر عطا فرمائے۔ یہ مجموعہ جہاں عام مومنین کے لئے مفید ہے وہاں خطباء اور واعظین کے لئے بھی سود مند ہے۔ اللہ تعالیٰ شہید مولانا کے درجات کو بلند فرمائے اور تمام اہل اسلام کو ان تقاریر سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

والحمد للہ رب العالمین و صلی اللہ علیٰ محمد و آلہ الطاہرین

سید نیاز محمد ہمدانی

۲۷رجون ۲۰۰۱ء

لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

بقلم جناب علامہ طالب جوہری صاحب مدظلہٗ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں حوزہ علمیہ نجف اشرف کا طالب علم تھا اور گاہ گاہ ایام عزا کی تعطیلات میں پاکستان آیا کرتا تھا۔ حسن اتفاق سے ایک سال مجھے لاہور میں محرم الحرام کے عشرۂ اولیٰ میں قیام کا موقع ملا اور مختلف مجالس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ غالباً محرم کی چوتھی یا پانچویں تاریخ تھی جب میرے میزبان مجھے ایک ایسی مجلس میں لے گئے جس میں بظاہر حالات دوسری مجالس کی نسبت فضلاء و دانشوروں کا اجتماع زیادہ تھا۔ ایک ایسے بزرگ رونق افروز منبر تھے جن پر لباسِ علم پوری طرح سج رہا تھا۔ جلد ہی کوثر و تسنیم کی دھلی ہوئی زبان اور لہجہ کی شیرینی نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ مجلس میں خطابت کا عنصر کم تھا لیکن علمیت کا تناسب بہت زیادہ تھا۔ مدلل گفتگو تھی اور اس آیت پر تھی جس پر ایک ہزار سال سے گفتگو ہو رہی ہے، جسے صاحبانِ علم آیۂ تطہیر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ آیۂ مبارک جسے منبر سے بہت زیادہ پڑھا گیا ہو، اس میں نئے نکات کا پیدا کرنا بہت دشوار ہوتا ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ صاحبِ ذکر نے بعض ایسے نکات اور اچھوتے مطالب پیش کیے جو اس سے قبل سامعین کیلئے نا آشنا تھے جن سے انتہائی گہرے اور وسیع مطالعہ کا اظہار ہو رہا تھا ____ یہ میرا پہلا تعارف تھا حضرت مولانا سید محمد جعفر زیدی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ سے۔

حوزہ علمیہ نجف اشرف میں پاکستان سے جو مختلف جرائد و رسائل آیا کرتے تھے، ان میں گاہ گاہ حضرت مولانا رضوان اللہ علیہ کی بعض تحریریں بھی دیکھنے کو مل جایا کرتی تھیں۔ مولانا کی علمیت، وسعتِ مطالعہ اور فکری تعمق کا پہلا تاثر جو مجلس کے ذریعہ مجھ پر قائم ہوا تھا، ان کی گرانقدر

تحریروں نے نہ صرف یہ کہ اسے باقی رکھا بلکہ اس تاثر میں مسلسل اضافہ کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مذہبی رسائل مناظرانہ مباحث کو پیش کرنے میں بہت مستعد ہوا کرتے تھے اور کم وبیش ہر شمارہ میں کسی نہ کسی نزاعی مسئلے پر کوئی نہ کوئی مقالہ یا مضمون موجود ہوتا تھا۔ حضرت مولانا نے ان موضوعات پر بھی قلم اٹھایا لیکن اس شان کے ساتھ کہ ان میں مناظرہ کم اور ادلہ و براہین کا امتزاج زیادہ ہوتا تھا، البتہ کہیں کہیں آپ کے لہجہ میں ذوالفقار کی کاٹ بھی نمایاں ہو جاتی تھی لیکن اس کے باوجود منتخب الفاظ، شائستہ طرز بیان اور محکم استدلال ان مقالوں کا طرۂ امتیاز ہوتا تھا۔

مجھے یہ معلوم کرکے بہت مسرت ہوئی کہ حضرت مولانا کے خلفِ صالح ڈاکٹر نصیر عالم زیدی صاحب نے آپ کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مقالات کا ایک معتد بہ حصہ شائع کرنے کا ارادہ فرمایا ہے۔ خدا اُن کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ وہ مقالے جو زیور طبع سے آراستہ ہونے والے ہیں ــــــ خالص علمی اور تحقیقی ہیں۔ ان میں بعض ایسے اہم موضوعات زیر بحث آئے ہیں جن کی اہمیت گزرتے ہوئے زمانوں میں کبھی کم نہ ہوگی۔ ان مقالوں میں مولانا نے غیر جانبدارانہ علمی و منطقی تحقیقات سے اسلامی حقائق و معارف کو جمع فرما دیا ہے۔ حوالے مستند ہیں، عبارت سلیس اور رواں ہے اور تعبیر و استدلال دل نشین ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ صاحبانِ علم و طالبانِ حکمت اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے اور ان مطالب کی قدر کریں گے جن پر یہ کتاب مشتمل ہے۔

میں دست بدعا ہوں کہ رب العزت بہ طفیل محمدؐ و آل محمد علیہم السلام حضرت مولانا سید محمد جعفر زیدی رضوان اللہ علیہ کے درجات میں اضافہ فرمائے اور اربابِ فکر و دانش کو ان کے معارف سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔

طالب جوہری

۷ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ، لاہور

(مدعا عرض ہے کہ علامہ طالب جوہری نے یہ تقریظ بنیادی طور پر علامہ شہید کے مجموعۂ مقالات کیلئے تحریر کی)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حالاتِ زندگی

مولانا سید محمد جعفر زیدی شہید

بقلم جناب ڈاکٹر سید نصیر عالم زیدی Ph.d. M.Sc.

والد مرحوم سید محمد جعفر زیدی ۱۹۰۸ء میں میمن سادات، ضلع بجنور (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شجرہ نسب چوتھے امام حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے بیٹے حضرت زید شہید سے ملتا ہے۔ آپ کے والد حکیم مولوی سید محمد عباس صاحب تھے جن کے پاس جمعہ و جماعت کی امامت کا اجازہ تھا اور اپنے علاقے کے مشہور حکیم تھے۔ آپ کچھ عرصہ طبیہ کالج دہلی میں استاد بھی رہے۔ والد مرحوم کے دادا حکیم مولوی سید علی صغیر مرحوم ایک عالمِ دین ہونے کے ساتھ ایک نامور حکیم بھی تھے اور دور دور تک علاج کیلئے بلائے جاتے تھے۔ حکیم مولوی علی صغیر کے بڑے بھائی حکیم علی امیر بھی اپنے زمانے کے مشہور حکیم تھے۔ حکیم مولوی علی صغیر کے والد عنایت مرحوم حکیم تھے، اس لئے ہمارا خاندان "حکیموں کا خاندان" کہلاتا تھا۔ اس طرح علم و حکمت کا خزانہ والد مرحوم کو ورثے میں ملا تھا۔ یہ تمام بزرگ حضرات صاحبانِ جائیداد بھی تھے۔

آپ کی زیادہ تر تعلیم مدرسۂ منصبیہ میرٹھ میں ہوئی۔ آپ مدرسے کے ہوسٹل میں رہتے تھے۔ آپ کے اُستاد مجتہد قبلہ یوسف حسین مرحوم امروہوی تھے۔ والد مرحوم نے مدرسۂ منصبیہ میں پڑھ کر یوپی بورڈ سے ادیب فاضل کی سند حاصل کی اور قبلہ یوسف حسین نے جمعہ و جماعت کی امامت کا اجازہ عطا فرمایا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے وطن میمن سادات تشریف لے آئے۔ تقریباً ۱۸ سال کی عمر میں آپ کی شادی سید احسان حسین مرحوم کی اکلوتی صاحبزادی

وزیر بانو سے ہوئی۔

والد مرحوم نے کچھ عرصہ افغانستان کے سفارت خانہ دہلی میں مترجم کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر دہلی کے ایک گورنمنٹ ہائی سکول میں مدرس بھی رہے۔ ملازمت کی پابندی طبیعت پر گراں گزری، اس لئے دونوں ملازمتیں چھوڑ دیں اور وطن واپس تشریف لے آئے۔

ہماری دادی قدیر النساء مرحومہ بھی ایک بڑی زمیندار خاتون تھیں۔ والد مرحوم زمینداری کے معاملات میں اپنی والدہ کا ہاتھ بٹاتے رہے۔

ایک دفعہ میسن میں ایک مجلس میں ایک مدعو ذاکر نے عین وقت پر آنے سے معذرت کر لی۔ مجلس کا اعلان ہو چکا تھا۔ بزرگوں نے والد مرحوم سے مجلس کی ذاکری کیلئے اصرار کیا۔ بزرگوں کے بے حد اصرار پر مجبوراً آپ منبر پر تشریف لے گئے اور زندگی کی پہلی مجلس پڑھی جو بہت زیادہ مقبول ہوئی اور یوں مجلس پڑھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا جو تا حیات قائم رہا۔ آپ کو دور دور سے مجالس پڑھنے کیلئے بلایا جاتا رہا۔

ایک دفعہ سہارنپور میں مجالس پڑھنے گئے۔ وہاں بریلی کے ایک بزرگ کربلائی حسین نے والد صاحب سے بریلی میں پیش نمازی قبول کرنے کیلئے درخواست کی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ اس طرح ۱۹۳۴ء میں والد مرحوم مع اہل وعیال بریلی تشریف لے آئے۔ بریلی کے ایک علاقہ میں، جو "کالا امام باڑہ" کے نام سے مشہور تھا، قیام پذیر ہوئے۔ بریلی میں ۲۲ سال کا عرصہ انتہائی شاندار اور پُر وقار طریقہ سے گزارا۔ بریلی کے مؤمنین خصوصاً کنبوہ حضرات نے دل وجان سے محبت وتکریم وتعظیم کی۔ یہ لوگ بے شک بہت علم دوست وقدر شناس، محمدؐ وآلِ محمدؐ کے شیدائی اور زبردست عزادارِ حسینؑ تھے۔

آپ کی مجالس میں اہل سنت حضرات بھی خاصی تعداد میں شرکت کرتے تھے اور بہت محظوظ ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اہل سنت کے ایک بہت عالم وفاضل حکیم بڑی پابندی سے آپ کی مجالس میں آتے تھے۔ ایک دفعہ فرمانے لگے:

''مولانا صاحب کی مجلس میں گلاب کے پھول جمع کرتا ہوں۔ کبھی کبھی کوئی چھوٹا موٹا کانٹا بھی لگ جاتا ہے مگر اُس کا بھی اپنا ایک مزا ہوتا ہے''۔

بریلی کے شیعہ حضرات ہی نہیں بلکہ برادرانِ اہلِ سنت اور ہندو بھی آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔

۱۹۴۵ء میں جب برِ صغیر کے مسلمانوں میں مسلم لیگ کی مقبولیت بڑھی اور مطالبۂ پاکستان نے زور پکڑا تو والد مرحوم بہت پُرجوش انداز میں مسلم لیگ اور مطالبۂ پاکستان کی حمایت کرنے لگے۔ اسی عرصہ میں ایک دفعہ جب قائدِ اعظم محمد علی جناح بریلی تشریف لائے تو والد مرحوم کا تحریر کردہ سپاس نامہ پیش کیا گیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۶ء میں مستقل طور پر پاکستان ہجرت کر کے آگئے۔ ماہِ رمضان المبارک ۱۹۵۷ء میں شیعہ جامع مسجد کرشن نگر (اسلام پورہ) لاہور کے منتظمین نے مستقل پیش نمازی کیلئے درخواست کی جو والد مرحوم نے قبول کر لی۔

بہت جلد اہالیانِ لاہور والد مرحوم کے علم و فضل، پرہیز گاری اور متانت کے مداح اور گرویدہ ہو گئے۔ آپ زندگی بھر گروہ بندی اور ہر قسم کی سیاست سے بالکل الگ رہے۔ منطق اور قرآن فہمی میں آپ کا جواب نہ تھا۔ ہر مسئلہ کا بہت واضح، دوٹوک الفاظ میں فیصلہ کن جواب دیتے تھے۔ کسی بھی مسئلہ میں گنجلک بات نہ کرتے تھے۔

آپ تاحیات پیامِ عمل اور درسِ عمل کے سرپرستِ اعلیٰ رہے۔ آپ باقاعدگی سے سینٹھ برادران اور موچی دروازہ میں درسِ قرآن دینے جاتے تھے۔ اکثر درسِ قرآن میں اپنی سب سے چھوٹی پوتی بشریٰ کو اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ اب تک کچھ بزرگ بشریٰ کو اس حوالہ سے یاد کرتے ہیں۔

والد صاحب جب کہیں جانے کیلئے تیار ہوتے تھے تو چھوٹی سی بشریٰ آپ کے لباس کو درست کرنے کی کوشش کرتی تھیں تو کبھی کبھی آبدیدہ ہو کر سوز و سلام کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

سکینہ جھاڑ رہی تھی عبا کے دامن کو
حسین چپکے کھڑے تھے جھکائے گردن کو

آپ نے درسِ عمل اور پیامِ عمل کیلئے بہت گرانقدر، نادر اور علم افروز مضامین لکھے جو مومنین میں بہت مقبول ہوئے۔ مولانا علی نقی صاحب قبلہ کی مشہور کتاب ''شہید انسانیت'' کا تعارفی دیباچہ لکھا جسے علم دوست حضرات نے بہت ہی سراہا۔

۱۹۷۳ء میں والد مرحوم اور والدہ صاحبہ حج بیت اللہ کیلئے تشریف لے گئے۔ جنوری ۱۹۷۴ء میں والد مرحوم اپنی پیاری والدہ کے پیار سے محروم ہوگئے۔ انہیں اپنی والدہ سے بہت زیادہ محبت تھی۔ کسی چاہنے والے نے مندرجہ ذیل قطعہ کہا جو انہیں بہت پسند آیا:

خیر النساء کے پاس قدیر النساء ہے آج

۳ رنومبر ۱۹۸۰ء بمطابق ۲۴ر ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ بروز دوشنبہ مسجد میں نمازِ مغربین پڑھائی۔ نماز کے بعد مسجد ہی میں عید مباہلہ کی محفل میں محمدؐ و آلِ محمدؐ کے فضائل بیان کئے اور پھر ایک مومن کے گھر نیاز میں شرکت کر کے گھر واپس آئے۔ ابھی دروازے میں داخل ہی ہوئے تھے کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ دروازے پر واپس آئے تو ایک ظالم ملعون نے تیسی سے سر پر گہری ضربیں لگائیں۔ خون میں نہا گئے۔ بیہوشی کے عالم میں میو ہسپتال پہنچایا گیا۔

شہادت سے دو تین دن پہلے میری بیٹی انجم جبین نے ایک خواب دیکھا جو انکی اپنی زبان سے سنئے:

''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں حضرت امام حسینؑ کے روضہ مبارک میں بالکونی پر موجود ہوں۔ وہاں ایک پلنگ پر گاؤ تکیہ رکھا ہوا ہے اور ابا (مولانا) اس پلنگ پر لیٹے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ نیچے روضے پر جاؤ، بی بی تشریف لائی ہیں، ان سے کہو دعا فرمائیں۔ میں نیچے گئی تو دیکھا کہ بی بی فاطمہؑ نماز پڑھ رہی ہیں۔ میں انکے بائیں جانب بیٹھ جاتی ہوں اور تسبیح اٹھا کر پھیرنا شروع کر دیتی ہوں۔ اس تسبیح سے خون نکل کر میری انگلیوں پر لگ

گیا۔ میں نے زبان سے کچھ کہے بغیر انگلیاں بی بی فاطمہ زہرکو دکھائیں۔ انہوں نے فرمایا' بیٹی ڈرو نہیں، یہ تو شہید کا خون ہے' اور پھر فرمایا' جاؤ تمہاری دعائیں قبول ہو گئیں۔

انجم نے یہ خواب والد صاحب سے بیان کیا تو آپ نے فرمایا کہ جب بی بی نے خود تمہیں تسلی دے دی ہے تو کیوں پریشان ہوتی ہو۔"

جو لوگ ہسپتال میں قریب تھے، وہ بتاتے ہیں کہ اس بیہوشی کے عالم میں بھی باواز بلند اور صحیح عربی تلفظ کے ساتھ درود و آیات قرآنی کا ورد کرتے رہے جس سے ہسپتال کے ڈاکٹر اور عملے کے لوگ حیران و ششدر تھے۔ جسم کا سارا خون بہہ چکا تھا۔ چاہنے والوں نے بہت سا خون دیا مگر حالت بگڑتی ہی گئی۔ پھر آپ کو میو ہسپتال سے جنرل ہسپتال منتقل کیا گیا۔ ۷ رنومبر ۱۹۸۰ء بمطابق ۲۸ رذی الحجہ ۱۴۰۰ھ بروز جمعہ صبح اڑھائی بجے جنرل ہسپتال میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ بقول ڈاکٹر مسعود رضا خاکی مرحوم:

عمر بھر کرتے رہے آلِ عباء کا تذکرہ
سرخ رو ہوکر گئے جعفر خدا کے سامنے

ہسپتال میں موجود با اعتماد افراد نے بتایا ہے کہ اگرچہ مولانا کا دایاں بازو بھی قاتلانہ حملے میں شدید زخمی ہو چکا تھا اور اسے حرکت دینا ممکن نہ تھا لیکن اس کے باوجود مولانا نے اپنی روح کی پرواز سے قبل اپنے اسی زخمی بازو کو اس انداز میں اٹھایا کہ گویا کسی آنے والے کو سلام کر رہے ہوں۔

ہزاروں مومنین نے زبردست آہ و زاری کے ساتھ بڑی شان و شوکت سے آپ کو جمعہ کی شام کو کربلا گامے شاہ میں سپردِ خاک کیا۔

ذوقِ شعر

والد صاحب کی دینی علمیت سے تو زمانہ خوب اچھی طرح واقف ہے۔ آپ کی تقاریر اور تحریریں آپ کے علم و فضل اور قرآن فہمی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ لیکن شاید یہ کم ہی لوگوں کو علم ہوگا

کہ والد صاحب شعرفہمی اور شعرگوئی کا بھی اعلیٰ ترین ذوق رکھتے تھے۔ بریلی اور لاہور میں نامور شعراء اپنا کلام تصحیح کیلئے آپ کے پاس لاتے تھے۔ خود بھی اگرچہ زیادہ نہیں، پھر بھی مختلف مواقع پر آپ نے کافی شعر کہے ہیں مگر افسوس کہ یہ نادر خزانہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ جب شیعہ جامع مسجد تعمیر ہوئی تو مندرجہ ذیل قطع آپ نے تحریر فرمایا:

بنائی قوم نے ممتاز مسجد جامع
رہیگا فردِ جزا پہ ہر کا نام مدام
سرِ ورق پہ لکھا کاتبانِ قدرت نے
حبیبِ قوم محمد علی حبیب کا نام

ایک دفعہ ڈاکٹر مسعود رضا خاکی نے اپنا کلام والد مرحوم کو تصحیح کیلئے دیا تو آپ نے اپنا ایک شعر اس میں شامل کر دیا:

دعویٰ نہیں ولا کا پہ بیزار ہیں بہت
اعدائے فاطمہؑ سے محبانِ فاطمہؑ

امام مہدی علیہ السلام کے متعلق آپ کا ایک شعر ہے:

اے حجتِ الٰہ بس اب آ بھی جایئے
لے کر جلو میں نورِ گلستانِ فاطمہؑ

میرے چھوٹے چچا مرحوم کے انتقال پر آپ نے چند شعر کہے، اُن میں سے ایک شعر مجھے یاد ہے:

غم زدہ ماں دیکھتی ہی رہ گئی
کر گئے حیدر بھی رخصت کا سلام

بچپن میں ایک دفعہ میں نے ضد کی کہ امام حسن علیہ السلام کی شبیہ تابوت کی مناسبت سے مجھے ایک نوحہ لکھ کر دیں۔ میری ضد پر آپ نے ایک نوحہ لکھا جو مجلس میں پڑھا گیا۔ میرے

پاس یہ نوحہ بھی محفوظ نہیں۔ چند مصرعے یاد ہیں:

شیعو! چلو اٹھاؤ جنازہ امامؑ کا
زہراؑ کے نورِ عین کا اپنے امامؑ کا
چل کر بتاؤ ہاتھ شہِ تشنہ کام کا
عباسؑ فرطِ غیظ سے تھرائے جاتے ہیں
تیروں سے چھلنی ہوگیا لاشہ امامؑ کا

بریلی میں آئمہؑ کی محافلِ میلاد ہوا کرتی تھیں جن میں قصیدہ خوانی بھی ہوتی تھی۔ اکثر والد صاحب قصیدے لکھ کر کبھی میرے بھائی مرحوم، کبھی اختر مرحوم (جو بعد میں پاکستان آکر صہبا اختر کے نام سے مشہور ہوئے) اور کبھی دیگر حضرات سے پڑھواتے تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا سید محمد جعفر زیدی شہید میرے تایا اور میری اہلیہ شاہانہ کے دادا تھے۔ میرا اُن سے بچپن سے لے کر اُن کی شہادت تک ساتھ رہا۔ اس پورے دور میں جب میں انہیں یاد کرتا ہوں تو مجھے اُن کی محبت اور شفقت کے سوا کچھ یاد نہیں آتا۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہر شخص جس کا مولانا سے تعلق رہا، وہ یہی کہے گا۔

ہم لوگ ملتان میں رہتے تھے اور گاہے بگاہے اُن سے ملنے لاہور آیا کرتے تھے۔ بچپن کا واقعہ ہے کہ ہم لاہور آئے ہوئے تھے۔ تایا ابا بازار جا رہے تھے، میں نے سرسری طور پر اُن سے ایک فرمائش کی۔ میں سوچ رہا تھا کہ تایا ابا میری فرمائش کو بچے کی فرمائش سمجھ کو بھول جائیں گے لیکن وہ تو عاشق جناب امیرؑ تھے جو بچوں سے انتہائی شفقت فرمایا کرتے تھے۔ اس لئے وہ میری فرمائش نہ بھولے بلکہ اُسے پوری جزیات کے ساتھ پورا کیا۔ اُن کی یہ محبت ہمیشہ قائم رہی۔

۱۹۷۸ء میں میری شادی اُن کی بڑی پوتی شاہانہ سے ہوئی۔ ۱۹۷۹ء میں میرا تبادلہ ملتان سے لاہور ہوگیا اور میں تایا ابا کے پاس آگیا۔ میرے لاہور آنے سے بہت خوش ہوئے۔ میں بنک میں ملازمت کرتا تھا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے اکثر گھر لوٹنے میں دیر ہو جایا کرتی تھی۔ اگر میں بنک سے دیر سے آنے کی اطلاع نہ کر پاتا تو بہت پریشان ہوتے اور پریشانی کے عالم میں گھر سے باہر ٹہلنے لگتے۔

تایا ابا انتہائی نیک اور پرہیز گار انسان تھے جس کا ثبوت انہوں نے اس حالت میں بھی دیا جبکہ وہ ۳ر نومبر ۱۹۸۰ء کی شب میں سر پر شدید ضربات لگنے کے بعد موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھے، اس حالت میں بھی انہوں نے کوئی دنیاوی بات نہ کی بلکہ بہترین قرأت کے ساتھ تسبیح اربعہ کا ورد کرتے رہے۔ انہوں نے ۳ اور ۴ر نومبر کی درمیانی شب میں جبکہ ڈاکٹروں کے مطابق وہ

ہوش میں نہ تھے، نمازِ تہجد ہسپتال کے بستر پر لیٹے ہوئے باآوازِ بلند ادا کی۔ رات کے ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔ اس وقت لاہور کے ڈی۔ سی اور ڈی۔ آئی۔ جی صاحبان بھی وارڈ میں موجود تھے، انہوں نے جب تایا ابا کو نمازِ تہجد ادا کرتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے کہ صحیح معنوں میں عالم ایسے ہوتے ہیں۔

تایا ابا ۳رنومبر ۱۹۸۰ء سے ۷رنومبر ۱۹۸۰ء تک یعنی چار دن ہسپتال میں رہے۔ ۶ اور ۷رنومبر کی درمیانی شب (شب جمعہ) میں آپ نے شہادت پائی اور جمعہ کے روز ہزاروں سوگواروں کی آہوں اور سسکیوں کے درمیان کربلا گامے شاہ میں دفن ہوئے۔ جب تک تایا ابا ہسپتال میں رہے، میں اُن کے پاس ہی رہا۔ انہی دنوں میں میری خواہرنسبتی انجم جبین (مولانا کی چھوٹی پوتی) گنگارام ہسپتال میں داخل تھیں، میں انہیں دیکھنے کیلئے تھوڑی دیر کیلئے گنگارام ہسپتال گیا تو انہوں نے پوچھا کہ ابا کہاں ہیں؟ مجھے دیکھنے کیوں نہیں آرہے؟

میں یہاں بتاتا چلوں کہ تایا ابا اپنی پوتیوں سے بھی بے پناہ محبت کرتے تھے اور یہی حال اُن کی پوتیوں کا بھی تھا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ انجم کو اگر صحیح صورتحال بتادی تو کہیں اُن کی طبیعت زیادہ نہ بگڑ جائے، اُن کو بتایا کہ ابا ناروال گئے ہیں اور وہ جمعہ تک واپس آجائیں گے۔ تایا ابا جو ہمیشہ بچوں کی باتیں مانتے آئے تھے، انہوں نے میری یہ بات بھی رد نہ کی۔ وہ واقعی جمعہ کو ہی گھر آگئے۔ بس فرق یہ تھا کہ وہ اپنے قدموں پر چل کر نہ آئے بلکہ اُن کا جنازہ آیا۔

اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے، آمین ثم آمین۔

سید محمد اظہر زیدی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یادِ رفتگان

بیاد مولانا سید محمد جعفر زیدی شہید اعلی اللہ مقامہٗ

سید مسعود عباس

خالقِ کائنات کی طرف سے اس دنیائے رنگ و بو میں ایسی ہستیاں معرضِ وجود میں آتی رہتی ہیں جو اپنے علم اور اعلیٰ اخلاق و کردار کی بدولت اس جہانِ فانی میں بیش بہا اور انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔ جہاں اُن کے حسن کردار اور اخلاق سے ایک جہاں فیضیاب ہوتا ہے، وہاں وہ اہلِ بصیرت اور تشنگانِ علم کو بھی سیراب کرتے ہیں۔ ایسی ہی ہستیوں میں مولانا محمد جعفر زیدی شہید اعلی اللہ مقامہٗ کا نامِ نامی بھی شامل ہے جنھوں نے اپنے علم اور حسن کردار سے لازوال نقوش چھوڑے ہیں اور بیشتر تشنگانِ علم کو سیراب کیا۔

قبلہ جعفر صاحب میمن ضلع بجنور ہندوستان کے ایک معروف علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد لاہور تشریف لائے۔ یہیں مستقل قیام کا فیصلہ کیا۔ آپ نے تقریباً پچیس سال شیعہ جامع مسجد، اسلام پورہ، لاہور میں امامت کے فرائض انجام دیئے۔ آپ کو قرآن اور اُس کی تفسیر پر مکمل عبور حاصل تھا۔ چنانچہ آپ نے امامت کے ساتھ ساتھ درسِ قرآن کا سلسلہ بھی جاری رکھا جس سے بیشمار لوگ فیض یاب ہوئے۔ آپ تفسیر قرآن بھی لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے بلکہ اس ضمن میں کچھ شروعات بھی کی تھی لیکن افسوس کہ اُن کی زندگی نے وفا نہ کی۔ یوں یہ کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

قبلہ مولانا صاحب انتہائی ذہین اور اعلیٰ پایہ کے خطیب تھے۔ انہوں نے اپنی تقاریر

میں ہمیشہ رواداری، افہام و تفہیم کا درس دیا تھا۔ آپ کی علمی استعداد بے مثل تھی۔ آپ کو حدیث، فقہ، تاریخ اور طب پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ لیکن جو کمال انہیں فن خطابت میں حاصل تھا، وہ انہی کا حصہ تھا۔ آپ کی تقاریر منطقی اور قرآنی استدلال سے پُر ہوتی تھیں۔ آپ کی تقاریر سننے کیلئے بلا امتیاز فرقہ لوگ شریک ہوتے تھے اور فیضیاب ہوتے تھے۔

لاہور میں محرم کی مجالس عزا اور دیگر مذہبی اجلاس مولانا صاحب کی شخصیت کی موجودگی کی وجہ سے بے حد رونق افروز رہیں۔ فن خطابت کے علاوہ آپ نے بیشتر مسائل پر تحریر فرمایا ہے۔ آپ کی تقاریر کی طرح آپ کی تحریر میں بھی منطقی انداز نمایاں ہے۔ اگرچہ آپ بہت زیادہ مصروفیات کی بناء پر زیادہ نہ تحریر فرما سکے لیکن جو کچھ بھی آپ نے تحریر کیا ہے، وہ ٹھوس منطقی استدلال پر مبنی ہے۔ آپ کی تحریر بے حد جاندار اور متاثر کن تھی۔

مولانا صاحب کی زندگی کا چلن بھی انتہائی شائستہ اور حد درجہ سادگی پر مبنی تھا۔ راقم کو بھی قبلہ مولانا صاحب کی خدمت میں کچھ عرصہ رہنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ آپ بے حد حلیم الطبع، سادگی، عجز اور انکساری کا مرقع تھے۔ یہ صفات بھی آپ کی علمی فضیلت پر استدلال کرتی ہیں۔ جس شخصیت میں بھی علمی فضیلت جس قدر زیادہ ہوگی، وہ اسی قدر حلم، سادگی، شائستگی اور بردباری کا مرقع ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا صاحب شہید میں یہ صفات اور علمی فضیلت اُن کی شخصیت میں اس قدر نمایاں تھیں کہ کوئی بھی ذی شعور اُن کے علم اور اُن کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

آپ کا شعری ذوق بھی بے حد اعلیٰ پایہ کا تھا۔ اپنے علمی مرتبہ اور اعلیٰ منصب کی بناء پر اس سے کم و بیش اجتناب ہی مناسب سمجھا۔ لیکن آپ نے چند قصیدہ اور سلام جو اہلِ بیتؑ اطہار علیہم السلام کی شان میں تحریر فرمائے ہیں، اُن سے بخوبی آپ کے ذوقِ سلیم، بلند آگہی اور شاعرانہ عظمت کا ثبوت ملتا ہے۔

نمونہ کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

اے حجت الہ بس اب آ بھی جایئے
لیکر جلو میں نور گلستانِ فاطمہ

اسی قصیدہ میں اس شعر کی خوبصورتی، حسن بیان اور اہل بیتؑ سے محبت ملاحظہ ہو:

دعویٰ نہیں ولا کا پر بیزار ہیں بہت
اعدائے فاطمہؑ سے محبانِ فاطمہؑ

آپ نے لاہور میں مستقل قیام کے دوران بیشتر معروف انجمنوں کی سرپرستی جاری رکھی۔ قبلہ مولانا صاحب ماہنامہ پیامِ عمل کے ذریعہ، جس کے وہ سرپرستِ اعلیٰ بھی تھے، تمام شرعی، فقہی اور تاریخی مسائل کا جواب باقاعدگی کے ساتھ بذریعہ تحریر دیتے رہے جن سے بے شمار افراد کو فائدہ پہنچا۔

ذی الحجہ کا مہینہ یوں تو عالم اسلام میں عالی شان ہے کیونکہ اسی ماہ میں تمام اہل اسلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کے جذبہ کو بڑھ چڑھ کر مناتے ہیں۔ اسی مہینہ میں حج المبارک بھی ہے اور اسی ماہ کی ۲۴ تاریخ کو عالم اسلام کو نصرانیوں پر ایک ایسی عظیم الشان فتح بھی حاصل ہوئی جو کائنات کی اعلیٰ ترین ہستیوں، جن میں جناب سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا، امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی بدولت صرف مباہلہ کی بنیاد پر حاصل ہوئی اور یہ وہ ہستیاں ہیں کہ جب مباہلہ کیلئے تشریف لائیں تو نصرانیوں کے وفد نے یہ کہہ کر شکست تسلیم کر لی کہ اگر ان ہستیوں سے مباہلہ کیا گیا تو پہاڑ اپنی جگہ سے سرک جائیں گے اور نصرانیوں کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس فتح مبین کو قرآن کریم میں فتح مباہلہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اسی فتح مباہلہ کا میلاد اور اہل بیتؑ اطہار کی شان میں فضائل پڑھ کر واپس گھر تشریف لائے تو ایک شقی القلب ابن ملجم صفت شخص نے تیسی سے آپ پر قاتلانہ حملہ کیا جس سے آپ تین روز تک جنرل ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ بالآخر زخموں کی تاب نہ لاتے

ہوئے ۷رنومبر ۱۹۸۰ء بمطابق ۲۸رذی الحجہ ۱۳۹۹ء بروز جمعۃ المبارک آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور یوں آپ اپنے جدِ اعلیٰ کی میراث پاتے ہوئے شہادت کے منصب جلیلہ پر فائز ہوئے۔

کربلا گاہے شاہ میں اس جلیل القدر خطیب اور علم وفضل کے آفتاب کو سپردِ خاک کیا گیا۔ آج بھی آپ کا مزار پُرانوار مرجع الخلائق ہے۔ آپ کی شہادت پر منظوم خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر مسعود رضا خاکی صاحب نے یہ خاص طور پر شعر کہا ہے۔

عمر بھر کرتے رہے آلِ عبا کا تذکرہ

سرخرو ہو کر گئے جعفرؒ خدا کے سامنے

یقیناً مولانا جعفر زیدی شہید اعلیٰ اللہ مقامہٗ، جن کی زندگی محبتِ اہلِ بیتؑ اور پرہیزگاری سے بھرپور تھی، خدا اور اس کے رسولؐ کے سامنے سرخرو ہو کر گئے۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

تمام شد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

واقعہ کربلا کی اشاعت کا آغاز حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے کوفہ و شام کے بازاروں اور درباروں میں اپنے اثر انگیز خطبات کے ذریعے کیا۔ بعد میں تمام آئمہ علیہم السلام نے اپنے اپنے دور میں حالات کے تقاضوں کے مطابق نہ صرف خود اس ذکر کو قائم کیا بلکہ اپنے ماننے والوں کو تاکید کرتے رہے کہ اپنے اپنے علاقوں میں اپنے حالات اور مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس ذکر کو زندہ رکھیں۔ امام رضا علیہ السلام نے خود مجالس منعقد کیں اور سامعین کے ساتھ بیٹھ کر ذکر امام حسین علیہ السلام سنا۔ آج تک ہر جگہ محبانِ اہل بیت علیہم السلام نے مختلف طریقوں سے ذکر حسین علیہ السلام کی مجالس کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ علماء، خطباء، واعظین اور ذاکرین نے اپنی اپنی استعداد اور استطاعت کے مطابق اس ذکر کو اپنی زندگی کا مقصد اور نصب العین قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ اُن سب کی کوششوں کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ اُن میں سے جو مرحوم ہو چکے ہیں، انہیں اپنی رحمت سے جوارِ حضرت سید الشہداء علیہ السلام میں مقامِ رفیع عطا فرمائے اور جو زندہ ہیں اُنہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے اور اُن کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

شہید علامہ سید محمد جعفر زیدی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہٗ انہی خوش نصیب افراد میں سے ایک ہیں جنہوں نے زندگی بھر مجالس سید الشہداء علیہ السلام سے خطاب کیا۔

زیرِ نظر کتاب ان کی کچھ مجالس کا مجموعہ ہے۔ ان مجالس کے بارے میں کچھ لکھنا میری علمی استعداد سے بلند ہے۔ قارئین ان مجالس کا بغور مطالعہ کریں تو اُن پر کھل جائے گا کہ مولانا موصوف نے کس محبت اور اخلاص کے ساتھ اپنی زندگی اس پیغام کو پہنچانے میں صرف کی۔

ہمارے خاندان کے مولانا موصوف سے بڑے گہرے روابط تھے۔ میں اور میرے والد محترم ایک دفعہ مولانا شہید کو کراچی لے گئے جہاں آپ نے ہمارے گھر ایک بہت بڑی مجلس

عزا سے خطاب کیا۔ کراچی میں اس زمانہ میں زیادہ زور خطابت پر ہوتا تھا، علمی قابلیت ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔اس کے باوجود مولانا کا دھیمہ لہجہ، بیان کی سلاست اور گہرائی بڑی پسند کی گئی۔ مجلس کے بعد لوگ آپس میں یہ گفتگو کرتے ہوئے سنے گئے کہ یہ ہے علمیت سے بھرپور انداز گفتگو اور معرفت اہل بیتؑ اطہار کو بیان کرنے کا طریقہ!

محرم کی مجالس آپ رات کو امام بارگاہ شاہِ نجف میں پڑھا کرتے تھے۔اس کے بعد غریب خانے پر تشریف لے آتے جہاں ان کے مزاج کے مطابق حقہ گرم ہوتا تھا اور کھانا میرے ساتھ ہی تناول فرماتے۔اس کے علاوہ بھی چہلم کے قریب کچھ مجالس قبلہ ہمارے غریب خانہ پر پڑھا کرتے تھے۔ان کی مجالس کا ایک مجموعہ ان کے ایک مداح جناب مرغوب احمد مرحوم نے شائع کروایا تھا جس کو مولانا کے مداحوں بہت پسند کیا۔

میں آپ کے اور ان مجالس کے درمیان زیادہ دیر حائل نہیں رہنا چاہتا۔میری گزارش ہے کہ آپ ان مجالس کو پڑھیں اور اس حقیر کیلئے دعا فرمائیں۔

(قبلہ موصوف کیلئے ایک سورۃ فاتحہ)

گناہگار

ڈاکٹر افضال حسین

L-45، گلبرگ II، لاہور۔

شہید ملت، عظیم جعفر

سلام تجھ پر

میرے خیالوں کی سرزمین میں
گلاب یادوں کے کھل رہے ہیں
مگر گلستاں ــــــ لہو لہو ہے
چلی ہے غم کی وہ تیز آندھی
کہ زلزلے بھی لرز اٹھے ہیں
ستوں زمیں کے بھی ہل رہے ہیں
میری محبت کی سرزمیں بھی لہو لہو ہے
میری محبت کا آسمان بھی لہو لہو ہے

وہ ایک معصوم

پھول جیسا شگفتہ چہرہ

کہ جس کی ضو میں۔علوم و حکمت کی دل لبھاتی

حسین پھواریں اُبل رہی تھیں

کہ جس کے ماتھے کی ہر کرن میں

حسینؑ ابن علیؑ کی چاہت کے غم میں ڈوبی ہوئی کراہیں مچل رہی تھیں

فرشتہ سیرت، فرشتہ صورت، فرشتہ خصلت، فرشتہ خو تھا

حسینؑ کا وہ فقیہہ بیٹا

کسی یزید کمینہ فطرت کی سازشوں سے لہو لہو تھا

وہ نیک فطرت، وہ نیک سیرت، وہ نیک صورت

وہ نیک کردار آدمی تھا

حدیث و قرآن کی معرفت کے

چمن کھلاتا تھا گفتگو میں

بڑا ہی فنکار آدمی تھا

کمال تھی اُس کی وضع داری

ہزاروں انساں پہ تھا وہ بھاری

عظیم تھا وہ

خدائے اعظم کی عظمتوں کا ____ حسیں مفسر

رسولؐ اقدس کی حکمتوں کا ____ بڑا مقرر

علیؑ اعلیٰ کی رفعتوں کے بیاں کا ____ ماہر

حسینؑ جیسی بلند سرکار کی بلندی کا ایک شاعر

وہ مرتبے میں عظیم تر تھا
معاشرے میں عظیم تر تھا
مگر زمانہ ذلیل تر ہے
کمینہ فطرت ہے، بے بصر ہے
یہی زمانہ یہی اندھیرا
جو روشنی کا لہو بہاتا ہے چپکے چپکے
جو دن کے سورج کو ڈسنے آتا ہے چپکے چپکے
یہی زمانہ ــــــ یہی اندھیرا
کہیں یہ ابلیس بن گیا ہے
کہیں یہ نمرود سا خدا ہے جو بدعتوں میں پھنسا ہوا ہے
کہیں یہ شداد بے حیا ہے
کہیں یہ فرعونِ پُر خطا ہے
کہیں یہ بوجہلِ بے بصر ہے
کہیں یزید کمینہ فطرت
بنائے الحاد و کفر و شر ہے
یہی اندھیرا
کہ جس نے جعفر سے سادہ پیکر پہ اپنا تیشہ چلا دیا ہے
یہی اندھیرا
اُسی اندھیرے کا سلسلہ ہے
خلیلِ حق کو لپکتے شعلوں میں جس نے ڈالا
کہ جس نے اپنے گمانِ باطل میں

جنابِ عیسیٰ کو دار پہ بھی چڑھا دیا ہے
رسولؐ برحق، محمدؐ مصطفےٰ کو جس نے ستا ستا کر
وطن بھی اُنؐ سے چھڑا دیا ہے
رسولؐ زادی پر رنج و غم کے پہاڑ ڈھائے
علیؑ کا سجدے میں خوں بہایا
حسنؑ کو زہرِ جفا پلایا
حسینؑ جیسے ستونِ دیں کے گلوئے اطہر پر
کند خنجر پھرا دیا ہے
رسولؐ جیسا رخِ مطہر، بنوکِ نیزہ چڑھا دیا ہے
اُسی زمانے، اُسی اندھیرے کا سلسلہ ہے
عظیم جعفر کے سر پہ جس نے ستم کا تیشہ چلا دیا ہے۔
شریف فطرت، عظیم جعفر
وہ علم و عرفان و کیف و مستی کا ایک پیکر
اگرچہ تھی موت اس پہ طاری
دکھائی اس نے نہ بے قراری
غشی کے عالم میں ذکرِ باری
زباں پہ ہر دم درود جاری
میں پوچھتا ہوں کہ اس زمانے میں ایسے انساں کہاں ملیں گے
کہ جیسے ______ جعفر
قرآن و حکمت کا ایک پیکر
لگا جو تیشہ لہو میں ڈوبا

تمام بستی ہی تھرتھرائی
جو اس کے نزدیک بھی نہیں تھی
وہ آنکھ بھی غم سے ڈبڈبائی
خطیبِ مسجد، خطیبِ منبر
اَجل کے پہلو میں سو گیا ہے
وہ جب سے چپ چاپ ہو گیا ہے
ہمارے لفظ و بیاں میں لکنت سی آ گئی ہے
ہمارے ذہنوں کی سرد جھیلوں میں
برف کی اِک تہہ سی جم گئی ہے
ہمارے جذبے سسک رہے ہیں
ہمارے نوحے بلک رہے ہیں
خطیبِ اعظم، امامِ مسجد لہو لہو ہے
تمام مسجد میں غم کے بادل برس رہے ہیں
تمام مسجد فغاں میں ____ بھیگی ہوئی ہے ایسے
کہ جیسے برسات کی جھڑی ہو۔
میں سوچتا ہوں
زمینِ کرب و بلا سے زلفی ؔ
دیارِ لاہور تک یہ بارش رہے گی کب تک
یزید ملعون کی یہ بدعت چلے گی کب تک
زمانے والو!
خدارا سوچو ____ خدارا سمجھو

رسولؐ برحق کی نسل پر یہ ستم کی آندھی چلے گی کب تک

زمانہ بیدار ہو چکا ہے

ضمیر تلوار ہو چکا ہے

شرافتوں کا لہو بہانا

یزید بدبخت کی ہے بدعت

زمانے والو!

یزیدیت کی رذیل سازش کی کیچلی سے نکل کے دیکھو

حسینیتؑ کے مہکتے پھولوں میں زندگی کا نکھار سونگھو

رسولؐ اقدس کے راستے کی بہار سونگھو

خدا کی خوشبو میں زندگی کا قرار سونگھو

زمانے والو!

وہ ایک انسان ــــــــ ایک مجاہد

وہ اِک سپاہی ــــــــ وہ مردِ کامل

خطیبِ منبر ــــــــ امامِ مسجد

طریقتِ مصطفیٰؐ کا ــــــــ عابد

علومِ حیدرؑ کا ایک ــــــــ مبلغ

حسینؑ ابن علیؑ کے کردار کا مفسر

کہاں ملے گا؟

سیاہ شب کی مہیب ناگن نے

دن کا سورج نگل لیا ہے

تمہیں یہ سورج کہاں ملے گا۔

شہیدِ ملت ___ عظیم جعفر

شہیدِ ملت تری جدائی ہے شاق دل پر
ہماری آنکھیں تیری محبت میں تر بتر ہیں
ہم عہد کرتے ہیں تیرے خوں سے
تیری دکھائی ہوئی ڈگر پر
تیرے اجالوں کی رہ گزر پر
چلیں گے چلتے رہیں گے ہم سب
بہ عزم وہمت بہ قلبِ مضطر
شہیدِ ملت، عظیم جعفر ___ خودی کے پیکر
درود تجھ پر، سلام تجھ پر۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اظہار تشکر

سب سے پہلے میں بارگاہِ ایزدی میں سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس ربِّ جلیل نے مجھے اس کام کو کرنے کی سعادت عطا فرمائی۔

یوں تو ہر مومن کا ایمان ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے جو بھی نعمتیں عطا فرمائیں، وہ سب محمدؐ اور آلِ محمدؐ کے طفیل ہیں۔ مگر مجھے اس سلسلہ میں خصوصی فخر حاصل ہے کہ میرے والدِ محترم نے ساری زندگی محمد و آلِ محمد سلام اللہ علیہم کے فضائل و مصائب بیان کئے اور اپنے اور اپنے بچوں کیلئے روزی کمائی۔ اس طرح میرے جسم کا ایک ایک قطرہ محمدؐ و آلِ محمد کا مرہونِ منت ہے، بقول ڈاکٹر مسعود رضا خاکی مرحوم۔

عمر بھر کرتے رہے آلِ عبا کا تذکرہ
سرخ رو ہو کر گئے جعفر خدا کے سامنے

مجالس کی جو کیسٹ اس مجموعہ میں شامل کی جارہی ہیں، ان میں سے بیشتر ڈاکٹر افضال حسین صاحب نے عطا فرمائی ہیں۔ میں ڈاکٹر صاحب اور اُن کے اہلِ خانہ کا بے حد شکر گزار ہوں اور ڈاکٹر صاحب کی صحت و سلامتی کیلئے دست بدعا ہوں۔ قارب حسین زیدی صاحب نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ اس کتاب کی کمپوزنگ کی، میں اُن کا بھی بہت شکر گزار ہوں۔ اس کتاب کی تیاری میں مجھے میری اہلیہ اور چاروں بیٹیوں کی بھرپور حوصلہ افزائی حاصل رہی، خصوصاً میری دوسری بیٹی انجم مسعود نے بھرپور اور مکمل تعاون کیا۔ میں دلی دعاؤں کے ساتھ ان سب کا ممنون ہوں۔

جناب علامہ نیاز محمد صاحب ہمدانی نے اس کتاب کی تیاری میں شروع سے آخر تک اہم ترین کردار ادا کیا۔ والد صاحب سے علامہ صاحب کی محبت وخلوص اور عقیدت کا معترف ہوں۔ میں دل کی گہرائیوں سے علامہ صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ چہاردہ معصومینؑ کے صدقہ میں ہمدانی صاحب کو طویل عمر عطا فرمائے اور اُن کی توفیقات میں اضافہ فرمائے، آمین۔

میں جناب علامہ طالب جوہری صاحب قبلہ کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی انتہائی مصروفیات اور ناسازیٔ طبع کے باوجود والد صاحب کی تقریر وتحریر پر اپنے گرانقدر اور زریں خیالات کا اظہار فرمایا جو اس کتاب میں شامل کئے جا رہے ہیں۔

میں بارگاہِ رب العزت میں دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ بہ طفیل چہاردہ معصومین علیہم السلام علامہ صاحب کو صحت وسلامتی کے ساتھ عمرِ طویل عطا فرمائے (آمین ثم آمین)۔

والد صاحب کی مجالس کی کچھ اور کیسٹس بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ اس کتاب کا حصہ دوم بھی انشاء اللہ جلد شائع کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ والد صاحب کے کچھ بہت ہی اہم اور گرانقدر مضامین کا مجموعہ بھی الحمد للہ پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے اور بہت جلد منظر عام پر آجائے گا۔ امید ہے کہ ان کتب سے تشنگانِ علم کی پیاس بجھانے میں کافی مدد ملے گی، خصوصاً اُن حضرات کو جنھیں ذاکرین محمدؐ وآلِ محمدؐ ہونے کا شرف حاصل ہے، بہت ہی گرانقدر اور مستند مواد حاصل ہوگا۔

مؤمنین کی دعاؤں کا طالب

ڈاکٹر نصیر عالم زیدی

پہلی مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ. اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ. اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ، یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْلَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ. نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ. یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ. (نور:۳۵)۔

خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ اللہ کے نور کی مثال ایک ایسے چراغ کی ہے جس کی روشنی شب تار کو روز روشن کردے گی۔ وہ چراغ جس کی حفاظت کیلئے شیشہ بھی ہے اور شیشہ اتنا شفاف گویا کہ وہ کوکب دُرّی ہے۔ روشن کیا جاتا ہے یہ چراغ ایک ایسے شجر طیبہ سے جو نہ شرقی ہے نہ غربی ہے۔ قریب ہے کہ روغن اس چراغ کا روشن ہو جائے اگرچہ آگ نے اُسے چھوا بھی نہ ہو۔ سلسلۂ نور پیہم ہے (متواتر ہے، بلا فصل ہے) اللہ کے اُس نور کی طرف راہ وہی پائے گا جس کو خدا چاہے۔

یہ نہ سمجھئے گا حضرات کہ یہاں تک آیت ختم ہوگئی۔ نور کا بیان اگر بیانِ ایزدی ہے تو نہایت طولانی ہے۔ ابھی تو آغاز ذکر ہے۔ اس کے بعد بھی تفصیل ہے اور پورا پورا بیان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مداحی اس نور کی خدا پر ختم ہے۔ خدا کی حمد اس نور پر ختم ہے اور اس نور کی مدح خدا کی ذات پر ختم ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ یہ جملہ بلا تامل کہہ دوں کہ اتنی تو قدرت نے اپنی ذات کی بھی شناخت نہیں کروائی، اتنا کثیر ذکر تو اُس ذاتِ باری نے اپنا بھی نہ کیا جتنا اِن حضراتؑ کا ذکر کیا۔ حضرات! یہ اس لئے کہ قدرت مطمئن ہے کہ جتنے یہ پہچانے جائیں گے، اتنا اتنا میں پہچانا جاؤں گا۔ ان کا پہچانا جانا انہی کا پہچانا جانا نہیں رہے گا، وہ میرا پہچانا جانا ہوگا۔ جو انہیں کم پہچانیں گے، وہ مجھے بھی کم پہچانیں گے۔ جو ان کو نہ پہچانیں گے، وہ مجھے بھی نہ پہچانیں گے۔ خداوندا! شکر

ہے تیرا کہ ہم نے سن کر انہیں پہچانا۔ افسوس اُن پر ہے جنھوں نے دیکھ کر بھی نہ پہچانا۔ ہماری شنید ہے، دید نہیں ہے۔ سنا ہم نے اور پہچانا، وائے اُن پر جنھوں نے دیکھا اور نہ پہچانا۔ میں نے پوری ایک کتاب لکھ دی ہے اس جملے میں، ورنہ ہم نے شجاعت اُن کی سنی ہے، دیکھی نہیں۔ سخاوت اُن کی سنی ہے، دیکھی نہیں۔ حکمت اُن کی سنی ہے، دیکھی نہیں۔ ہم نے انہیں پہچانا اور مانا۔ مگر ظاہر ہے کہ کسی کی یہ دید بھی تو تھی۔ فتح خیبر کو جیسا انہوں نے دیکھا ہوگا اور جس نظر سے انہوں نے دیکھا ہوگا، جو فتح نہ کر سکے تھے، کتنی گہری نظر سے دیکھا ہوگا۔ کیا کہنا اُس چراغ کا جسے قدرت نے اپنا شاہکار قرار دیا۔ جس چراغ کی تابانیوں پر خداوندِ عالم کو فخر اور ناز ہے۔ کیا کہنا اُس چراغ کا جو قیامت تک روشن رہنے والا ہے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ نہ شرقی ہے نہ وہ غربی ہے۔ کہاں سے ہوتا وہ شرقی یا غربی؟ اُس وقت روشن ہوا کہ جب وقت نہ تھا۔ اُس زمانہ میں روشن ہوا کہ جب زمانہ نہ تھا۔ آفتاب نہ تھا، ماہتاب نہ تھا، ارض وسماء نہ تھے، شرق و غرب ہی نہ تھے تو کہاں سے وہ شرقی ہوتا، کہاں سے وہ غربی ہوتا۔

غرضیکہ اُس کے ایک ایک جزو کو بیان کیا۔ ایک جملہ اور کہہ دوں کہ پروردگارِ عالم ناز کرتا ہے اپنے اس جملے پر " يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْلَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ"۔ بات یہ ہے کہ چراغ آگ سے بھی روشن ہوتے ہیں۔ روشن بھی ہوتے ہیں مگر جلتے بھی ہیں اور جو جلتے ہیں وہ جلا بھی دیتے ہیں۔ خداوندِ عالم نے اس چراغ کو چراغِ رحمت قرار دیا۔ آگ کیسی؟ یہ چراغ تو ہے ہی وہ چراغ جو نار سے بچانے والا ہے۔ بچائے گا وہی جو خود بچا ہوا ہوگا تو دوسروں کو بچائے گا۔ نار سے روشن ہونے والے چراغ تو روشن ہوتے ہیں مگر سوزش ہوتی ہے۔ جلتے بھی ہیں اور جلاتے بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نار کی ایک مخلوق تھی بلندیٔ فلک پر۔ جو نار سے پیدا ہوا تھا وہ جل اٹھا مگر حضرات! مجھے اس مقام پر جو کہنا ہے وہ یہ ہے کہ سجدہ کرنے والے سجدے کر رہے تھے، نہ کرنے والا جل رہا تھا، سرکش بنا ہوا تھا۔ آدم مسجود بھی ہو رہے تھے، محسود بھی ہو رہے تھے۔ عربی کی ضرب المثل ہے، "صاحب المال حاقد او محقود"۔ "صاحب مال (مال دار) آدمی یا کینہ رکھتا

ہے یا اُس سے کینہ رکھا جاتا ہے"۔ "صاحب العلم حاسداو محسود"۔

لفظ حسد پر ایک بات یاد آرہی ہے۔ سوچتا ہوں کہ کہنے کی ہے یا نہیں مگر بات اتنی پکی ہے کہ جسے طبری نے بھی بیان کیا ہے اور ہمارے علامہ شبلی نے بھی الفاروق میں بیان کیا ہے۔ میں نے بھی رسالۂ فدک میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس گزر رہے تھے کسی راہ سے۔ اُس راہ میں محفل جمائے کوئی گمراہ بھی بیٹھا تھا۔ لاثانی کہیے حضرت عبداللہ ابن عباس کو دیکھ کر انہوں نے اشارہ کیا ان کو بلانے کا اور بلا کر اُن سے کہا کہ میں نے تمہارے اور علیؑ کے بارے میں خبریں متواتر سنی ہیں مگر آج تک میں نے اُن خبروں کا ذکر تم سے نہیں کیا کہ تمہاری قدر و منزلت میری نظر سے گر نہ جائے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس نے کہا کہ ہماری باتیں جو آپ تک پہنچی ہیں، مجھے بتایئے بھی تو کہ کیا پہنچی ہیں؟ اگر وہ باتیں صحیح ہوں گی تو ہماری قدر کیوں گرے گی؟ انہوں نے فرمایا کہ میں یہ برابر سنتا رہتا ہوں کہ تم دونوں کا قول یہ ہے کہ خلافت ہم سے غصب کی گئی ہے۔ ہم سے حسد کیا گیا ہے اور ہم پر ظلم کیا گیا ہے۔ مگر بات اصل میں یہ ہے (سننے کی بات ہے حضرات! میں یہ سوچ تو رہا تھا کہوں کہ نہ کہوں) کہ قریش نے اس امر سے کراہت کی کہ نبوت اور امامت ایک ہی گھر میں جمع ہوں۔ لہٰذا انہوں نے اپنے لئے چن لیا کسی کو۔ حضرت عبداللہ نے جواب دیا کہ سرکار! آپ نے جو بات کراہت کی کہی ہے وہ بات آپ ہی کی کہی ہوئی نہیں ہے، وہ بات تو اتنی پختہ ہے اور آپ کا قول اتنا درست ہے کہ وہ تو قولِ خداوندی ہے۔ بڑے خوش ہوئے وہ اس جملے پر کہ میری زبان پر آیت ہے خدائے عالم کی۔ بہت مشتاق ہوئے اور پوچھا کہ وہ بات کہاں ہے؟ کونسی آیت ہے؟ حضرت عبداللہ نے فوراً آیت پڑھی:

"کَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ"۔ (محمد:۹)

"کراہت کی لوگوں نے اللہ کی قرارداد سے تو اللہ نے اُن کے اعمال ضبط کر لئے"

یہ آپ ہی کی شان میں ہے۔ وہ خدا کی بات ہے جو آپ کی زبان پر آگئی۔" امت راہ

راست پر رہتی اگر اُس کو چنتی جس کو خدا نے چنا، اور رہ گئی حسد کی بات اور ظلم وستم کی بات تو دنیا جانتی ہے کہ کیا ظلم ہوا اور کس طرح سے حق کو غصب کیا گیا۔ دیکھنا ہم پر ویسا ہی حسد ہوا ہے جیسا ابلیس نے آدم پر کیا تھا''۔

غرضیکہ حضرات! ناری تھا ایک، جل اٹھا، مگر قدرت نے اُس سے ایک سوال کیا:

''اَسْتَکْبَرْتَ اَمْ کُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ ''۔(ص:۷۵)۔

جس کے معنی یہ ہیں کہ ''یہ چراغ اس وقت بھی روشن تھا''۔ آدم مسجود بھی ہو رہے تھے اور محسود بھی ہو رہے تھے۔ سجدہ گزار سجدے کر رہے تھے، سرکش سرکشی میں تھا اور یہ چراغ وحدت، شاہکار قدرت اپنی جگہ روشن تھا۔ وحدت کو دیکھ کر چراغ کہوں یا وحدت میں کثرت کو دیکھ کر چراغاں کہوں۔ روشن تھے۔ قدرت نے سوال کیا: ''ابلیس کیا تو نے تکبر کیا (سجدہ نہ کر کے) یا تو نے اپنے آپ کو عالین میں سے سمجھ لیا؟'' عالین جمع ہے عالی کی۔ معلوم ہوا کہ ایسی مخلوق وہاں پر موجود تھی جو عالی بھی تھے اور سجدۂ آدم کے وہ محکوم نہ تھے۔ بلند مرتبہ تھے۔ ان کا مرتبہ اتنا مقتدی تو نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کو بھی سجدہ کریں اور خداوند عالم یہ کیسے گوارہ کر سکتا تھا کہ وہ عالی کو سافل بنادے اور سربلند کو سرنگوں کر دے۔ پوچھا گیا کہ کیا تو اُن میں سمجھے ہوئے ہے اپنے آپ کو؟ خدا نے یہ سوال کیا۔ میرا مجمع مجھے یہ بار بار کہنے دے کہ خداوند عالم نے جو پچھلے واقعات بیان کیے ہیں، یہ کہانیاں نہیں ہیں۔ یہ قصہ گوئی نہیں ہے۔ یہ سب ہدایت کے دروازے ہیں جو کھولے جا رہے ہیں۔ یہ ہمیں جو سنایا جا رہا ہے، سنایا ہی نہیں جا رہا، بتایا جا رہا ہے، سمجھایا جا رہا ہے، راہِ راست پر لایا جا رہا ہے۔ ہمیں اُن تمام چیزوں کو سن کر عبرت کا سبق حاصل کرنا چاہیے۔ قرآن کریم قصہ گوئی کی کتاب نہیں ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ قرآن کسی کی قصیدہ خوانی کی کتاب نہیں ہے۔ کسی کی عیب جوئی کی کتاب نہیں ہے۔ قرآن کا کام نہیں ہے کہ کسی کی تعریف کرے، قرآن کا کام نہیں ہے کہ کسی کی مذمت کرے، قرآن تو آئین ہے۔ آئین کو کسی کی مدح سے تعلق کیا؟ قرآن کو کسی کی مذمت سے سروکار کیا؟ قرآن کُل ہے تو ہدایت کیلئے، جزو ہے تو

ہدایت کیلئے، آیت ہے تو ہدایت کیلئے اور سورۃ ہے تو ہدایت کیلئے۔ جو چیز ہدایت کیلئے ہو، آئین کی حیثیت میں ہے۔ آپ نے کبھی دیکھی ہے کسی قانون کی کتاب میں کسی کی مدح یا مذمت؟ قرآن کا نصب العین نہ تو کسی کی مدح ہے نہ مذمت۔ مگر کی تو ہے قرآن نے کسی کی مدح اور کسی کی مذمت۔ جب قرآن کا ہر جزو، قرآن کی غرض ہدایت ہے تو صاف پتا چلتا ہے کہ اگر ہدایت کا دروازہ مدح کئے بغیر کھل سکتا تو قرآن کبھی مدح نہ کرتا، اگر ہدایت کا حق مذمت کئے بغیر پورا ہو سکتا تو کبھی قرآن مذمت نہ کرتا۔ بالفاظ دیگر اگر مدح ہے کسی کی قرآن میں تو ہدایت کیلئے اور اگر مذمت ہے کسی کی قرآن میں تو ہدایت کیلئے۔ (صلوٰۃ)۔

یہ میرا جملہ بیکار نہ کر دیجئے گا کہ کتابیں قرآن سے پہلے بھی آئی ہیں، آتی بھی رہیں اور منسوخ بھی ہوتی رہیں۔ ظاہر ہے آتی رہیں اور منسوخ بھی ہوئیں۔ جو احکام اُن میں تھے، وہ بھی منسوخ ہو گئے۔ جو قراردادیں اُن میں تھیں وہ بھی منسوخ ہوئیں۔ اُن کتابوں کی نہ مدح پائیدار ہے نہ اُن کی مذمت پائیدار ہے۔ ہر کتاب کے بعد نئی کتاب اُس کی ناسخ بنتی رہی۔ مگر قرآن وہ کتاب آخر ہے، قدرت کا یہ وہ حرف آخر ہے جو منسوخ تو کرنے والا ہے مگر منسوخ ہونے والا نہیں۔ اس میں جو جس صورت میں آ گیا، وہ قیامت تک کیلئے آ گیا۔ کوئی حکم اس کا منسوخ نہیں ہو سکتا۔ کوئی قرارداد اسکی منسوخ نہیں ہو سکتی۔ قیامت تک کیلئے ناسخ ہے، اس کے بعد نہیں۔ جو چیز قرآن میں آئی ہے، قیامت تک رہنے کیلئے آئی ہے۔ جھوم جھوم کر لوگ کہتے تو ہیں قرآن کے بارے میں کہ جی اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ خدا کے بندو! یہ بھی تو کہو کہ جس کی مدح ہے قرآن میں، خدا نے اُس کی مدح کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اور جس کی مذمت ہے قرآن میں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ قرآن کی مدح بھی قائم ہے، قرآن کی مذمت بھی قائم ہے۔ تم نہیں، خدا اس کا محافظ ہے۔ قرآن میں مدح آ گئی وہ بھی قیامت تک محفوظ اور مذمت آ گئی تو وہ بھی قیامت تک محفوظ ہے۔ گویا کہ قرآن خود لوح محفوظ ہے۔ ایک جملہ بڑی آسانی اور سادگی سے کہنا چاہتا ہوں۔ آسان ہے توریت میں کسی کی مدح کا آ جانا، تھا وہ اُس وقت مدح کے لائق، کر دی توریت

میں اُس کی مدح۔ آسان ہے انجیل میں کسی کی مدح کا آجانا، تھا وہ اس وقت مدح کے لائق، آگئی انجیل میں اُس کی مدح۔ منسوخ ہونے والی تو تھی، ہمیشہ کیلئے رہنے والی تو نہ تھی۔ مگر قرآن کی مدح بھی قیامت تک قائم اور قرآن کی مذمت بھی قیامت تک قائم! مجھے پورا حق ہے یہاں یہ جملہ کہہ دینے کا کہ قرآن مدح کر نہیں سکتا کسی کی جب تک یہ نہ دیکھ لے کہ یہ قیامت تک لائق مدح رہے گا۔ (صلوٰۃ)۔ اور قرآن مذمت کر نہیں سکتا کسی کی جب تک یہ نہ دیکھ لے کہ یہ قیامت تک لائق مذمت رہیگا۔ ممدوحِ قرآن قیامت تک ممدوح اور مذمومِ قرآن قیامت تک مذموم۔

کیا کہنا اُس کا جو قرآن کا ممدوح اور کہاں ٹھکانا اُس کا جو قرآن کا مذموم ہو۔ چراغ کو قدرت نے نار سے بری رکھا، اس لئے کہ مقصد ہی یہ ہے کہ قدرت کا کہ وہ دوسروں کو بھی نار سے بری کرتا رہے۔ نار سے اُسے بچاتا رہے، اس لئے قدرت نے اُس کو بھی نار سے بچایا "لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ"۔ "نار (آگ) اُسے چھو نہیں سکتی"۔ بغیر نار کے وہ روشن ہونے والا ہے کیونکہ چراغ وہ ناری نہیں ہے، نوری ہے۔ چراغ رحمت ہے اور بقول قرآن عین رحمت ہے۔

"وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ"۔

اور یہ بھی تو کہوں کہ عین رحمت قرار دیئے جانے کے بعد خدا کے پاس اب کوئی رحمت رہی نہیں۔ اس کو عین رحمت قرار دیا اور خدا کی بارگاہ میں رحمتوں کی فراوانی تو ہے۔ لہٰذا عین رحمت بھی ہے اور اُس پر نزولِ رحمت بھی ہے۔ خود بھی رحمت ہے اور اُس پر رحمتیں برستی رہیں گی۔ منزلِ رحمت بھی رہے گا اور اُس پر نزولِ رحمت بھی رہے گی۔ جنابِ والا! مجھے اس مقام پر یہ جملہ برمحل معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی چراغ رحمت کے قریب آجائے، دشمن چراغ بن کر بیٹھ جائے، لپٹ جائے، دشمن چراغ بن کر کوئی کتنی ہی قربت حاصل کر لے، یہ قربت قربتِ رحمت نہیں ہو سکتی۔ دشمن بن کر آیا ہے، لہٰذا جتنا بھی قریب ہوگا، عذاب سے قریب ہوگا۔ بربنائے عداوت عذاب سے قریب ہوگا۔ کون کہتا ہے کہ ایک سرزمین کی تاثیر ہر ایک کیلئے ایک ہوگی۔ قدرت نے یہ تمام نمونے ہمیں دکھا کر سمجھائے ہیں کہ دیکھو موسیٰ اپنی قوم کو لئے ہوئے دریائے نیل کے کنارے

پہنچے۔ قرآن میں صرف اس جگہ لفظ اصحاب آیا ہے نبی کی نسبت سے، ورنہ اور کہیں نہیں ہے۔ اب قرآنی آیات نے مفصل واقعہ بیان کیا ہے کہ صبح کی روشنی ہو چکی تھی۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ فرعون اپنا لشکر لئے ہوئے پکڑ دھکڑ کے لئے بڑھا چلا آرہا ہے۔ یہ نوبت آگئی کہ انہوں نے اپنے دشمنوں کو دیکھ لیا اور دشمنوں نے ان کو دیکھ لیا۔ ''تَرَاءَ الْجَمْعٰنِ'' دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔ یہ لفظ ہیں قرآن میں۔ جب دیکھ لیا، حضرات! یاد رکھئے۔ خداوند عالم نے اپنے ان آخری پیغمبر کو موسیٰ سے تشبیہ دی۔

''کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا''۔

اور رسولؐ برحق کی بھی حدیث ہے:

''یا علی انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ''۔

''اے علیؑ! تجھے مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی''۔

اس کو نظر میں رکھئے گا، اب میں آگے چلتا ہوں کہ جب ایک جماعت نے دوسری کو دیکھ لیا باہم دیگر، اب قرآن کریم یہ لفظ کہتا ہے:

''قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓی اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ''۔

''اصحابِ موسیٰ نے کہا ہم تو پکڑے گئے''۔

یہ جملہ ڈر کر ہی کہا۔ واقعی موقع ہی ایسا تھا کہ آگے دریا ہے اور پیچھے طاقتور دشمن۔ یہ دھیان نہ رکھا انہوں نے کہ بچانے والا تو ساتھ ہے۔ موسیٰ نے جواب دیا:

''قَالَ کَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ''۔

''ہرگز نہیں میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ میرا ساتھ دیگا'' فرمایا اور عصاء دریا پر مارا۔ دریا پھٹ گیا۔ پانی دونوں طرف اس طرح کھڑا ہو گیا کہ جیسے عظیم ٹیلیں۔

اُس سرزمین پر پہلی مرتبہ دھوپ پڑی اور جنابِ موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے ساتھ جیسے بھی لوگ تھے، سب ہی بچ گئے اور دریا کو عبور کیا انہوں نے۔ جب دریا پھٹا کس کیلئے؟ موسیٰ کیلئے،

تو موسیٰ کیلئے سرزمین رحمت ہے وہ جگہ یا نہیں؟ خدا کی رحمتیں برسی ہیں اُن پر۔ وہ جگہ جائے رحمت موسیٰ کیلئے۔ مگر پیچھا کرتا ہوا فرعون اُسی جگہ پہنچا۔ جگہ تو ایک ہی ہے، کسی کا بیڑہ پار ہو رہا ہے، کسی کا بیڑہ غرق ہو رہا ہے۔ یہ سمجھنا تو حضرات غلط ہے کہ ایک سرزمین کی تاثیر ہر ایک کیلئے ایک ہی ہو۔ موسیٰ کیلئے انتہائی رحمت کی جگہ ہے اور دشمنِ موسیٰ کیلئے؟ پہنچا وہ بھی وہیں مگر ظاہر ہے کہ غرقِ دریائے عذاب ہوا۔ دشمنانِ موسیٰ کیلئے وہ جگہ نزولِ عذاب کی ہے۔ موسیٰ کیلئے وہی جگہ نزولِ رحمت کی ہے۔ یہ اپنا اپنا نصیب ہے، ایک جگہ کی خاصیت ہر ایک کیلئے ایک نہیں ہوتی۔ صلوٰۃ۔

حضرات! پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اگر ذکرانؑ کا عبادت ہے تو ذکرانؑ کے دشمنوں کا بھی عبادت، ویدانؑ کی عبادت ہے تو دیداُن کی بھی عبادت ہے۔ نہ اُن کے بغیر نماز ہوتی ہے نہ اُن کے ذکر کے بغیر نماز ہوتی ہے نمازی کی نماز میں یہ بھی ہیں اور وہ بھی ہیں۔ جو حیثیت ان حضراتؑ کی ہے، اُس حیثیت میں یہ بھی ہیں۔ جواُن کی حیثیت ہے، اُس حیثیت میں وہ بھی ہیں۔ مومن کا ایمان اگر ان حضراتؑ کو ماننے بغیر نہیں تو اُن کو مانے بغیر بھی نہیں۔ جو یہ ہیں، انؑ کو مانو جو وہ ہیں اُن کو مانو۔ اِن کو بھی مانو، اُن کو بھی مانو۔ کون کہتا ہے کہ ہم اُن کو نہیں مانتے۔ خواہ مخواہ برا مانتے ہیں لوگ۔ غلط بات ہے یہ کہ ہم اُن کو نہیں مانتے۔ ضرور مانتے ہیں اور وہ تو بہت بڑی چیزیں ہیں، ہم ہر ایک کو مانتے ہیں۔ حیوان کو بھی مانتے ہیں، پتھر کو بھی مانتے ہیں، جن کو بھی مانتے ہیں، دن کو اور رات کو مانتے ہیں، خشک کو خشک اور تر کو تر مانتے ہیں۔ قصور ہمارا اتنا ہے کہ ہم دن کو رات نہیں مانتے، رات کو دن نہیں مانتے۔ بڑی فراخدلی ہے، ہر ایک کو مانتے ہیں۔ ہاں! قصور ہمارا یہ ہے کہ نور کو ظلمت نہیں مانتے، ظلمت کو نور نہیں مانتے، سچے کو جھوٹا نہیں مانتے اور جھوٹے کو سچا نہیں مانتے۔ جو جیسا ہے، ویسا مانتے ہیں، صحیح مانتے ہیں، غلط نہیں مانتے!!

حضرات! غرضیکہ میں ذکر کر رہا تھا کہ قرآنِ کریم نے غیب کی بڑی خبریں دی ہیں۔ کلام ہی جب غیب داں کا ہو تو غیب کی خبریں اُس میں نہ ہوں تو کس میں ہوں گی۔ مگر کس لطافت کے ساتھ اور کس احتیاط کے ساتھ!! خداوند عالم کو خبر ہے کہ قرآن کس کس ہاتھ سے گزرے گا، کس

کس دور سے گزرے گا۔ جن کے ادوار سے گزرے گا، جن کے اقتدار سے ہو کر گزرے گا، اگر انہیں کے نام لیکر برائی کردوں تو کیا چھوڑیں گے۔ یہ مصلحت یزدانی ہے۔ میں ہزار باتوں کی ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ خداوند عالم نے مذمت تو اتنی کی ہے کہ کوئی کر نہیں سکتا۔ رسولؐ بھی نہیں کر سکتے اتنی مذمت جتنی قرآن نے کی۔ مدح کی تو حقِ مدح ادا کر دیا اور مذمت کی تو مذمت کو بھی حدِ آخر پر پہنچا دیا۔ مگر احتیاط یہ رکھی کہ نہ مدح میں نام لیا اور نہ مذمت میں نام لیا۔ نام نہ لینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ قرآن کو سب سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ نبی نے اگر کھول کھول کر بات کہی تو نتیجہ تو اُس کا دیکھ لیا۔ قرآن نے سب کچھ کہا مگر کسی نے قرآن کو ہذیان نہیں کہا۔ نبی نے واضح کر کے کہہ دیا تو (نعوذ باللہ) ہذیان کہہ دیا۔ اب یہاں سے اندازہ کیجئے کہ اگر قرآن بھی نام لے لیکر مدح کرتا، یا جو اُن کے دشمن تھے، اُن کی مذمت نام لے لیکر کرتا تو قرآن کا حشر کیا ہوتا؟ یہ احتیاط ہے اُس (ربِّ جلیل) کی اور یہ تدبیر بقائے قرآن ہے۔ بتا تو دیا کہ ہیں کچھ ایسے۔ اُحد کا میدان تھا، نبی تنہا تھے۔ سایہ بن کر ایک ہی ساتھ رہا۔ یہ سارا واقعہ قرآن نے بیان کیا، پورا ذکر کیا، سخت شکایت کی ''تم پہاڑ پر چڑھے چلے جا رہے تھے اور تم جیسے پھر کر بھی نہیں دیکھ رہے تھے کہ ہمیں کون پکار رہا ہے''۔ یہاں یہ جملہ کہوں گا نکتہ رس حضرات کیلئے کہ اُن کے نہ سننے کا خدا کو تو علم تھا کہ نہیں سنی کیونکہ نہیں سنی، اس لئے پشت پھیر کر نہیں دیکھا۔ قرآن تو بے خبر نہیں ہو سکتا تھا یعنی خداوند عالم۔ اگر نبی کی آواز انہوں نے نہ سنی ہوتی تو خداوند عالم بھی یہ شکایت نہیں کر سکتا تھا کہ میرا رسولؐ پکارتا رہ گیا اور تم:

''والرَّسولُ یدعُوکم فی اُخرٰیکُم''۔

کئی جگہ یہ ذکر ہے میں دعوے کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ اگر جہاد کا رخ مسلسل فتح کی جانب رہے تو جنگ میں پتہ نہیں چلتا کہ ثابت قدم کون ہے اور غیر ثابت قدم کون ہے۔ بدر کے بارے میں آپ نے یہ شکایت کسی کی نہیں سنی ہو گی کہ کوئی بھاگا۔ کوئی کیوں بھاگے، جنگ کا پانسہ بنا ہوا ہے۔ جنگ کے ہیرو نے ہر کام بڑھ کر بنا لیا۔ جب بنا لیا تو کوئی کیوں بھاگے۔

بھاگنے کی صورت اصل میں خطرناک موقع ہی پر تو ہوگی۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ جنگِ اُحد میں اسلام کی مغلوبیت جو رونما ہوئی، شکست کے آثار پیدا ہوئے اور رسولؐ برحق پر انتہائی کڑا وقت آ گیا۔ یہ تھوڑے سے وقت کا کٹھن امتحان بے نقاب کر گیا منافقین کو۔ خداوند عالم یہ چاہتا ہے کہ مخلص اور غیر مخلص کو ایک دُوسرے سے جدا کردے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معرکہ اُحد برپا ہی اس لئے ہوا کہ منافقین اور مؤمنین کی پہچان ہو جائے اور اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کی وفاداری کا بیّن ثبوت مہیا ہو جائے۔

خدا چاہتا ہے کہ نمازی پورا قرآن پڑھ لے نماز میں اور تھکے نہیں۔ پورے قرآن کا نچوڑ قرآن میں اُس نے سات آیتوں کو، الحمد جسکا نام ہے، جو پورے قرآن میں ہے، وہ سورۂ الحمد میں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ صدہا آیات کا خلاصہ جہاں سات آیتوں میں ہوگا، وہاں بہت کچھ ذکر اذکار چھوڑے بھی جائیں گے۔ جناب یوسف کا واقعہ تو نہیں ہوگا سورۂ الحمد میں۔ واقعاتِ موسیٰ بھی نہیں ہوں گے۔ واقعات ابراہیم بھی نہیں ہوں گے۔ بہت سی مثالیں ہیں جو نہیں آئیں گی۔ سات آیتوں میں اب کیا کیا آئے۔ تو جو جوہر قرآن ہے، وہ تو رہیگا اور جو حواشی ہیں، وہ ساقط کر دیئے جائیں گے۔ خلاصہ کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ غیر اہم چیزوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے مگر انتہائی اہم چیزوں کو نظر انداز نہیں کیا جاتا ہے۔ پورے قرآن کا خلاصہ ان سات آیتوں میں ہوتا ہے۔ ان سات آیتوں میں بھی نہ حج کا ذکر ہے، نہ روزے کا ذکر ہے مگر کسی کی مدح بھی ہے اور کسی کی مذمت بھی ہے۔ معلوم ہوا کہ مدح و مذمت سے خالی خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے مومنین پر احسان رکھتے ہوئے۔ ''ایمان والو! میں نے کس کس طرح تمہارے دلوں کو سجایا ہے اور کس کس انداز میں تمہارے دلوں کو بنایا ہے''

''حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ''۔

''ایمان والو! میں نے تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت پیدا کی اور ایمان کی محبت سے ہم نے تمہارے دلوں کو سجایا (مزین کیا)'' اور فوراً فرمایا جاتا ہے:

''وکرّہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان''۔

''جہاں ہم نے ایک ایمان سے جس کی محبت تمہارے دلوں میں ڈالی (وہاں تین چیزیں اور بھی ہیں کہ) ہم نے کفر وفسوق کو اور عصیان کو تمہارے لئے مکروہ کردیا (تمہارے دلوں میں ان تین چیزوں کی کراہت پیدا کردی)۔

جس دل میں ایک ایمان کی محبت ہوگی اور کفر وفسوق وعصیان کی نفرت ہوگی وہی صراطِ مستقیم پر ہے۔ مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ کفر کیا ہے اور فسوق کیا ہے اور عصیان کیا ہے؟ مجھے تو اس مقام پر یہ کہنا ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دل میں محبت ہونی چاہئے، نفرت کا کوئی ذکر نہ ہو، وہ آیت تو پڑھیں کہ ''حبّب'' بھی ہے اور ''کرّہ'' بھی ہے۔ محبت ایمان کی پیدا کی ہم نے اور کفرو فسوق وعصیان کی نفرت تمہارے دلوں میں رکھ دی ہم نے۔ جسے وہ (خدا) رکھے، اُسے ہٹائے کون؟ خدا جانے کسے ایمان کہہ دیا قدرت نے اور کس کس کو کفر وفسوق وعصیان کہہ دیا؟ یہ راز نہ کھلتا ہم پر اگر خندق کی جنگ نہ پیش آتی۔ ہم تو یہی سمجھتے کہ ایمان یہاں بھی ماننے کے معنی میں ہے، کفر وفسوق وعصیان یہاں بھی نہ ماننے کے معنی میں ہے۔ مگر سرکارِ دوعالم کا اُس دن کا وہ جملہ کہ:

''برز الایمان کله الی الکفر کله''۔

سرکار نے یہاں علیؑ کو ایمان کہا اور جو علیؑ کے مقابلے میں ہے، اُسے کفر کہا۔ جو علیؑ کے مقابلے میں ہے اُسے کفر کہا۔ آج یہ ہے کل کوئی اور ہوگا۔ مقابلے کی بات ہے۔ جسے کفر کہا ہے، اُسے نام کی وجہ سے تو نہیں کہا، کام کی وجہ سے کہا ہے۔ جب کام کی وجہ سے کہا ہے جو اُس کام کو سنبھالے.....! یہ حضرات ایمان ہیں۔ ایمان کی جگہ ایمان آتا رہے گا، کفر کی جگہ کفر آتا رہے گا۔ قائم مقام بنتے ہی رہیں گے۔ عجیب سی بات ہے کہ اس آیت میں محبوب ایک کو قرار دیا اور مکروہ تین کو۔ (صلوٰۃ)۔

کیا کہنا اس چراغِ وحدت کا! قدرت کی پہلی نظر اس چراغ پر ہوئی، چراغ کی پہلی نظر

کمال قدرت پر ہوئی بلکہ یہ کیوں نہ کہوں کہ قدرت نے چراغ کو دیکھا، اپنی قدرت کو دیکھا، اِن کو دیکھا تو قدرت نے اپنا کمال دیکھا، خدا کی نظر ہے تو اپنا کمال نظر آرہا ہے اور ان کی نظر قدرت پر ہے تو خدا کا جمال نظر آرہا ہے۔ یہ خدا کے ناظر، خدا ان کا ناظر، یہ خدا کے منظور، خدا ان کا منظور۔ کیا کہنا اس چراغ کا! یہی وجہ ہے کہ روشن ضمیر ہیں وہ کہ جن کی لو اس چراغ سے لگی ہوئی ہو۔ ہماری لو لگے تو اس چراغ سے لگے اور اس چراغ کی لو خدا سے لگی ہوئی ہے۔ یوں کہہ دوں کہ اس چراغ کی وساطت سے ہمیں خدا نظر آرہا ہے۔ کیا کہنا اس روشن چراغ کا! حضرات ذرّوں کو آفتاب بنادیا اس چراغ کی روشنی نے۔ وہ اس چراغ ہی کا کمال ہے کہ کوئی سلمان ہو گیا، کوئی ابوذر ہو گیا، کوئی مقداد ہو گیا، کوئی عمار ہو گیا۔ یہ نام میں نے حضرات! خاص طور پر اس لئے لئے ہیں کہ امت کے جتنے بھی افراد ہیں، وہ سب جنت کے مشتاق ہیں، ملے یا نہ ملے۔ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا۔

شکست و فتح نصیبے کے ہاتھ ہے اے ذوقؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

ہر ایک جنت کا مشتاق ہے مگر سرکارِ دو عالم فرماتے ہیں کہ جنت مشتاق ہے سلمان کی، ابوذر کی، مقداد کی، عمار کی۔ کہاں سے یہ درجہ ملا؟ یہ اسی بارگاہ سے۔ دامانِ دولت ____ اہلِ بیتِ اطہار جن کے ہاتھ میں ہے، اُن کا یہ مرتبہ ہے کہ جنت اُن کی مشتاق ہے۔ ذرہ تھے، ابوذر ہو گئے۔ کیا تھے، کیا سے کیا ہو گئے۔ حضرات! یہ مرتبہ ہے ابوذر کا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ جس کے ہاتھ میں دامانِ دولتِ اہلِ بیتِ اطہار دیکھا حکومتوں نے، اُس کے جان و مال کے درپے ہو گئے کیونکہ حُبِ آلِ محمدؐ ایسا جرم قرار دیا جاتا رہا ہو جو لائقِ عفو نہیں تھا۔ اس جرم کے مجرم کی سزا موت سے کم نہیں تھی۔ یہ میں نے کسی جذبے میں کہا ہے اور امام شافعی کا مجھے وہ شعر یاد آتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

اِنْ کَانَ ذَنْبُ حُبَّ آلِ محمد
ذالِکَ اَمرٌ لَسْتُ اَتُوبُ منہ

''اگر حبِّ آلِ محمدؑ اختیار کرنا میرا کوئی گناہ ہے، (گناہ سہی) میں تو جیتے جی اس گناہ سے کبھی توبہ نہیں کروں گا''۔

واقعاً حبِّ آلِ محمد کا گناہ جس دل میں سما گیا پھر وہ گناہ اُس دل سے نکلا نہیں۔ مطلب دراصل اُن کا یہ ہے کہ توبہ تو گناہ سے ہوتی ہے (کم بختو) حبِّ آلِ محمد تو عبادت ہے۔ اللہ اکبر! یہاں تک کہہ رہے ہیں وہ:

''هم شفعائی یوم حشری و موقفی''۔

''یہی وہ آلِ محمدؑ ہیں، یہی تو میرے شفیع ہیں'' (بخشوانے والے)، میرے حشر کے دن میرے موقف کے دن۔

جو جنت میں لے جائیں، اُن کی محبت گناہ ہو تو کیا جہنم میں لے جانے والوں سے محبت کروں۔ جو جہنم میں لے جائیں، اُن سے محبت کیوں کروں؟ جائیں جہنم میں۔

غرضیکہ حضرات! جس نے حب آلِ محمد کو اختیار کر لیا، یہ ایسا پائیدار نشہ ہے کہ اترتا نہیں ہے چاہے کچھ بھی گزر جائے۔ جناب ابوذر پر حکومتوں نے زور دیئے کہ چھوڑ دیں حُبِ آلِ محمد مگر حب آلِ محمد کا خود اتنا زور تھا کہ کسی زور حکومت سے یہ کمزور نہیں پڑے بلکہ جتنی جتنی کمزوری سن و سال کی بڑھی، اُتنا اُتنا ہی زور حب آلِ محمد کا بڑھا۔ اب بڑھاپا ہے، بدن کانپتا ہے مگر حالت یہ ہے کہ مسجد نبویؐ کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ تقریر شروع کر دی۔ فضائلِ اہلِ بیتؑ کا ذکر شروع کر دیا۔ بس یہ کھل رہا ہے، یہ ذکر اور یہ چرچا کھل رہا ہے حکومت کو۔ اللہ اللہ حب آلِ محمدؑ کے مجرم کیلئے نہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ صحابی ہے۔ بڑا درجہ ہے اصحابِ محمد کا۔ بڑی عزت ہے صحابی کی مگر وہ صحابی جو ان حضراتؑ کا محب ہو جائے پھر وہ کچھ نہیں ہے سوائے مجرم ہونے کے۔ جناب ابوذر کا مرتبہ یہ ہے کہ سرکارِ دوعالم نے کہا ہے کہ جو عیسیٰؑ کا زہد دیکھنا چاہے، وہ ابوذر کے زہد کو دیکھے۔ یہاں تک سرکارؐ کا ارشاد ہے کہ:

''مَا اَظَلَّتْ خَضْرَاءُ وَمَا اَقَلَّتِ الْغَبْرَاءُ عَلٰی اَصْدَقَ مِن اَبِی ذَرٍّ''۔

"آسمان نے سایہ نہیں ڈالا، زمین نے بوجھ نہیں اٹھایا اُس کا جو ابوذر سے زیادہ سچا ہو"۔ مگر سرکار آپ لاکھ صادق کہیں ابوذر کو آپؐ کے صادق کہے ہوئے کو کوئی صدیق نہیں کہے گا۔ نتیجہ یہ قرار پایا کہ ابوذر کو کبھی مدینہ سے شام کی طرف نکلوا دیا گیا اور جب شام میں جا کر ابوذر نے فضیلتِ اہلِ بیتؑ کی روشن صبح کر دی تو آخر واپس بلایا اور واپس بلا کر اب آخری وقت ہے، ضعف کی انتہا ہے، کمزوریوں کی انتہا ہے، مدینہ سے جلاوطن کیا جاتا ہے۔ ایسی جگہ بھیجا جائے کہ جہاں ان کی تقریر کا سننے والا کوئی نہ ہو کیونکہ تقریر جب بھی ان کی ہوتی ہے فضیلتِ اہلِ بیتؑ کے بارے میں۔ حد یہ ہے کہ مدینے سے نکالا جا رہا ہے ربذہ کی طرف تو اعلان یہ ہے کہ ابوذر سے ملنے کیلئے کوئی شخص گھر سے نہ نکلے۔ کون نکلتا؟ مگر جن کے جرمِ الفت میں ابوذر نکالے جا رہے تھے، وہ کیسے نہ نکلیں!! جوانانِ ہاشمی نکلے، سید الحرب نکلے، جوانانِ جنت کے سردار نکلے۔ (صلوٰۃ)۔

خاندانِ رسالتؐ کے افراد نکلے اور ابوذر سے ملے۔ اُس وقت کا منظر یہ بتاتا ہے کہ ابوذر کی نظر ان پر تھی اور ان کی نظر ابوذر پر تھی۔ ابوذر رو رہے تھے اور روتے ہوئے فرما رہے تھے کہ اب نبی کی جیتی جاگتی تصویریں مجھے دیکھنے کا موقع نہ ملے گا۔ جب مجھے دیدِ پیغمبرؐ کا اشتیاق ہوتا تھا تو میں ان کی یادگاروں کو دیکھ لیا کرتا تھا۔ جنابِ امیر علیہ السلام نے تسکین دلائی اور یاد دلایا کہ ابوذر تمہارے اُس وقت کے سفر کا ذکر رسولؐ تم سے کر چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ چار آدمیوں کا یہ قافلہ زوجۂ ابوذر، فرزندِ ابوذر اور دخترِ ابوذر۔ ان چار افراد کا قافلہ مدینے سے نکالا جا رہا ہے اور بے آب وگیاہ مقام پر لے جا کر چھوڑ دیا۔ مختصر یہ ہے فاقوں کی نوبت آگئی۔ فاقوں کی نوبت آئی تو سب سے پہلے ان کی زوجہ کی وفات ہوئی۔ اُس مومنہ کو باپ اور بیٹے نے مل کر دفن کیا۔ اُس حادثہ کے بعد ان کے بیٹے کی وفات ہوئی۔ دل چاہتا ہے کہ کہوں، اگرچہ بے کسی تھی جنابِ ابوذر کی، مگر پیروں میں بیڑی نہیں تھی۔ نرغے میں نہیں تھے۔ جب بیٹا مر گیا تو عصا ہاتھ میں لئے ہوئے کبھی ادھر کے راستے پر پہنچے کبھی اُدھر کے راستے پر پہنچے۔ راستے میں چلنے والوں سے کہا کہ بیٹا مر گیا ہے، چلو میری مدد کرو۔ لے آئے راستوں پر جا جا کر کچھ افراد کو۔ مختصر یہ ہے کہ صحرائے غربت میں ابوذر کا

بیٹا بھی بے دفن نہ رہا۔ اب ایک باپ اور بیٹی رہ گئی۔ اب ابوذر کی حالت بھی غیر ہو رہی ہے۔ بیٹی دو حادثے دیکھ چکی تھی۔ گھبرا کر کہا کہ بابا! کیا کروں گی۔ آپ کی حالت کو بھی غیر دیکھ رہی ہوں۔ فرمایا بیٹی! میں بے خبر نہیں ہوں۔ آج کے دن کی خبر مخبرِ صادق مجھے دے چکے ہیں۔ فرمایا تھا کہ ابوذر مجھے رنج ہوتا ہے یہ یاد کر کے کہ تیری آخری زندگی تنہائی میں گزرے گی۔ موت آئے گی تجھے جب تو تنہا ہوگا۔ میں نے یہ پوچھ لیا تھا سرکارِ دو عالم سے کہ سرکار اکیلا ہو کر مروں گا تو مجھے دفن کون کرے گا؟ سرکارؐ نے فرمایا تھا کہ گھبراؤ نہیں، اہلِ عراق کا ایک قافلہ پہنچ جائے گا، وہ تمہارے غسل و کفن کا کفیل ہوگا۔ تو بیٹی تم مت گھبراؤ۔ لاش میری پڑی نہیں رہے گی۔ اتنا کرو کہ مجھے راستے کے کنارے پر لے چلو۔ بیٹی باپ کو راستے کے کنارے پر لائی۔ مختصر یہ ہے کہ باپ نے بیٹی سے وصیت کی کہ بیٹی روح میری بدن سے نکل جائے تو لاش پر چادر ڈال دینا۔ اگر کوئی وہاں چادر چھیننے والا ہوتا۔ اگر دخترِ ابوذر بے ردا ہوتی تو وصیت ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ چادر لاش پر ڈال دینا اور میرے سرہانے بیٹھی رہنا۔ گرد اٹھے گی، قافلہ آئے گا تو بس کھڑے ہو کر بتا دینا کہ یہ میت ابوذر کی رکھی ہے۔ دنیا سے رخصت ہو کر چادر بیٹی کے پاس تھی۔ میت کو اڑھا دی۔ سرہانے بیٹھی رہیں۔ ایک گرد نمودار ہوئی۔ قافلہ نظر آیا۔ کھڑے ہو کر پکاری:

"یَامَعْشَرَ الْمُسْلِمِیْنَ مَاتَ الْغَرِیْب..... الصَّلٰوۃ"۔

"اے مسلمانو! ایک غریب (مسافر) مر گیا ہے، نماز پڑھتے جاؤ"۔ مالک اشترؒ اس قافلے میں تھے۔ محبانِ اہلِ بیتؑ کا وہ قافلہ تھا۔ مالک اشتر نے فوراً پوچھا: کون غریب؟ کسے کہہ رہی ہو؟ بیٹی نے اشارہ میت کی طرف کیا اور کہا:

"یہ میت ابوذر غفاری کی ہے کہ جس کی غربت میں وفات ہوئی ہے"۔

بس یہ سننا تھا کہ تمام قافلے والے کود پڑے اپنے اپنے ناقوں سے اور جنابِ مالکِ اشتر نے جنابِ ابوذر غفاری کے جنازے کے پاس آ کر ہاتھ بلند کر کے کہا کہ اے مالک! تو گواہ رہنا محبانِ آلِ محمدؐ پر کیا گزر رہی ہے کہ آبادی سے دور جنگلوں میں انہیں موت آ رہی ہے اور جنگلوں

میں انہیں جلاوطن کیا جارہا ہے۔ مختصر یہ کہ قافلے والوں کے پاس پانی بھی تھا۔ غسل بھی ابوذر کو دیا گیا اور قیامت یہ ہے کہ جب کفن دینے کی باری آئی تو ہر شخص آگے بڑھتا تھا کہ کفن میں دوں گا۔ اتنا اصرار ہوا کہ اُن کے درمیان نزع پیدا ہوگئی اور جناب مالکِ اشترؒ نے فیصلہ کیا کہ کسی ایک کا کفن نہ ہو بلکہ کفن کی قیمت ہر ایک سے لی جائے تاکہ اس سعادت میں ہر ایک کا حصہ شامل ہو۔ اللہ اللہ! غربت اور میدان میں یوں کفن مل جاتے ہیں، یوں غسل ہو جاتے ہیں۔ اے کربلا کے غریب! تیرا کوئی نہلانے والا نہ تھا۔ تجھے کوئی کفن دینے والا نہ تھا۔ جب دفن ابوذر کا وقت آیا تو مالکِ اشترؒ نے یتیمہ کو پکار کر کہا کہ باپ کا آخری دیدار کرلو! اب بیٹی آخری بار باپ کا منہ دیکھنے آئی۔ منہ دیکھا اور خدا جانے کیسے پُر درد لہجے میں کہا کہ ہائے بابا! آپ نے مجھے جنگل میں چھوڑ دیا ۔یتیمہ کا اتنا کہنا تھا کہ مالکِ اشترؒ نے یتیمہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور ہاتھ رکھ کر کہا کہ اے بیٹی! آج سے میں تیرا کفیل ہوں۔ آج سے تو میری بیٹی ہے۔ یوں یتیموں کی نوازش ہو جاتی ہے۔ غریب کربلا کے یتیم! وہی وقت بار یتیمی کا تھا، وہی وقت طمانچوں کا تھا، وہی وقت تمہارے گھروں کے جلنے کا تھا، وہی وقت تمہارے پیشوا اور پدر بزرگوار کی لاش کے لٹنے کا تھا۔

الا لعنة اللّٰه علی القوم الظالمین۔

دوسری

مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ. اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ. اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ، یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ. نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ. یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ. (نور:۳۵)۔

حضرات! قرآن مجید میں مختلف ناموں سے سورتیں آئی ہیں۔ سورۂ انبیاء بھی ہے، سورۂ نوح بھی ہے، سورۂ یوسف بھی ہے، سورۂ ابراہیم بھی ہے، سورۂ لقمان بھی ہے اور سورۂ محمد بھی ہے۔ ان تمام برگزیدہ حضرات کے ناموں پر سورتیں قرآنِ مجید میں موجود ہیں۔ تھوڑی سی شکایت ہو جاتی ہے دل کو کہ جہاں ان ناموں کی سورتیں موجود ہیں، یہاں تک کہ سورۂ محمد بھی موجود ہے، وہاں کوئی سورۃ سورۂ آلِ محمد بھی ہوتا! ان کے نام سے بھی کوئی سورۃ موجود ہوتا۔ مگر جیسے ہی یہ خیال دل میں گزرتا ہے، خداوندِ عالم کا جواب گوشِ دل میں پہنچتا ہے کہ بے خبر! سورۂ آلِ محمدؐ ہے تو۔ تو نے غور نہیں کیا۔ جہاں سورۂ نوح ہے، جہاں سورۂ لقمان ہے، جہاں سورۂ انبیاء ہے، جہاں سورۂ یوسف ہے، جہاں سورۂ محمدؐ ہے، وہاں قرآن کی سورتوں میں ایک سورۂ نور بھی تو ہے۔ سورۂ نور بھی تو ہے، وہ نور آلِ محمدؐ ہی تو ہے۔ پھر ایک اور بات ذہن میں آتی ہے کہ خداوندِ عالم نے کلیہ بتا دیا ہے کہ:

''یَوْمَ نَدْعُوْا کُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِھِمْ''۔

''تمام لوگوں کو ہم یومِ حشر اُن کے امام کے ساتھ بلائیں گے''۔

جب لفظ ''کُلَّ اُنَاسٍ'' ہے تو کلیہ کہنا میرا صحیح تو ہے۔ کلیہ کل کے لفظ سے ہی تو بنتا ہے۔ یہ کلیہ ہے کہ انسانوں کے جس گروہ کو بلائیں گے، اُس کے امام کے ساتھ بلائیں گے اور یہ

انتظام بھی قدرت کا عجیب ہے کہ جب امام کے ساتھ بلائیں گے تو اس گروہ کی آمد اس صورت میں ہوگی کہ امام اس گروہ کا آگے آگے ہوگا اور وہ گروہ امام کے پیچھے پیچھے ہوگا۔ خداوند عالم گروہ کو نہیں دیکھے گا، امام کو دیکھے گا۔ امام کے ساتھ بلانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہمیں گروہوں سے بحث نہیں ہے، ہمیں تو امام کو دیکھنا ہے۔ اس گروہ کا امام کون ہے؟ اگر ہم ایک کا فیصلہ الگ الگ کرتے رہیں تو یہ قیامت کا دن قیامت ہی بن جائیگا۔ لہٰذا ہمیں تو امام کو دیکھ کر فیصلہ کرنا ہے، امام اگر جنتی ہے تو وہ گروہ بھی پھر جنتی ہے۔ امام اگر ناری ہے........ فیصلہ امام کی بناء پر ہوگا۔ ہر گروہ کو ہم اُس کے امام کیساتھ طلب کریں گے۔ اکثر حضرات میں نے یہ جملہ کہا ہے اور دل کی گہرائی سے نکلا کرتا ہے کہ خدا جانے کتنے لوگ ایسے ہوں گے کہ جو اپنی ذات سے جہنم کے لائق نہیں ہوں گے، اپنے خیالات سے جہنم کے لائق نہیں ہوں گے، زندگی انہوں نے بڑی احتیاط سے گزاری ہوگی، قدم پھونک پھونک کر رکھے ہوں گے، نمازیں پڑھی ہوں گی، روزے رکھے ہوں گے اور جہاں سب کچھ رکھا ہے داڑھی بھی رکھی ہوگی، حج بھی کیا ہوگا۔ جھوٹ سے بچے ہوں گے۔ خدا کا خوف دل میں ہوگا، یہ اپنی ذات سے تو جہنم کے لائق نہ ہوں گے مگر صورت حال یہ ہے کہ امام ہی اگر جہنمی کو بنا رکھا ہوگا تو وہ آگے آگے جو ہوگا تو اُس کا امام ماننا وہاں آگے آئیگا۔ یہ غریب اپنی وجہ سے جہنم میں نہیں جائیں گے، یہ امام کی بدولت جہنم میں جائیں گے۔ اس لحاظ سے مجھے یہ کہنے کا موقع ہے کہ کتنے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اپنی ذات سے جنت کے لائق نہیں ہوں گے مگر جائیں گے۔ اپنی وجہ سے نہیں جائیں گے جنت میں امام کی بدولت جائیں گے۔ کتنوں کو جنت ملے گی طفیل میں کسی کے۔ کتنوں کو جہنم ملے گی طفیل میں کسی کے۔ آیت سنئے گا:

''اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ کُفْرًا''۔

''دیکھتے ہو تم اُن لوگوں کو جنہوں نے اللہ کی نعمت کو کفر سے بدلا۔ ''بَدَّلُوْا'' کا لفظ انکار کیلئے نہیں آسکتا۔ یہ تو بتا رہا ہے کہ جو جگہ اللہ کی نعمت کی تھی اُس جگہ کفر کو بٹھایا ہے۔ گویا اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل دیا۔ کفر انسان کو بھی کہا جا سکتا ہے۔ کون سی وہ اللہ کی نعمت؟

''اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ''۔

''اُس نعمتِ خداوندی کو کفر سے بدلا جو جگہ اُس نعمت کی تھی وہاں کفر کو رکھ دیا''۔

''وَاَحَلُّوْ قَوْمَھُمْ دَارَلْبَوَارِ۔ جَھَنَّمَ یَصْلَوْنَھَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ''۔

''انہوں نے تو اپنی ساری قوم کو جہنمی بنادیا''۔

معلوم ہوا کہ قوم رکھنے والے ہیں یہ۔ انفرادی تذکرہ نہیں ہو رہا ہے۔

''یَصْلَوْنَھَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ''۔

''جانا پڑے گا اُن کو (جہنم میں) مگر بدترین قرار ہے''۔

دنیا میں تو قرار نہیں ملا ان کو قرار کی بناء پر۔ اب ہم تو قرار دیں گے جہنم میں۔ بھاگ کر کہاں جائیں گے۔ قرار کی جگہ تو وہی ہے ان کیلئے۔

خداوند عالم نے یہ کلیہ قرار دے دیا ہے کہ جو گروہ حشر کے دن آئے گا، وہ اسی شان سے آئیگا کہ امام آگے آگے ہوگا اور ماموم پیچھے پیچھے ہوں گے۔ ہم بغیر امام کے بلائیں گے ہی نہیں کسی کو، جس کو بھی بلائیں گے اُس کے امام کے ساتھ بلائیں گے۔ اُس کے امام سے مطلب یہ ہے جس کو اُس نے امام مانا ہو۔

قدرت یہ تقسیم قرآنِ کریم میں کر چکی ہے کہ امام دو قسم کے ہیں:

''جَعَلْنَامِنْھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّاصَبَرُوْ''۔

''کچھ ایسے امام ہیں امامت جن کو ہم نے دی ہے''۔

''یَھْدُوْنَ بِہٖ اَمْرِنَا''۔ ''وہ ہدایت کرتے''۔

''ہم نے حق کو امام قرار دیا وہ ہمارے امر کو لے کر ہدایت کرتے ہیں''۔ جب لفظِ امر بھی ہے آیت میں اور آئمہ بھی ہے تو یہ ثابت ہوا کہ آئمہ وہی ہیں جو اولی الامر ہیں اور اولی الامر ہی ہیں جو آئمہ ہیں۔ (صلوٰۃ)۔

جنابِ والا یہ کیسی اچھی شناخت مقرر کی ہے، نرالی شناخت ہے۔ ''لَمَّا صَبَرُوْ''

"صابر ہیں"!! یہ علامت ایسی ہے کہ الحمدللہ اس مشعل کو ہاتھ میں لیکر ہم بھٹک نہیں سکتے۔ امام ہم نے انہی کو مانا ہے، جو صابر ہیں۔

"یَهْدُوْنَ بِهٖ اَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا."

مقابلے میں فرمایا:

کچھ امام ایسے ہیں کہ ہم یہ طے کر چکے ہیں کہ وہ جہنم کا راستہ دکھاتے ہیں، وہ قوم کو جہنم میں لے جاتے ہیں، لے جاتے اس لئے ہیں کہ خود جاتے ہیں۔

امام دونوں قسم کے ہوں گے۔ دونوں قسم کے اُن کے ماننے والے اُن کے پیچھے پیچھے ہوں گے۔ ہم تو ہر گروہ کو اُس کے امام کے ساتھ بلائیں گے۔

خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

"بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ"۔ "اُس دن کیلئے مومنوں کیلئے خوشخبری ہو"۔

کس بات کی خوشخبری؟

"نُوْرُهُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ"۔ "اُن کے آگے آگے نور چل رہا ہوگا"۔

مومنین کو بشارت ہو کہ اُن کے آگے آگے نور ہوگا۔ پروردگارا! مومنین کیلئے تو نے اپنے کلیے کو توڑ دیا۔ سب کے آگے آگے تو امام ہوگا اور مومنین کو تو کہہ رہا ہے کہ اُن کے آگے آگے نور ہوگا۔ تو جواب ملتا ہے کہ تو نہیں سمجھا، مومنین کے آگے آگے بھی امام ہوگا مگر اُن کا امام ہی نور ہے۔ (صلوٰۃ)۔

ان معصوم ہستیوں کے صفات اور کمالات کی بناء پر خداوند عالم نے تشبیہات دی ہیں۔ کسی صفت کی بناء پر چراغ سے تشبیہ دی ہے۔ چراغ اُجالا کرتا ہے نا اور اجالا ہو جاتا ہے تو نشیب بھی نظر آنے لگتا ہے، فراز بھی نظر آنے لگتا ہے۔ خشکی بھی نظر آجاتی ہے، تری بھی نظر آجاتی ہے۔ سب چراغ کے سہارے ہی سے تو ہے۔ اب بات یہ آپ کے سامنے کی ہے کہ دنیا کے جو چراغ ہیں، یہ ہوں یا قدرتی چراغ ہوں، دنیا کے چراغ صرف دنیا ہی دنیا دکھا سکتے ہیں۔ اب ضرورت

ہمیں اس بات کی تھی کہ کس روشنی میں ہمیں حق حق نظر آسکے، باطل باطل نظر آسکے۔ صراط مستقیم نظر آئے، جنت کا راستہ نظر آئے اور ساتھ ساتھ جہنم کا راستہ بھی نظر آئے۔ نظر نہ آئیگا تو بچیں گے کیسے؟ جہنم کا راستہ بھی دیکھنا ہے، دیکھ کر ہی تو بچیں گے، جنت کا راستہ بھی دیکھنا ہے، دیکھ کر ہی تو چلیں گے۔ اب یہ بتائیے کہ ان راہوں کو اور ان حقیقتوں کو دنیا کے چراغ تو نہیں دکھا سکتے۔ اس لئے قدرت نے ان حقائق کو دکھانے کیلئے بھی چراغ بھیجے، روشنیاں بھیجیں اور بتایا کہ:

''سِرَاجاً مُّنِیْرًا''۔ ''میرا روشن کیا ہوا چراغ ہے''۔

اور پھر چراغ کے بعد چراغ۔ چراغ کا جانشین اندھیرا تو نہیں ہو سکتا۔ چراغ کا جانشین تو چراغ ہی ہوگا اور پھر اس میں بھی تسلسل قائم رکھنا پڑے گا۔ اگر ہزار کی پاور کا بلب جل رہا ہے اور زیرو کا لگا دیں اُس کی جگہ پر تو مجمع وحشت ناک ہو جائیگا۔ روشنی کے بعد روشنی ایسی آئے کہ مجمع بھیانک نہ ہو۔ اس لئے حضرات ہمارا اعتقادی مسئلہ ہے کہ نبیؐ کے بعد جانشین نبیؐ وہی ہو سکتا ہے جو اشبہ النبی ہو یعنی سب سے زیادہ نبیؐ سے ملتا جلتا ہو۔ مجھے ایک حدیث یاد آ گئی۔ حضرات حدیث کہوں یا حدث کہوں۔ میں نے ایک واقعہ دیکھا ہے۔ ''جمع الجوامع'' ایک کتاب ہے حدیث کی اُدھر۔

شاید میں اچھی طرح بیان نہ کر سکوں، جو کچھ میں کہہ دوں وہ آپ سن لیں، جو نہ کہوں وہ سمجھ لیں۔ جمع الجوامع میں ایک واقعہ آیا ہے کہ کوئی شخص ہے، اُس نے سرکارؐ دو عالم سے پوچھا ہے:

''ای الناس احب الیکم''۔ ''سرکارؐ یہ بتائیے کہ تمام انسانوں میں آپ کو سب سے پیارا کون ہے؟''

سرکارؐ نے کسی خاتون کا نام لیا۔ سوال تو یہ تھا کہ سب سے زیادہ آپ کو پیارا کون ہے؟ سرکارؐ نے کسی خاتون کا نام لیا تو میں نے عرض کیا: ''سرکارؐ! میں تو مردوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں''۔

''قَالَ فَاَبُوھَا''۔ ''آپؐ نے فرمایا: ''پھر اُن کے باپ''۔

''فای الناس احب الیک بعدہ''۔ ''اچھا پھر آپ کو زیادہ پیارا کون ہے؟''

سرکارِ دوعالم نے پھر ایک خاتون کا نام لے دیا تو میں نے عرض کیا: ''سرکارؐ! میں تو مردوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں''۔

''قَالَ فَاَبُوھَا''۔ ''آپؐ نے فرمایا: ''پھر اُن کے باپ''۔

اب وہ شخص بیان کرتا ہے کہ جب دو سوالوں کے چار جواب آچکے، دو پوچھنے والے اور دو بغیر پوچھے۔ میرے دل میں یہ خیال گزرا کہ علیؑ کیلئے کیا موقعہ رہ گیا۔ چار ناموں تک تو اُن کا نام آیا نہیں، اب اگر میرے پوچھنے پر اُنکا نام آ بھی جائے تو کیا بات رہ گئی۔ تو میں نے عرض کیا:

''فَمَا لِعَلِیٍّ''۔ ''تو پھر آپ کی علیؑ سے خصوصیت کیا رہی؟''

عجیب سے ہی سوال و جواب ہیں۔ مگر ہمیں تو نچوڑ دیکھنا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ میرے اس کہنے پر حضورؐ غضبناک ہوئے اور میری طرف سے منہ پھیر لیا۔ دوسرے کی طرف منہ کر کے فرمایا:

''مالھذا لرجل یسئلنی عن نفسی''۔

''کیا ہو گیا ہے اس شخص کو اب یہ میرے نفس کے بارے میں پوچھ رہا ہے؟''

بہر حال علیؑ کا نفسِ رسولؐ ہونا سرکار ہی کا قول نہیں بلکہ پروردگار کا قول ہے نفسِ رسولؐ تو ہیں: ''اَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ''۔

''مَالِھٰذَا لرَّجُلْ''۔ یہ بڑا حقارت آمیز لہجہ ہے۔ کہنا یہ ہے کہ ہر گروہ کی طلب اُس کے امام کے ساتھ ہے۔ مگر مومنین کو خوشخبری دی جا رہی ہے یہ کہہ کر کہ اُن کے آگے آگے نور ہوگا۔ حضرات! بحمد للہ ہم نے نور سے کم کو تو امام مانا ہی نہیں۔ ہم تو خاکی ہیں اگر امام بھی خاکی ہو تو کیا خاک ہمارے کام آئے گا؟ امام ہم سے افضل و اعلیٰ تو ہو!! حضرات ایک کلمہ حقیقت آپ سے کہنا چاہتا ہوں! شاید مجھے الفاظ کافی نہ مل سکیں اس مفہوم کے بیان کرنے کیلئے۔ امام پوری امت کا امام ہے۔ اس امت میں بے مثل علم رکھنے والے بھی ہیں، شاعر بے بدل بھی ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ

فرزدق نے کھڑے کھڑے فی البدیہہ قصیدہ کہہ دیا کہ عربی زبان میں شاہکار ہے، امام اس کا بھی امام ہے، فقیہہ کا بھی امام ہے، ادیب وسخنور کا بھی امام ہے، سب موجودات کا، فلسفہ وحکمت کا بھی امام ہے، تو اگر امام کسی شعبے میں ماموم سے کم ہو تو ماموم کو یہ سمجھنا پڑے گا کہ اس فن میں میں امام سے بہتر ہوں۔ جتنے بھی علوم ہیں اس دنیا میں، اگر کسی بھی علم میں امام کم ہوگا ماموم سے تو ماموم کو یہ کہنے کا موقع تو ملے گا کہ بھئی اس فن کا ماہر میں ہوں۔ اس فن میں امام مجھ سے کم ہیں۔ پس جب کمی کا احساس پیدا ہوگا تو امام نہ رہا۔ ہم ایسا جامع امام چاہتے ہیں جس کی نظر کبھی خم نہ ہو، کسی فن میں وہ پست نہ ہو، جب بھی کوئی مسئلہ کسی قسم کا آ جائے، وہ اس مسئلہ کی حقیقت کا جاننے والا ہو۔ کلام اُس کا ایسا کہ دنیا کا کوئی متکلم ایسا کلام نہ کر سکے۔ حرب وضرب اُس کی ایسی کہ اُس جیسا کوئی شجاع نہ ہو۔ دروازے پر آنے والوں کیلئے اُس سے زیادہ کوئی سخی نہ ہو۔ مسائلِ شریعت میں بڑے بڑوں کا اُستاد ہو۔

بڑی توجہ سے سننے کے لائق ہے، بڑا سادہ جملہ ہے مگر پوری ایک کتاب ہے۔ کسی شخص نے حضرت عبداللہ ابن عباس سے یہ سوال کیا کہ فرق بتایئے اصحاب میں اور علیؑ میں۔ سوال بہت سادہ ہے اور جواب بھی بہت سادہ مگر اتنا معنی خیز کہ جتنا آپ راتوں کو سوچیں، اُتنا ہی آپ کا ایمان بڑھتا چلا جائے۔ جواب دیتے ہیں کہ:

''اصحاب کو بار بار علیؑ سے پوچھنا پڑا، علیؑ نے کبھی کسی سے نہیں پوچھا''۔

اس لئے حضرات کہ یہ وہ چراغ ہے جس کی روشنی میں حق حق نظر آتا ہے، عرش عرش نظر آتا ہے، فرش فرش نظر آتا ہے۔ خدا کی قسم! چراغ بذاتِ خود معصوم چیز ہے۔ زبانیں ہیر پھیر کر جاتی ہیں مگر چراغ ایسی معصوم صفت شے ہے جو جیسا ہوتا ہے، بالکل بغیر کسی مبالغے کے ویسا ہی دکھاتا ہے۔ معصوم چیز ہے چراغ خطا نہیں کرتا اور امامت کا چراغ وہ چراغ ہے جو حق کو حق اور باطل کو باطل دکھاتا ہے۔ چراغ خود بھی حق ہے اور اس کا بھیجنے والا بھی حق ہے۔ مجھے یہ جملہ کہنا ہے حضرات کہ جو حق ہوتا ہے اُس کا ساتھ حق ہی دیتا ہے۔ حق کا ساتھ حق دیگا۔ باطل سے یہ امید کہ وہ

حق کا ساتھ دے، اگر وہ حق کا ساتھ دیگا تو پھر وہ باطل نہ رہا۔ وہ باطل ہوا ہی حق کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے ہے۔ باطل کبھی حق کا ساتھ نہیں دے گا اور حق کبھی حق کا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ علیؑ حق تو قرآن بھی حق۔ قرآن علیؑ کا ساتھ دے گا، علیؑ قرآن کا ساتھ دیگا۔ علیؑ حق ہیں تو نبیؐ بھی حق۔ نبیؐ علیؑ کے ساتھ ہیں، علیؑ نبیؐ کے ساتھ۔ علیؑ حق ہیں، خدا بھی حق ہے۔ خدا علیؑ کے ساتھ، علیؑ خدا کے ساتھ۔ جو بھی حق ہے وہ حق کا ساتھ دیتا رہے گا۔ جو باطل ہے وہ ہمیشہ باطل کا ساتھ دیگا۔ حق کی مخالفت کرنا باطل کا حصہ ہے۔ حضرات یہ علیؑ وہ چراغ ہیں کہ اُجالا کر دیا اس چراغ نے۔ یہ سورج کی کرنیں لاکھ زوردار ہوں مگر سورج کی کوئی شعاع آپ کے دل کی گہرائی تک نہیں جا سکتی۔ یہ ذکر اُس چراغ کا ہے جس کی شعاعیں مومن کے دل کی گہرائیوں میں اترتی ہیں۔ دلوں کو روشن کر دیا، راہِ حق کو روشن کر دیا۔ قدرت نے اُجالا کرنے میں ان کو تشبیہ چراغ سے دی۔ نجات دینے میں تشبیہ کشتی سے دی۔ صفات کی بناء پر یہ تشبیہ ہو رہی ہے۔ نجات دہندہ ہیں یہ، ذریعۂ نجات ہیں، اس لئے تشبیہ کشتی سے دی جا رہی ہے۔ جود و کرم میں فیض جاری ہیں۔ اس لئے دریا سے تشبیہ دی۔

"مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ"۔

خدا کی نظر میں قیمت ان کی بیش سے بیش تر ہے۔ اس لئے لولو و مرجان سے تشبیہ۔ یہ سب تشبیہات چل رہی ہیں اور واقعات کی بناء پر نبیؐ کو موسیٰ سے تشبیہ دی، ولی کو ہارون سے تشبیہ دی۔ اب اس گہرائی میں جو کچھ بھی ہیں، میں اُس میں نہیں جانا چاہتا۔ صفات انبیاء کے جو الگ الگ تھے، کسی میں کچھ تھا، کسی میں کچھ تھا۔ نبیؐ اور علیؑ میں سب کچھ جمع کر دیا۔ اب تشبیہ اُن کی آدم سے بھی ہے۔ نوح سے بھی، اسرائیل سے بھی، یوسف و موسیٰ سے بھی، عیسیٰ سے بھی ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں، تیار رہیے گا سننے کو، چنانچہ یہ تو آپ نے سنا ہے نا کہ:

متفق علیہ حدیث ہے کہ جو یہ چاہے کہ آدم کے علم کو دیکھے، اور نوح کے فہم کو دیکھے، ابراہیم کی خلت کو دیکھے، یعقوب کے صبر کو دیکھے، یوسف کے حسن کو دیکھے، موسیٰ کی ہیبت کو دیکھے،

عیسیٰ کے زہد کو دیکھے، وہ کیوں ہر ایک کو دیکھے؟ بس ایک کو دیکھے۔ وہ ایک جو خدا کی خدائی میں ایک ہے۔ اُس ایک کے سوا خدا کے گھر میں کوئی پیدا ہی نہیں ہوا چاہے کوئی نبی ہو یا ولی۔

''فلینظر الی وجهه علی ابن ابیطالب''۔

جو ان سب کو دیکھنا چاہے، ان سب کی صفات کو دیکھنا چاہے، وہ علیؑ کے چہرے کو دیکھے۔ علیؑ کے چہرے میں آدم کا علم بھی نظر آجائیگا، نوح کا فہم بھی نظر آجائیگا، خلتِ خلیل اور صبرِ یعقوب بھی نظر آجائے گا، جمالِ یوسف اور ہیبتِ موسیٰ نظر آئے گی، زہدِ عیسیٰ بھی نظر آجائیگا۔ دیکھنے والے کو تمام صفاتِ انبیاء نظر آجائیں گی۔ علیؑ کا ایک چہرہ آئینۂ صفاتِ انبیاء ہے۔ اگر میرا مجمع بڑی نکتہ رسی سے کام لینے کا وعدہ کرے، میں ہر چیز پر وعدہ نہیں لیتا، یہاں وعدہ لینے کا مجھے حق ہے۔

اگر سرکارؐ دو عالم نے فرمایا ہوتا کہ جو آدم کے علم کو دیکھنا چاہے، وہ علیؑ کے علم کو دیکھے، جو نوح کے فہم کو دیکھنا چاہے وہ علیؑ کے فہم کو دیکھے۔ زہدِ عیسیٰ کو دیکھنا چاہے تو علیؑ کے زہد کو دیکھے، کمال کی بات تو یہ ہو رہی ہے کہ وہاں ہے ذکر صفات کا، یہاں ہے ذکر چہرے کا۔ اگر وہاں ذکر ہوتا چہرے کا، یہاں بھی چہرہ ہوتا، وہاں صفات ہوتیں، یہاں بھی صفات کا ذکر ہوتا۔ مگر خدا جانے کیا ہو رہا ہے کہ وہاں تو ذکر ہے صفات کا، انبیاء کی جو صفات دیکھنا چاہے وہ علیؑ کا چہرہ دیکھ لے۔ جناب چہرے میں صفات نہیں ہوتیں، صفات روح میں ہوتی ہیں۔ چہرے پر ایک جھلک ہوتی ہے۔ وہاں صفات بتا رہے ہیں سرکارؐ انبیاء کی، یہاں علیؑ کے چہرے کی ایک جھلک دکھا رہے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان انبیاء کی تمام صفات ایک جھلک ہیں علیؑ کے چہرے کی۔ جس کے چہرے کی ایک جھلک حاملِ صفاتِ انبیاء ہو، اُن کی صفات کتنی ہوں گی، کیسی ہوں گی؟

''كُلُّ شَيْءٍ اَحْصَيْنَاهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ''۔

اس لئے کہہ رہا ہوں علیؑ جیسا علم نہیں مل سکتا، اُن جیسا فہم نہیں مل سکتا، اُن جیسا صبر نہیں مل سکتا، اُن جیسی صولت نہیں مل سکتی، اُن جیسا زہد نہیں مل سکتا۔ زہد ہو کسی کا، ہیبت ہو کسی کی، خلت

ہو کسی کی، علم ہو کسی کا، وہ تو اُن کے چہرۂ تاباں کی ایک جھلک ہے۔

کیا کہنا اُس چہرے کا، اس لئے تو فرمایا کہ اُن کے چہرے کو دیکھ لینا بھی عبادت ہے۔

اب میں ایک رخ اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہ خدا کی دین ہے کہ جہاں قدرت نے ان تمام انبیاء سابقین کے کمالات بدرجۂ اکمل جمع کر دیئے۔ جب یہ تمام کمالات آگئے تو اُن کل کمالات کے ساتھ کوئی آدم کا بھی دشمن تھا، کوئی نوح کا دشمن تھا، کوئی نوح کی دشمن تھی، کچھ موسیٰ کے دشمن، کچھ ابراہیم کے دشمن، کچھ عیسیٰ کے دشمن تھے۔ جہاں اُن کے کمالات ان میں سمائے، وہاں اُن سب کے دشمنوں کا رخ بھی ان کی طرف ہوا۔ اس بناء پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خدا کی قسم! عالم میں کسی سے ایسی دشمنی مجموعی طور پر نہیں ہوئی جیسی آلِ محمدؐ سے ہوئی۔ اب جناب یہاں اس بارگاہِ آخری میں کوئی آدم والا ابلیس بن کر آگیا۔ کچھ سنگدل نوح کے دشمن بن کر، ان کے دشمن ہو کر آئے، کوئی زوجۂ نوح کی مثال بن گئی۔

شاید میں کھل کر بیان نہ کر سکوں، کچھ مجبوریوں کی بناء پر۔ کہنا یہ چاہتا ہوں، عجیب بات ہے سورہ تحریم میں دو عورتوں کی مثال ہے، حضرت نوح کی بیوی اور حضرت لوط کی بیوی۔ یہ دونوں عورتیں ہمارے دو نیک بندوں کی زوجیت میں تھیں۔ لیکن دونوں خائنہ تھیں۔

اور اُس کے بعد کیا بے نیازی ہے قدرت کی، کسی بھی رو رعایت کی مستحق نہیں، ان دونوں کا زوجۂ نبی ہونا رتی برابر بھی تو اُن کے کام نہیں آسکا"۔ اللہ کے مقابلے میں اُن کا زوجۂ نبی ہونا کچھ بھی تو کام نہیں آسکا۔ ہر ایک کا فیصلہ وہاں جا کر ہوگا کہ جہنمی ہیں یا جنتی ہیں۔ لیکن یہاں فیصلۂ آخر سنا دیا گیا:

"کہہ دیا کہ جاؤ جہنم میں"۔

غرض کہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جہاں ان میں صفاتِ انبیاء ہیں وہاں انبیاء کے دشمنوں کا ہجوم بھی تو ساتھ ہے۔

"عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ"۔ "انبیاء کے ساتھ جو جو مجرم تھے"۔

اب موسیٰ والا فرعون بھی آ گیا۔ کوئی عیسیٰ والا، غرضیکہ تمام انبیاء کی صفات بھی ان کی طرف منتقل ہوئیں اور تمام انبیاء کے دشمنوں کی یورش بھی ہو گئی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ جیسی اذیت انہیں پہنچائی گئی اور جیسی دشمنی ان سے کی گئی، خدا کی مخلوق میں بڑے سے بڑے پیغمبر پر آپ کی نظر ہو گی، ایسا ظلم کسی پر نہیں کیا گیا اور میرا یہ جملہ شاید برمحل ہو اور یاد رکھنے کے لائق ہو کہ انبیاء و مرسلین پر اگر ظلم کیا ہے تو نہ ماننے والوں نے کیا ہے۔ ان پر ظلم و ستم ماننے والوں نے کیا ہے اور اسی کی دہائی ہوتی ہے۔ مجھے ثانیِ زہرہ کا وہ جملہ یاد آتا ہے کہ خیمے سے باہر نکلی ہوئی ہیں اور خدا جانے کیسی بیقراری کا عالم ہے کہ آپ پکار کر کہتی ہیں:

''یا اھل الکوفۃ و الشام اما فیکم مسلم؟''

''اے کوفہ و شام کے رہنے والو! کیا تم میں کوئی بھی مسلمان نہیں''۔ اور پھر سردارِ لشکر کو پکارتی ہیں:

''یا ابن سعد! اتقتل ابن رسول اللہ و انت تنظر''۔

''اے پسر سعد! فرزندِ رسول قتل ہو رہا ہے اور تو دیکھ رہا ہے؟''

کیا حسرتناک کلمات ہیں۔ جب کسی طرف سے بھی کوئی جواب نہ آیا تو آخر میں بہن نے بھائی کو پکارا:

''اے میرے ماں جائے! دیر سے تیری آواز نہیں سنی۔ اے لاوارثوں کے وارث! دیر سے تیری آواز نہیں سنی۔ اے بے سہاروں کے سہارے! ایک مرتبہ اپنی آواز تو مجھے سنا دے۔ تیرے سوا ہمارا کون رہ گیا ہے! اے بے پناہوں کی پناہ! میرے ماں باپ کی نشانی''۔ اتنا پکارا اور حالت مظلوم کی یہ ہے کہ پوری آنکھ کھلتی نہیں، چشمِ نیم وا سے حسرت کی نظر سے بہن کو دیکھ رہے ہیں کہ بہن کا اصرار حد سے بڑھ گیا۔ امامؑ نے ارشاد فرمایا:

''یَا اُخْتِیْ زینب لَقَدْ زِدْتِنِیْ کَرْباً علیٰ کَرْبِیْ''۔

''اے میری پیاری بہن زینب! تیری فریاد نے میرے کرب کو اور بڑھا دیا''۔

''اے بہن! تجھے خدا کی قسم بس اب خاموش ہو جا!''

اب بہن کو قسم دی ہے امامؑ نے، خاموش ہونا پڑا۔ مگر ایک نظر پھرا کر جو دیکھتی ہیں، یہ دیکھتی ہیں کہ فاطمہ زہرؑا کا چراغ بجھ گیا اور سر ہے جو نوک نیزہ پر پہنچ گیا۔ سر و سینہ پیٹا اور عجب حسرت سے یہ جملہ کہا۔ بات یہ ہے کہ قتل کے بعد نیزے پر رکھنے سے پہلے کوئی وقفہ نہیں دیا گیا۔ حالت یہ تھی کہ خون کے قطرے نیزے میں سے گر رہے تھے۔ ریش انور پر آ رہے تھے۔ بہن نے خون کے قطروں کو نیزے کی بلندی سے جو دیکھا تو یہ کہا:

''میرے ماں باپ قربان ہو جائیں اس داڑھی پر جس سے خون کے قطرے زمین پر گر رہے ہیں۔ فاطمہؑ کے چاند! تجھے کتنی جلدی گہن لگ گیا۔ اگر تو بیمار ہوتا تو مجھے اچھا ہونے کی امید ہوتی۔ اگر تو سفر پر گیا ہوتا تو بہن کو واپسی کی امید ہوتی۔ اگر زخمی ہوتا تو تیرے زخموں کے اچھا ہونے کی دعا کرتی۔ اے فاطمہؑ کے چاند! تو چھپ گیا، یہ کیسا گہن لگا کہ تو اس گہن سے نکلے گا ہی نہیں!''

اور اس کے بعد کیا کرتی ہیں ثانیِ زہرؑا! ذرا سینوں پر ہاتھ رکھ کر سنیے گا کہ جو یتیم ہو گیا ہے اُس کو کیسے خبر کروں۔ جس کا سر نیزے پر ہے، اُس کے وارث کو کیسے خبر کروں۔ کس منہ سے کہوں کہ بیٹا تیرا باپ شہید ہو گیا۔ مگر خبر کرنا ضروری ہے۔ خیمے میں آئیں اور بھتیجے کے پاس آ کر کہا۔ بیٹا! میں ایک سر نیزے پر دیکھ رہی ہوں جو خاک و خون میں آلودہ ہے، پہچانتی نہیں ہوں کہ کس کا سر ہے۔ دیکھو مجھے بتاؤ یہ کس کا سر ہے؟ امام زین العابدینؑ نے ارشاد فرمایا: پھوپھی اماں! ذرا خیمے کا پردہ اٹھائیے۔ جناب زینبؑ نے خیمے کا پردہ اٹھایا۔ سر نکال کر بیمار کربلا نے نیزے کے سر کو دیکھا اور دیکھتے ہی انگشت شہادت اٹھائی:

''السلامُ علیکَ یا اَباعبداللّٰہ''۔ ''السلامُ علیکَ یَابْنَ رسول اللّٰہ''۔

قیامت گزر گئی ہے حضرات! اس شہید کی لاش پر ایک طرف، اور سر پر ایک طرف۔

الا لعنة اللّٰہ علی القوم الظالمین۔

تیسری

مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ مَثَلُ نُوۡرِہٖ کَمِشۡکٰوۃٍ فِیۡہَا مِصۡبَاحٌ ؕ اَلۡمِصۡبَاحُ فِیۡ زُجَاجَۃٍ ؕ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّہَا کَوۡکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوۡقَدُ مِنۡ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیۡتُوۡنَۃٍ لَّا شَرۡقِیَّۃٍ وَّلَا غَرۡبِیَّۃٍ ۙ یَّکَادُ زَیۡتُہَا یُضِیۡٓءُ وَلَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡہُ نَارٌ ؕ نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ ؕ یَہۡدِی اللّٰہُ لِنُوۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ۔(نور:۳۵)۔

حضرات! میری ان تقریروں کیلئے موضوع تھا حقیقت اولی الامر۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حقیقت اولی الامر بیان میں آ نہیں سکتی، اس لئے میں اب تک یہی سناتا رہا کہ اولی الامر کی حقیقت خاک نہیں ہے، نور ہے۔ نور بھی نورٌ علیٰ نور، اس اعتبار سے کہ خداوند عالم تو کسی خاک کو بھی اپنا کہہ دے تو قبلۂ انام ہے وہ۔ وہ اجزائے ارضی ہی تو ہے، وہ اجزائے خاکی ہی تو ہے کہ جن کے مجموعے سے گھر بنا اور قدرت نے اُسے اپنا کہہ دیا۔ خاک کو بھی اگر وہ خداوند عالم اپنا کہہ دے تو وہ قبلۂ عالم ہے۔ چہ جائیکہ وہ کسی کو نور کہے اور پھر نورٌ علیٰ نور یہ کہ اپنا نور کہے۔ اپنی ذات سے نسبت دیکر اس نور کو اپنا کہے۔

غرضیکہ لفظِ حقیقت کی بناء پر میں اُس کی اوّلیت کو، نورانیت کو بیان کرتا رہا۔ حقیقتاً آیۂ اولی الامر پڑھے بغیر اپنے موضوع ہی کے بارے میں میں کہتا رہا۔ یہ بات دوسری ہے کہ اولی الامر کے بیان کے سلسلہ میں میں نے دوسرے امر کا بھی ذکر کیا۔ یا یوں کہوں کہ ہر امر کا ذکر آتا رہا۔ اس لئے کہ خداوند عالم نے بھی آیۂ نور میں جہاں نور کا ذکر کیا ہے، وہاں "لم تمسسہ نار" کہہ کر نور کیساتھ نار کا بھی ذکر کر دیا۔ ہمیشہ چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ اتنی طاقت تو ہم میں کہاں کہ ہم انہیں دیکھ کر، نور کو دیکھ کر نور کو پہچان سکیں مگر کم سے کم یہ آسان کام ہے کہ ہم نار کو دیکھ کر نور کو پہچان لیں۔ ٹھیک کہا ہے کسی کہنے والے نے کہ نار اور نور میں پانچ ہی کا تو فرق ہے۔ نار کے

عدد ۲۵۱ ہیں اور نور کے عدد ۲۵۶ ہیں ۔ پانچ ہی کا تو فرق رہا، ۵ کم ہیں عدد نار میں اور پانچ زائد ہیں عدد نور میں ۔ ثابت ہوتا ہے کہ جدھر پانچ ہیں ادھر نور ہے ۔ جہاں پانچ کی کمی ہے وہاں نار ہے ۔

حضراتِ والا! بالکل بے تامل ایک جملہ کہوں گا، آخرت میں دو مرحلے درپیش ہیں، صراطِ حشر سے گزرنا ہے اور یہ صراطِ حشر وہ پل ہے جو جہنم پر قائم ہوگا ۔ یوں سمجھئے کہ جہنم پر سے گزرنا ہے ۔ پہلے کوئی گزر تو جائے، تب کہیں جنت کا دروازہ دیکھے گا ۔ پہلی مہم تو یہ ہے کہ جہنم چھوڑ دیں، پہلے جہنم سے تو بچ جائیں ۔ خداوندِ عالم طے کر چکا ہے کہ:

"اِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا کَانَ عَلٰی رَبِّکَ حَتْمًا مَّقْضِیًّا"

"کوئی تم میں سے نہ ہوگا مگر اس کو جہنم کے اوپر جو پل ہے، اُس پر سے گزرنا ضرور پڑے گا، کوئی ایسا نہ ہوگا جو اِس سے مستثنیٰ ہو ۔ تمہارے رب نے اپنے اوپر حتمی قرار دے لیا ہے اور یہ بات طے شدہ ہے کہ ہر ایک کو بالائے جہنم سے گزرنا ہوگا" ۔

"فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّۃَ فَقَدْ فَازَ"

"کامیاب تو وہ ہوگا جو جہنم سے بچ جائے گا اور جنت میں داخل کر دیا جائیگا" ۔

حضرات! آخرت کے بارے میں ہمارے لئے دو مہم ہیں ۔ ایک یہ کہ پہلے ہم جہنم سے بچیں، ایسا نہ ہو کہ اپنا حق سمجھ کر جہنم ہمیں کھینچ لے کہ یہ تو میرا مال ہے جو گزر رہا ہے، میں کیوں گزرنے دوں ۔ پہلے جہنم سے بچنا ہے پھر جنت کا مرحلہ ہے کہ جنت میں داخل ہونے کے لائق ہو ۔ جب دو مرحلے ہیں تو ہمارے پاس دو قسم کا سرمایہ ہونا چاہئے ۔ ایک وہ سرمایہ ہو جو ہمیں جہنم سے بچائے اور ایک وہ سرمایہ ہمارے پاس ہو جو جنت میں لے جائے ۔ جہنم سے بچنا ہے، جنت میں داخل ہونا ہے ۔ پہلے تو وہ چیز درکار ہے جنت کے مقابلے میں بھی جو جہنم سے بچادے ۔ پھر وہ چیز چاہئے جو جنت تک پہنچادے ۔ جس طرح دو چیزوں کی ضرورت ہے، اُسی طرح سے ہمارے ایمان کے بھی دو جزو ہیں ۔ وہ تبریٰ ہے جو جہنم سے بچائے ۔ اعدائے آلِ محمدؐ سے بیزاری جہنم سے

بچانے والی ہے اور ان حضراتؑ کی محبت ہے جو جنت میں پہنچانے والی ہے۔ چونکہ جنت ہے اُس پل سے گزر جانے کے بعد تو پہلی مہم تو جہنم سے بچنے کی ہے، لہٰذا تبرّیٰ مقدم ہے تولّی سے۔ یہ کہنے میں حضرات مجھے کوئی ڈر نہیں ہے، اطمینان سے کہنا چاہتا ہوں کہ جہنم بھی لکھ چکی ہے اور جنت بھی لکھ چکی ہے۔ کچھ ہیں ایسے جنہوں نے جنت خرید رکھی ہے اور کچھ ہیں ایسے جنہوں نے جہنم کا مول ادا کر دیا ہے۔ جنت جنہوں نے خریدی ہے جنت اُن کی ہے، جہنم کا جنہوں نے مول ادا کر دیا، جہنم اُن کی ہے۔ تو جن کے جہنم سے بچنا ہے پہلے اُن سے تو بچو۔ جن کی جنت میں پہنچنا ہے، اُن کے تو ہنو۔

بحمدُ للہ ہمارے پاس جہنم سے بچنے کا بھی سرمایہ ہے اور جنت میں داخل ہونے کا بھی سرمایہ ہے۔ شاید میں اس لفظ کے کہنے میں حق بجانب ہوں، حقِ ولائے آلِ محمد کا ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اہلِ بیتِ رسولؐ، آپؑ کی محبت کا جو حق ہے، ہماری بساط کیا ہے کہ آپؑ کی محبت کا حق ادا کر سکیں۔ یہ حق نہ ہم سے ادا ہو سکا ہے اور نہ ادا ہو سکتا ہے۔ ہم اس محبت پر نازاں نہیں ہیں مگر ناز ہمیں اس پر ہے کہ دشمنانِ آلِ محمدؐ کے حق کے ادا کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ زیارتِ روزِ عاشورا میں خاص طور پر یہ لفظ آتا ہے کہ بارِ الٰہا جو سوال میں تجھ سے کر رہا ہوں اور جو بات میں اپنی تجھ سے منوانا چاہ رہا ہوں، میرا ہے کچھ حق تجھ پر کہ جس حق کی بناء پر سائل ہوں میں تیری بارگاہ میں اپنی مرادوں کے حاصل کرنے کیلئے اور سب سے بڑا جو میرا حق ہے وہ "بِـــا لْبَرائَۃِ مِنْ اَعْدَاءِ آلِ محمد" کہ "اعداءِ آلِ محمدؐ سے ہم بیزار ہیں، اس بیزاری کے صلہ میں مانگ رہے ہیں ہم"۔

نار سے بچ جانا ناریوں سے بیزاری پر منحصر ہے۔ جنت میں پہنچ جانا خریدارانِ جنت سے محبت پر منحصر ہے۔ ان سے ہمیں نفرت ہے، ان حضراتؑ سے ہمیں محبت ہے۔ بس ہمارے پاس یہ دونوں سرمائے موجود ہیں۔ اسی لئے ہم صلوٰۃ بھی پڑھتے ہیں اور صلواتیں سناتے بھی ہیں۔ حقیقت اولی الامر کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے مگر ایک بیماری تھی جو شروع ہو چکی تھی ابلیس

کے دم سے کہ اُس نے بدن کو دیکھ کر، جسم کو دیکھ کر یہ طے کرنا شروع کر دیا کہ کون کم ہے اور کون زیادہ ہے، کون برابر ہے اور کون بہتر ہے لیکن کم بخت نے اصل شے کو نہ دیکھا۔ خداوند عالم کے حکم میں یہ لفظ موجود ہے کہ:

"اِذَا نَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ"

"جب میں جسدِ آدم میں اپنی روح داخل کر دوں"، جس طرح ان کے نور کو قدرت نے یہاں اپنا نور کہا ہے، اُسی طرح روحِ آدم کو بھی قدرت نے روحی کہہ کر اپنی روح کہا ہے اور یہ اعزاز کا اور تعظیم کا اللہ کے یہاں سے ایک بہترین عنوان ہے کہ جب بھی وہ کسی شے کو معراج دینا چاہتا ہے تو اُسے اپنا کہہ دیتا ہے، اور جب اپنا کہہ دیا تو اُس سے زیادہ اُسے بلندی کی ضرورت ہی کیا رہ گئی۔ روحِ آدم کو روحی کہا۔ ان حضرات کے نور کو نورہ کہا "میرا نور"۔ بتایا جا چکا تھا کہ جب میں اپنی روح جسمِ آدم میں داخل کر دوں تو فوراً سجدہ کرنے میں گھنٹہ دو گھنٹہ کی بھی تاخیر نہ ہو۔ میرے خیال میں وہ سجدہ جو کروایا جا رہا ہے خلیفۃ اللہ کو، وہ سجدہ اصل میں عنوانِ بیعت ہے۔ جس نے سجدہ کر لیا اُس نے بیعت کر لی۔ جس نے سجدہ نہ کیا، اُس نے بیعت سے انکار کر دیا۔ چنانچہ خداوند عالم نے حکم میں وہ لفظ شامل کر دیا تھا کہ جب اپنی روح میں داخل کر چکوں تو فوراً سجدہ کرنا۔ اس لفظ سے فوراً ظاہر ہو گیا کہ قدرت جسدِ آدم کو مسجود نہیں قرار دے رہی ہے بلکہ روحِ آدم کو قرار دے رہی ہے۔ شرفِ مسجودیت بدن کو نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ روح کو دیا جا رہا ہے۔ بات تو جب تھی کہ ابلیس روح کا مقابلہ روح سے کرتا۔ اُس روح کو تو اُس نے دیکھا نہیں جس کو حقدار سجدہ قدرت نے قرار دیا اور جس روح کو بناءِ سجدہ قرار دیا۔ بدن کا مقابلہ کر رہا ہے حالانکہ خداوند عالم نے جسم کو تو سجدہ نہیں کروایا۔

جہاں اس آیت میں سجدہ کرنے کا حکم ہے وہاں اسی آیت میں سجدہ نہ کرنے کا بھی حکم ہے۔ نفی اور اثبات دونوں پائے جا رہے ہیں۔ جب قید لگا دی کہ جب روح داخل کر دوں، فوراً سجدہ کرنا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک روح داخل نہ ہو، خبردار سجدہ نہ کرنا۔ میں جسدِ بے روح

کو سجدہ کروا کے بت پرستی کی بنیاد نہیں ڈالنا چاہتا لیکن ہاں جب میری روح داخل ہو جائے، فوراً سجدہ کرنا۔

اب ابلیس میں یہ دم تو تھا نہیں کہ وہ روح سے تقابل کرتا کیونکہ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ جیسی روح، ویسے ہی فرشتے۔ بدن سے مقابلہ کیا، اس کو تو نے مٹی سے بنایا ہے، مجھے تو نے آگ سے بنایا ہے۔ اصل میں اُس نے بنیاد قائم کر دی جو آج تک بھی قائم ہے کہ لوگ جسمِ ظاہر کو دیکھتے لیکن حقیقتِ وجود کو نہیں دیکھتے۔

حقیقتِ وجود تو نور ہے۔ حضرات! لباس اور چیز ہے، ملبوس اور چیز ہے۔ کسی کے لباس کو دیکھ کر اُسے کم اور بیش قرار دے دینا بالکل غلط ہے۔ لباسِ شاہ و گدا بعض اوقات ایک سے بھی ہو سکتے ہیں۔ عالم اور جاہل کے، کافر اور مومن کے لباس ایک سے بھی ہو سکتے ہیں۔ یکساں لباس کا ہونا دلیلِ یکسانی نہیں ہے۔ ہاں ملبوس کو دیکھو، جس کا لباس ہے۔ بدن تو دراصل روح کا لباس ہے۔ جس طرح یہ کپڑے بدن کا لباس ہیں، اُسی طرح یہ بدن روح کا لباس ہے۔ کسی روح کو قدرت نے اُس لباس میں رکھ کر بھیجا، کسی نور کو قدرت نے اِس لباس میں رکھ کر بھیجا۔ لباس کو دیکھ کر کم یا بیش قرار دینا کتنی نالائقی ہے، اصل شے تو وہ وجود ہے جس کو یہ پہنایا گیا۔ چنانچہ لباس، ایک آیت میں آتا ہے، بڑی لطیف آیت ہے قرآنِ کریم کی، فرمایا جاتا ہے:

"وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِىْ فِى الْاَسْوَاقِ"

"اور کفار کہتے ہیں یہ رسول کیسے ہو سکتا ہے جو کھانا کھاتا ہو، بازار میں چل پھر بھی لیتا ہو، ہم نے تو کبھی ایسا رسول آتا نہیں سنا"۔

"قَالُوْا لَوْشَاءَ رَبُّنَا لَاَ نْزَلَ مَلَائِكَةً"

"اگر خدا چاہتا رسول بنا کر کسی کو بھیجتا تو ملائکہ کو بھیجتا"۔

یہاں تک کفار کا قول قدرت نے بیان کیا۔ اس کے بعد ایک لفظ کہا ہے:

"وَلَوْجَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا"

"اگر ہم کسی ملک کو بھی اپنا منصب دار بنا کر بھیجتے تو پہلے اُسے رجل قرار دیتے"
لفظ رجل اس مقام پر کتنا نفیس لفظ ہے تو ملک صورت قرار دیکر نہ بھیجتے بلکہ اُسے رجل قرار دیکر بھیجتے۔ اب آیت صاف کہہ رہی ہے کہ منصب الٰہی کا حق اُسی کو ہے جو رجل ہے اور ملک کو بھی ہم رجل بنا دیتے اگر منصب دیتے۔ مَلَک ہونا آسان ہے، رجل ہونا مشکل ہے۔ اگر ملک ہے اور رجل نہیں ہے، وہ حقدار منصب الٰہی نہیں ہے۔ اس لفظ کو میں زبانِ رسولؐ سے سن رہا ہوں۔

"لاُ عطین الرایة غداً رجلاً"

"کل میں جس کو علم دوں گا اُس کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ رجل ہے"۔

رجل کسے کہتے ہیں؟ جو کرار ہو، کرار کون ہوتا ہے؟ جو غیرِ فرار ہو، غیر فرار کون ہوتا ہے؟ جس کے دل میں حبِ خدا و رسولؐ ہو۔ محبتِ خدا اور رسولؐ ہی تو ہوتی ہے جو میدانِ جنگ میں ٹھہراتی ہے۔ ٹھہراتی ہے، میدان میں تو محبت ہی ٹھہراتی ہے اور لے جاتی ہے میدان سے، تو وہ بھی کوئی محبت ہی ہے۔ محبتِ ایمان ہے جو ٹھہراتی ہے، محبتِ جان ہے جو لے جاتی ہے۔

غرضیکہ جسمِ ظاہر کو دیکھ کر برابری کا فیصلہ کر لینا کارِ ابلیس ہے۔ اب تک وہ کام بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے کہ بدن کو دیکھ دیکھ کر "ہم جیسے، ہم جیسے"۔ ہم اُن جیسے، وہ ہم جیسے۔ یہ تو شیطانی اجتہاد ہے۔ یہ شیطانی قیاس ہے ورنہ حقیقتِ آدم، کیا کہنا اُس حقیقت کا کہ خداوند عالم نے معصومین کو، ملائکہ جتنے ہیں، معصومین ہیں، اور پھر ذرا وزن پر نظر ڈالئے گا، کتنے کروڑوں ملائکہ ہوں گے جنھوں نے آدم کو سجدہ کیا ہوگا۔ سجدہ کرنے والے ان گنت ہیں اور سجدہ کیا جانے والا ایک ہے۔ اُس ایک کے سامنے قدرت نے ہر ایک معصوم کو جھکا دیا۔ اب اگر عصمتِ آدم کم ہوتی عصمتِ ملائکہ سے تو خداوند عالم ظالم نہیں ہے کہ بیش کو کم کے آگے جھکائے اور بہتر کو کمتر کے سامنے جھکائے۔ ماننا پڑیگا کہ ملائکہ کل کے کل ہو کر بھی کم ہیں اور آدم ایک ہو کر بھی زیادہ۔ ایک کو سجدہ کروایا ہے ہر ایک سے۔ یہ ساجد ہیں، وہ مسجود ہیں۔ ایک عصمتِ آدم کا مرتبہ کتنا بلند ہوا، پھر وہ معصوم آدم جس کو ان گنت معصوموں نے سجدہ کیا۔ اُس آدم سے جب ترکِ اولیٰ ہو جاتا ہے تو:

"فَتَلَقّٰی آدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ کَلِمٰتٍ"

"تو رب آدم، آدم کو کچھ کلمات سکھا دیتا ہے"۔ وہی کلمات زبانِ آدم پر آتے ہیں۔

"فَتَابَ عَلَیْهِ".

فی الفور اُن کی عرضی قبول ہو جاتی ہے، اُن کی معذرت کو قبول کر لیا جاتا ہے، وہ کلمات تھے کیا؟ میں اپنی زبان سے کہوں تو شاید کوئی جوشِ محبت پر مبنی کرے، علامہ جلال الدین سیوطی" تفسیر دُرِ منثور میں بیان کرتے ہیں کہ وہ کلمات کیا تھے۔ پانچ نام تھے جو قدرت نے آدم کو تعلیم کر دیئے۔ اُن ناموں کا زبانِ آدم پر آنا اور کام کا بن جانا۔ جن کے نام تھے، انہوں نے کوئی سفارش نہیں کی۔ نام والے آگے نہیں بڑھے آدم کی سفارش کیلئے، بس نام ہی نام اُن کے تھے۔ تو برائے نام وہ نام آگئے آدم کی زبان پر۔ ناموں کا زبانِ آدم پر آجانا اور خداوند عالم کا اُن کی معذرت کو فی الفور قبول کر لینا۔ یہاں سے مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جن کے نام یہ کام کر دکھائیں، اگر وہ نامدار خود کچھ کہہ دیں خدا کی بارگاہ میں، کسی کے بارے میں بھی دعا کے طور پر کہہ دیں، بددعا کے طور پر کہہ دیں، اُن کا کہنا کیسا سریع الاجابت ہوگا۔ وقت پر سنبھل گئے نصرانی، کہتے تو ہیں کہ پہچانتے نہ تھے وہ مگر اتنا تو پہچان لیا کہ انہوں نے آپس میں کہنا شروع کیا کہ ہمارے سامنے وہ نورانی چہرے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پہاڑ کو بھی اشارہ کر دیں، وہ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائے گا۔ ہم اپنے حق میں ان سے بددعا نہیں کروانا چاہتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ پہچاننے پر اتنا پہچانا۔ مسلمان تو نے کیا پہچانا؟

سجدے کا حکم ہوا ابلیس کو اوروں کیساتھ ساتھ مگر نہ کیا اُس نے سجدہ، بات رہ گئی جسے میں پورا کرنا چاہتا ہوں۔ قدرت نے سوال کیا اُس سے:

"اَسْتَکْبَرْتَ اَمْ کُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ"

استکبرت اصل میں مصدر ہے، ءَ اِستکبرتہ، مگر ءِ وصل عربی میں گر جایا کرتا ہے۔ کیا تو نے تکبر کیا؟ "کُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ"، "یا تو نے اپنے آپ کو عالین میں سے سمجھ لیا"۔

عالین جمع ہے عالی کی، کیا کہنا اُس بارگاہِ عالی کا جس کو خدا عالی کہے اور عالین کا لفظ جمع

بتا رہا تھا کہ وہ کئی ایک تھے اور اس حیثیت میں تھے کہ سجدے کا حکم اُن کو نہیں ہوا۔ وہ اس حکم سے مستثنیٰ تھے۔ کیا جو حکم سجدہ سے بری تھے، تُو نے اُن میں سے اپنے آپ کو سمجھ لیا؟

اس کا جواب کیا ہے؟ صاف اُس کے جواب سے پتا چلتا ہے کہ عالین میں سے ہونے کی ہمت تو میں نہیں کرسکتا مگر "اَنَا خَیرٌ مِّنہُ"، "جس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے، اُس سے میں افضل ہوں"۔ اُسے ابلیس کو تسلیم ہے یہ بات کہ آدم کی خلقت مٹی سے ہوئی ہے اور عالین کی تخلیق نور سے ہوئی ہے۔

میرا دل چاہتا ہے اس مقام پر کہ میں یہ کہہ دوں کہ شیطان، شیطان ہونے کے باوجود اُن کی برابری نہ کرسکے۔ خدا جانے وہ کیسے شیطان ہوں گے جو انسان کے روپ میں تھے۔ مثل مشہور ہے کہ "نزلہ برعضوِ ضعیف می ریزد" تو جنابِ آدم کو کمزور دیکھ کر اُس نے برتری کا دعویٰ کیا مگر عالین کی برابری کی وہ بھی ہمت نہیں کرسکا، حالانکہ قدرت نے موقع دے دیا تھا خود کہہ کر تو نے اپنے آپ کو "اُن" میں سے سمجھا۔ مگر نہیں کہا اُس نے کہ میں نے اپنے آپ کو اُن میں سے سمجھا مگر کہا کہ "اَنَا خَیرٌ مِّنہُ"، "اس سے بہتر ہوں جس کو تو نے مٹی سے بنایا"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عالین کا نور روشن اُس کے سامنے تھا۔ نور سے تقابل نہیں کرسکا۔ شیطان، شیطان ہونے کے باوجود اُن کی برابری نہ کرسکے تو وہ کیسے شیطان ہوں گے جنہوں نے اپنے آپ کو اُن سے بھی افضل کہا۔

اب حضرات میں یہ واضح کردوں کہ وہ ایسے ہوں گے۔ آیتِ قرآنی سے سنئے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے، نکتہ رسی کے ساتھ سنئے کہ، ایک ایک لفظِ آیت کے رخ پر پورا رخ جمائیں، فرمایا جاتا ہے:

"اَلَّذِینَ یَنقُضُونَ عَهدَ اللّٰهِ مِن بَعدِ مِیثَاقِهٖ"

"ہیں کچھ ایسے لوگ جو اللہ کے عہد کو توڑنا چاہتے ہیں جبکہ اللہ اپنے اُس عہد کو مضبوط کر چکا ہے"۔

اللہ کا عہد کیا ہے؟ ہمیں بہت پیچھے جانا پڑے گا۔ تاریخ کو پلٹنا پڑے گا۔

"اِذِابْتَلٰی اِبْرٰھِیْمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ"

"یاد کرو! ابراہیم کا اللہ نے کئی باتوں میں امتحان لیا"۔

"فَاَتَمَّھُنَّ"

"ابراہیم نے ہر امتحان میں پوری کامیابی پائی"۔ ہم نے سندِ کامیابی دیتے ہوئے کہا:

"اِنِّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا"۔

"ابراہیم! میں تم کو تمام نوعِ انسانی کیلئے امام قرار دے رہا ہوں"۔

یہ سند ہے کامیابیوں کی۔

"قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِی"

"آپ نے عرض کیا اور میری اولاد میں؟"

اب جو لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ نبی کے بعد منصب اسی کی ذریت میں رہے، یہ تو حکومت کسریٰ ہوگئی، حکومت قیصریٰ ہوگئی، وہ حضرت ابراہیم سے کہیں کہ کیوں کہہ رہے ہیں "وَمِنْ ذُرِّیَّتِی"، "مِنْ اُمَّتِی" کہیں۔

جوابِ قدرت آیا:

"لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ"

"میرا عہد ظالمین تک نہیں پہنچے گا"۔

کلام میں ایک بلاغت کا پہلو ہے۔ جواب آیا ہے کہ میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ یہ نہیں کہا کہ ظالم میرے عہد تک نہیں پہنچیں گے۔ دونوں جملوں میں فرق ہے۔ تو معلوم ہوا عہد خود پہنچا کرتا ہے، لینے والے عہد تک نہیں پہنچا کرتے، کہیں جا کر عہد نہیں ملتا، بیٹھے بٹھائے ملتا ہے۔ اپنا عہد قدرت نے کا ہے کو کہا ہے؟ "اِنِّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" تم کو میں امام قرار دے رہا ہوں۔ حضرت ابراہیم نے عرض کیا میری اولاد میں سے۔ اولاد کیلئے امامت چاہی۔

خداوند عالم نے جواب دیا، میرا عہد ظالمین تک نہیں پہنچے گا۔ خدا کا عہد کیا ہوا، عہد خدا ہے امامت، اب سمجھ میں آئے گا آپ کے عنوانِ کلامِ خدا:

"اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ مِن بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ"

"ہیں کچھ لوگ ایسے جو اللہ کے عہد کو توڑنا چاہتے ہیں"۔

اب عجیب جملہ ہے زبانِ آیت پر:

"وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ"

"اور قطع کرنا چاہتے ہیں اُس چیز کو جس کو خداوند عالم نے ملا کر رکھا"۔

یوصل کا مادّہ وصل ہے۔ جس کو وصل خداوند عالم نے قرار دیا ہے، وصل کو فصل سے بدلنا چاہتے ہیں۔

"وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ"

"اور (اپنی ان تدبیروں سے) زمین کو فساد سے بھرنا چاہتے ہیں"۔

اب خداوند عالم فرماتا ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں:

"اُولٰٓئِکَ لَھُمُ اللَّعْنَۃُ وَلَھُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ"

"(یہ وہ ہیں کہ) اُن کیلئے لعنت ہے اور اُن کیلئے وہاں بدترین گھر ہے"۔

یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہاں اُن کا حصہ لعنت ہے اور وہاں اُن کا حصہ جہنم ہے۔ اور یہ لعنت بھی جہنم سے کم تو نہیں ہے۔ یہاں بھی اُن لئے جہنم ہے، وہاں بھی اُن کیلئے جہنم ہے۔

حضرات! مجھے جو بات کہنا تھی اس سلسلہ میں، وہ کچھ عجیب سی بات ہے اور میں عجیب رنگ میں کہنا چاہ رہا ہوں۔ صاف بات یہ ہے کہ شیطان عالین کی برابری نہیں کر سکا، آدم سے برتری کا دعویٰ کیا مگر عالین سے برابری کا دعویٰ نہیں کر سکا۔ جرم کم تھا، پھر بھی "اِنَّ عَلَیْکَ لَعْنَتِیْٓ"۔ "اُس پر لعنتِ خدا مستقل ہو گئی۔ اب میں نے یہ جملہ کہا تھا کہ عالین کی برابری کا دعویٰ شیطان بھی نہ کر سکا تو وہ کیسے شیطان ہوں گے جنہوں نے عالین سے برتری کا دعویٰ کیا۔ اب میں

فرق دکھانا چاہتا ہوں۔ شیطان کیلئے ''اِنَّ عَلَیْکَ لَعْنَتِیْ''، یہاں ہے لعنت کیلئے علیٰ اور اُن کیلئے ''اُوْلٰئِکَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ''۔ یہاں ''لَهُم'' کہا ہے۔ بات باریک ہے حضرات! یہ دو چیزیں ہیں مقابلے کی، شیطان کیلئے ہے لعنت، تو لعنت کس کیلئے؟ شیطان کیلئے، لعنت ہے مگر لعنت ان کیلئے ہے۔ یہ دو چیزیں مختلف ہیں۔ میں بطور مثال کہنا چاہتا ہوں انبیاء سرکارِ دو عالم سے پہلے جتنے تھے، سب برحق، آخر میں سرکارِ سید الانبیاء۔ اُن میں اور اِن میں کیا فرق ہے۔ وہ سب تھے نبوت کے لئے اور نبوت تھی ان کیلئے۔ تو نبوت جس کیلئے تھی، اُس تک پہنچی تو پھر نہیں چلی، پھر آگے نہیں بڑھی کیونکہ نبوت ان کیلئے تھی۔ جس کیلئے نبوت تھی، جب اُن تک پہنچ گئی تو اعلان ہو گیا ''خاتم النبیین''، اُن کا وجود تھا نبوت کیلئے، نبوت کا وجود ہوا تھا ان کیلئے۔

ابتداء ہے لعنت کی جو شیطان سے ہوئی مگر اُس کیلئے تو ہے لعنت، مگر لعنت ہے ان کیلئے (دشمنانِ اہلِ بیتؑ)۔ جب ان تک وہ لعنت پہنچ گئی تو بس ختم ہے۔ ایک وہ گھرانہ ہے کہ جس گھرانے پر ختم نبوت ہے اور ایک وہ گھرانہ ہے کہ جس پر ختم لعنت ہے۔ اب ان کے بعد کوئی نہیں کہ جس پر لعنت ہو۔ اگر سلسلہ لعنت کا چلے گا بھی تو اُنہیں کے طفیل سے، انہیں کی نسبت سے، انہیں کے رشتے سے۔

ایک عجیب منظر ہے قرآن مجید کا، بالکل سادہ لفظوں میں کہہ رہا ہوں، اپنی بات کو میں زیادہ بنانا نہیں چاہتا۔ مگر ایک عجیب بات ہے اور میں نے علمائے اعلام کے مجمع میں جب وہ بات بیان کی تھی تو میں منبر سے کہہ رہا ہوں کہ بڑے بڑے فاضل اور مجتہد حضرات نے کھڑے ہو کر کہا کہ ''عجیب بات ہے'' اور یہ لفظ کہا کہ ''ایسے آدمی روز روز نہیں پیدا ہوتے''۔ بات اصل میں یہ ہے کہ خداوند عالم نے، رسولؐ کے زمانے میں جو یہودی تھے، یہ وہ یہودی تھے کہ جنہوں نے کسی نبی کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ کسی نبی کے زمانے کے تو نہیں تھے۔ ان پر من و سلویٰ نہیں اترا تھا، انہوں نے وہ بچھڑا نہیں بنایا تھا۔ انہوں نے کسی نبی کو قتل نہیں کیا تھا۔ یہ سب ذہن میں رکھئے گا میرے جملے۔ مگر قرآن نے کہا:

"رَفَعنا فَوقَکُمُ الطُّور".

"ہم نے تمہارے ہی سروں پر طور کو اٹھایا تھا"۔

"قَتَلتُمْ اَنبیاءَ اللّٰہِ بِغَیرِ حَقٍّ"

"تم ہی نے تو قتل کیا ہے انبیاءِ خدا کو ناحق"۔

"اِتَّخَذتُمُ العِجلَ"

"تم ہی نے وہ بچھڑا بنایا تھا"۔

جتنے بھی صدہا برس کے اِن کی قوم کے کام تھے، وہ ان کے سر مڑھ دیئے۔ تم نے یہ کیا، تم نے یہ کیا۔

"قُلتُم یٰا مُوسیٰ لَن نَّصبِرَ علٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ"

"تم ہی نے تو کہا کہ اے موسیٰ ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے"۔

حالانکہ یہ کہاں تھے اُس زمانے میں، ان کے باپ دادا بھی اس وقت نہیں تھے۔ صدہا برس پہلے کا واقعہ نامۂ عمل میں ان کے لکھا جا رہا ہے اور نامۂ عمل بھی وہ دستِ قدرت سے لکھا جا رہا ہے۔ ملائکہ کا لکھا ہوا نہیں ہے، قرآنِ کریم میں ہے۔ ان کے ذمہ کیوں یہ باتیں لگائی جا رہی ہیں؟ اگر آپ سادگی میں یہ کہہ دیں کہ اصل میں اُن کے ذمہ یوں لگائے جا رہے ہیں یہ الزامات کہ یہ کام ان کے مورثوں کے کئے ہوئے تھے۔ جناب یہ غلط بات ہے کہ کرے کوئی، بھرے کوئی۔ یہ نظامِ عدل کے بالکل خلاف ہے۔ باپ کا کارنامہ اچھا ہو یا برا ہو، بیٹے کے ذمہ نہیں لگایا جا سکتا۔ قرآنِ کریم کا قانونِ عام ہے کہ:

"لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزرَ اُخریٰ. لَھَا مَا کَسَبَتْ"

"کسی کا بوجھ کوئی نہیں اٹھائے گا۔ جس نے جو کام کیا ہے بس اپنے لئے کیا ہے"۔ جس نے جو برائی کی ہے، وہ اپنے لئے کی ہے۔

کام انہوں نے ایک بھی نہیں کیا تھا اُن کاموں میں سے، مگر یہ اُن کے ذمہ اس لئے

لگائے گئے کہ:

"اَلرَّاضِیْ بِفِعْلِ قَوْمٍ کَالدَّاخِلِ فِیْھِمْ"

"جو کسی کے کام سے راضی ہے، وہ خود اُس کام کا فاعل قرار پاتا ہے"۔

ان پر الزام اصل میں اس لئے ہے کہ جنہوں نے جرم کئے، یہ اُن سے تبرا نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ اُن پر تبرا کرتے ہوتے اور اُن کے کاموں سے بیزار ہوتے تو خدا کی قسم! خدا ان کاموں کو اُن کی طرف کبھی منسوب نہ کرتا بلکہ اُس کی شانِ مغفرت یہ ہے کہ خود بھی اگر کوئی کام کر لیا ہو کسی نے اور وہ تائب ہو گیا ہو، وہ بھی حُر ہو جاتا ہے، الزام سے بری ہو جاتا ہے۔ جو کام انہوں نے قطعاً کئے ہی نہیں، جو زمانے انہوں نے دیکھے ہی نہیں، اُن زمانوں کے کام جو ان کے نامۂ عمل میں بصورتِ قرآن لکھے جا رہے ہیں، وہ صرف اس بناء پر کہ انہوں نے تبرا اُن پر نہیں کیا۔ اگر یہ تبرا کر رہے ہوتے تو بری الذمہ ہو جاتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مستوجبِ تبرا پر تبرا نہ کرنا بھی اُس کے جرم میں شامل ہونا ہے۔

اسی لئے زیارتِ سید الشہداء علیہ السلام میں آپ نے یہ لفظ بارہا پڑھا ہو گا کہ:

"لَعَنَ اللّٰہُ اُمَّۃً قَتَلَتْکَ"

"خدا اُس گروہ پر لعنت کرے جس نے آپؑ کو قتل کیا"۔

"وَلَعَنَ اللّٰہُ اُمَّۃً ظَلَمَتْکَ"

"اور اُس گروہ پر بھی لعنت کرے جس نے آپؑ پر ظلم کیا"۔

"وَ لَعَنَ اللّٰہُ اُمَّۃً سَمِعَتْ بِذٰلِکَ فَرَضِیَتْ بِہٖ"

"نہ تو اُس نے آپؑ کو قتل کیا نہ اُس نے آپؑ پر ظلم کیا لیکن آپؑ پر ظلم کو سن کر وہ اُس پر راضی ہوا، اُس پر بھی لعنت ہو"۔

بلکہ میں تو حضرات یہاں تک کہوں گا کہ سرکارِ دوعالم کے زمانے میں جنگ ہوتی تھی نا، کوئی ثابت قدم رہتا تھا، کوئی نہیں بھی رہتا تھا۔ ثابت قدم رہنا بہترین نیکی اور بھاگ جانا کفر

ہے ازروئے قرآن۔ اسی لئے سرکارِ ولایت نے جواب میں کہا تھا کہ:

"اَاَکْفُرُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ"

"میں کافر ہو جاتا ایمان لانے کے بعد"۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جنابِ والا! وہ مجاہدات ہماری زندگی میں تو نہیں ہو رہے ہیں، لہٰذا ہم نہ ثابت قدموں میں ہیں، نہ کراریوں میں ہیں، نہ فراریوں میں ہیں، مگر آپ اس اطمینان پر نہ بیٹھیں کہ چونکہ ہمارے زمانے میں وہ مجاہدات ہو ہی نہیں رہے ہے، لہٰذا نہ ہم کراریوں میں ہیں، نہ ہم فراریوں میں ہیں۔ نہ ہوں آپ کے زمانے میں جہاد، پھر بھی آپ یا کراریوں میں ہوں گے یا فراریوں میں ہوں گے۔ اگر کراریوں سے راضی تو اُن میں سے اور اگر فراریوں سے راضی تو اُن میں سے۔ اس لئے بیٹھے بٹھائے، بغیر کچھ کئے برائے نامۂ اعمال میں لکھت پڑھت ہوتی رہتی ہے۔ اسی لئے قدرت نے ہمیں آگاہ کیا ہے کہ:

"اِنَّ اللّٰـهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ"۔

"اللہ تو محبت اُن سے رکھتا ہے جو میدانِ قتال میں جم کر قتال کرتے ہیں، گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"۔

یہ ہمیں کیوں سنایا جا رہا ہے، اس لئے کہ سننے والو! یہ سننے کے بعد کہ خدا کو تو اُن سے محبت ہے، اب تم اپنے دلوں کو ٹٹولو تمہیں کس سے محبت ہے؟ اگر انہیں سے محبت ہے جن سے خدا کو ہے تو تم خدا کیساتھ ہو اور خدا تمہارے ساتھ ہے اور اگر تمہیں محبت اُن سے ہے جو کبھی میدان میں نہیں ٹھہرے تو سمجھ لو کہ تم خدا کے دشمن ہو۔ اُن سے محبت رکھتے ہو جن سے خدا کو عداوت ہے۔ اُن سے عداوت رکھتے ہو جن سے خدا کو محبت ہے۔ ہمیں یہ تمام سبق پڑھائے جا رہے ہیں، ہدایات ہو رہی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جب بھی یہ آیت کسی کی زبان پر آئے گی:

"كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ"

اگرچہ آیت میں نام کسی کا نہیں ہے مگر سرِ فہرست ایک نام تصور کی نظر کے سامنے آجائیگا جس کے بل بوتے پر آیت اتر رہی ہے، جس کے بھروسے پر آیت اتر رہی ہے، جس کا نام سرِ فہرست درج ہونے کے لائق ہے، وہ ہے ''کَرَّارٌ غیر فَرَّارٌ''۔

سرکارِ دو عالم کا علیؑ جیسی عظیم ہستی کے بارے میں، جس کو خدا ''نَبَاءِ عظیم'' کہہ رہا ہو، اُس نورِ کردگار کیلئے ''کَرَّارٌ غیر فَرَّارٌ''۔ یہ الفاظ شایانِ شانِ علیؑ ہیں؟ علیؑ تو علیؑ، اگر علیؑ کا نام لیوا بھی کوئی ہے تو وہ فرار نہیں ہو سکتا بلکہ کرار کی صلاحیت حاصل کرنے کیلئے لوگ علیؑ کا نام لیتے ہیں۔ علیؑ کا نام سبب قرار ہے۔

کسی شخص نے یہ واقعہ مجھے سنایا کہ دو بستیاں تھیں دریا کے اِدھر اُدھر۔ مومنین دونوں بستیوں میں آباد تھے۔ یہاں مجلس ہوتی تھی تو اُدھر کے مومنین بھی آجاتے تھے۔ وہاں مجلس ہوتی تھی تو اِدھر کے مومنین وہاں چلے جاتے تھے۔ ایک بستی میں مجلس ہو رہی تھی تو دوسری بستی کے مومنین اُس مجلس میں شریک ہونے کو چلے۔ کسی آنے والے کا پیر اُس دلدل میں پھنس گیا۔ وہ اپنا پیر باہر نکالنا چاہتا ہے اور حسبِ عادت کہتا ہے کہ ''یا علیؑ''، کوشش کر رہا ہے پیر اٹھانے کی اور یا علیؑ کہتا جاتا ہے تو پیر اکھڑ نہیں رہا ہے۔ برابر سے جو دوست احباب گزر رہے تھے تو کہتے ہیں کہ بھئی کیا مصیبت کر رہے ہو تم، پیر اکھاڑنا چاہتے ہو اور نام اُس کا لئے جا رہے ہو کہ جس کا پیر کبھی اکھڑا ہی نہیں ہے۔ یہ تو اور جمتا رہے گا۔ وہ گھبرایا اور کہا کہ جی میں کس کا نام لوں؟ کہا گیا کہ اُن کا نام لو جن کے پیر اکھڑے ہیں۔ اُس نے کہا کہ میں اُن کو پکاروں؟ تو جواب دیا گیا کہ پکارنے سے مطلب نہیں ہے۔ جو اُن کا حق ہے، وہ انہیں دو۔ جن کے نام میں یہ اثر ہو کہ پیر نہ اکھڑے میدانِ قتال سے، نام لے کر میدان میں چلا جائے تو اُن کے نام کی بدولت قرار مل جائے، تو جن کے نام میں یہ اثر ہو تو سرکارؐ نے اُسے کرار، غیر فرار کہا، تو کیا کہنا اس کا کہ غلام بھی جس کا کبھی میدان چھوڑ کر جانے والا نہ ہو۔ اب میرا مجمع ذرا سوچ کر مجھے بتائے کہ میں اس حدیث کے جتنے بھی الفاظ ہیں:

"رجلاً کراراً غیر فرارٍ یُحِبُّ اللّٰہَ وَ رَسولَہٗ وَ یُحِبُّہُ اللّٰہُ و رسولُہٗ"

یہاں تک کہ جتنے بھی لفظ ہیں، اب میں علیؑ کا تصور تھوڑی دیر ہٹا کر لشکرِ علمدارِ حسینؑ کا تصور کر کے فرزند امیر المومنینؑ کا تصور کر کے پوچھتا ہوں کہ تمام الفاظ حضرت عباس علیہ السلام پر منطبق ہیں یا نہیں؟ جس کی اولاد کا یہ عالم ہو اور عباسؑ تو پھر بھی بیٹے ہیں، علیؑ کے فرزند ہیں۔ میں تو یہاں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ علیؑ کا غلام (قنبر) بھی ہے تو وہ فرار نہیں ہو سکتا۔ علیؑ کے غلام ہی تو تھے جو کربلا میں جمع ہو گئے تھے۔ سچ بتایئے کربلا کی ہولناک جنگ سے زیادہ ہولناک جنگ کوئی دنیا میں ہوگی؟ خطرات کا ہجوم جتنا کربلا میں ہوا ہے، کسی اور جنگ میں ہوا ہے؟ ہو سکتا ہے؟ ہوگا؟ مگر اللہ اللہ کربلا میں امامؑ کے ساتھ سب کے سب بنی ہاشم ہی تو نہیں تھے بلکہ سب کے سب عربی بھی نہیں تھے۔ ان میں حبشی بھی تھے۔ مگر کیسا خزانہ جمع کیا تھا امامؑ نے۔ کمال یہ ہے کہ مالک و سردار خود کہے کہ چلے جاؤ مگر نہیں جاتے۔ جون غلامِ حبشی، سیاہ فام بھی ہے، بے لکھا پڑھا آدمی، چہرہ سیاہ ہے، دل منور ہے۔ امامؑ کہتے ہیں چلے جاؤ مگر یہ اشک بہاتے ہیں۔ اس بناء پر کہ امامؑ مجھے خون بہانے کی اجازت کیوں نہیں دے رہے ہیں۔ پہلے آنسو بہائے، پھر کسی نہ کسی طرح امامؑ کو راضی کر کے خون بھی بہا دیا۔ حالانکہ حیلہ تو مل گیا تھا کہ امامؑ نے کہہ دیا ہے، ہم جا رہے ہیں۔ حضورؐ کی ذات سے بہتر کونسی ذات ہو سکتی ہے! ایک وہ موقع ہے کہ رسولؐ پکار رہے ہوں کہ مت جاؤ، آؤ۔ اور ایک یہ موقع ہے کہ امامؑ کہہ رہے ہیں کہ چلے جاؤ، نہ وہاں کہنا مانا گیا اور نہ یہاں کہنا مانا گیا۔ مگر ہماری جانیں قربان ہو جائیں اس کے کہنا نہ ماننے پر۔ اگر یہ کہنا مان لیا جاتا تو پھر کہاں ذکرِ خیر کے لائق رہتے۔ اب تو ان کا یہ مرتبہ ہے کہ میرے ایک ایک امامؑ نے انہیں سلام کیا ہے۔ نام لے کر سلام کیا ہے۔ یہاں تک کہ آئمہؑ کے سلام اور زیارت میں جون تک کا بھی نام موجود ہے۔

"السلام علی جون مولا ابی ذرِّ الغفاری"

"میرا سلام جون پر بھی ہو جو ابوذر غفاری کے غلام تھے"۔ یعنی اس گھرانے کے غلام کے بھی غلام، مگر کرار بھی تھے، غیر فرار بھی تھے۔ امامؑ کے پسینے پر خون گرانے والے، رات کے کئے

ہوئے وعدے کو نبھانے والے۔ واقعاً جو کہا تھا کر کے دکھا دیا ورنہ واقعاً یہ بات ناممکن نہیں تھی کہ ہزاروں برستے ہوئے تیروں میں سے کوئی تیر انصار کی موجودگی میں بھی امامؑ کو لگ جاتا مگر آنچ نہیں آنے دی، جب تک یہ رہے امامؑ محفوظ رہے۔ یہ سینہ سپر رہے، سینوں پر تیر لیتے رہے۔ فرزندِ رسولؐ کی حفاظت کرتے رہے اور مجھے ایک وقت یاد آتا ہے کہ جب یہ حضرات چل بسے۔ دو تین ناصر باقی رہ گئے، جب امامِ عالی مقام اُن کی طرف سے گزرے تو امامؑ نے دیکھا کہ وہ لوگ رو رہے ہیں۔ روتا ہوا دیکھ کر امامؑ نے رونے کا سبب پوچھا تو اور رونے لگے۔ جواب دیا کہ آقا بہت سے چل بسے، ہم بھی پا بہ رکاب ہیں، چراغِ سحری ہیں۔ رونا اسی بات کا ہے کہ ہم آپؑ کو بچا نہ سکے۔ کتنا قلق ہے ان کو، انہیں تصور ہے کہ تھوڑی دیر بعد وہ وقت آجائے گا کہ امامؑ بالکل تنہا رہ جائیں گے۔

چنانچہ وہ وقت آہی گیا کہ سینہ سپر کوئی نہ رہا۔ تیروں کا مینہ اُسی طرح برستا رہا اور اس بارش کے لفظ پر مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ یہ قافلہ قیدِ ظلم سے جب چھوٹ بھی گیا، قیدِ ظلم سے چھوٹا مگر قیدِ غم سے نہیں چھوٹا۔ اجڑا ہوا گھر دیکھا۔ وہ گھر رونے کیلئے تھا۔ بیبیاں گریہ وزاری کیلئے تھیں اور حالت یہ بتائی جاتی ہے کہ بیبیاں حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتی تھیں اور روتی تھیں۔ چاہتی یہ تھیں کہ ہم سائے میں بیٹھ کر نہ روئیں، اس لئے کہ یاد آتا تھا کہ ہمارے پیاروں کی لاشیں دھوپ میں پڑی تھیں۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ یہ بیبیاں حلقہ باندھے ہوئے دھوپ میں بیٹھی ہوئی رو رہی تھیں، اُسی وقت بادل گھر کر آگیا اور مینہ برسنے لگا۔ ثانیِ زہراؑ نے حکم دیا کہ بیبیو! اب اٹھ جاؤ، بارش ہونے لگی ہے۔ تمام بیبیاں شاہزادی کے حکم پر اٹھ گئیں مگر ایک بی بی سر جھکائے اُسی طرح بیٹھی رہی۔ حالت اُس کی یہ ہے کہ جب دھوپ تھی تو اُسے دھوپ کی خبر نہ تھی، اب بارش ہے تو اُسے بارش کی خبر نہیں۔ بیبیاں اٹھ گئیں۔ اُسے کچھ خبر نہ ہوئی۔ ایک عجیب محویت ہے۔ اجڑی ہوئی گود کو دیکھ رہی ہیں۔ یہ رباب کا ذکر ہے۔ اصغرؑ کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ ثانیِ زہرا سلام اللہ علیہا نے جب رباب کی یہ بے حالی دیکھی تو جنابِ رباب کے بازو پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ اب اٹھ جایئے، مینہ برس

رہا ہے۔ جنابِ رباب نے جب اپنے بازو پر ثانی زہراؑ کے ہاتھ کو محسوس کیا تو سر اٹھا کر ثانی زہراؑ کے منہ کو دیکھا اور یہ جملہ کہا:

''آپ مجھے پانی کی بارش سے اٹھا رہی ہیں، تیروں کی بارش تو نہیں ہو رہی ہے۔ آپ کے بھائی پر تو تیروں کا مینہ برسا تھا''۔

یہ کہہ کر جنابِ رباب نے ایسی آہِ پُر درد کھینچی کہ وہی آہ آپ کی زندگی کا آخری لمحہ بن گئی اور آپ دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

الا لعنة الله علی القوم الظالمین۔

چوتھی مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ. اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ. اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّاشَرْقِیَّۃٍ وَّلَاغَرْبِیَّۃٍ، یَّکَادُزَیْتُھَایُضِیْٓئُ وَلَوْلَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ. نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ. یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ. (نور:۳۵)۔

حضرات! انسان کے کچھ عمل تو وہ ہوتے ہیں جو خود اُس کے کیے ہوئے ہوتے ہیں اور کچھ عمل وہ ہوتے ہیں جو اُس کے کیے ہوئے تو نہیں ہوتے لیکن اُس کی ڈالی ہوئی بنیاد کی بناء پر وہ عمل کرنے والے عمل کرتے ہیں۔ سورہ یٰس میں اسی کا ذکر ہے کہ:

"وَنَکْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ آثَارَھُمْ"

"پہلے سے جو لوگ کرتے ہیں ہم اُن اعمال کو بھی لکھتے ہیں اور جو آثار وہ چھوڑ جاتے ہیں اپنے بعد کیلئے، اُن کے نامۂ اعمال میں وہ اعمال بھی لکھے جاتے ہیں"۔

وہ آثار کہلاتے ہیں اور اپنے کیے ہوئے کام اعمال کہلاتے ہیں۔ ضیا صاحب کو دیکھ کر مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ جو مجالس پہلے ہوئی ہیں، وہ تو اُن کے اعمال تھے اور یہ مجلس جو ہورہی ہے، یہ اُن کے آثار ہیں۔

موضوع تھا حقیقت اولی الامر اور اسی بناء پر اس موضوع کو سنتے ہی میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ جب حقیقت ہی سے بحث ہے تو پھر میں حقیقت ہی بیان کروں۔ چنانچہ میں نے آپ کے یہ اوقات اس نیکی میں جو صرف کیے، حقیقت ہی بیان کرتا رہا کہ حقیقت ان حضرات کی خاک نہیں ہے، حقیقت ان حضراتؑ کی نور ہے اور ایسا نور ان کی حقیقت ہے کہ حقیقتاً ابلیس نے بھی ان کی نورانیت کو مانا ہے۔ اس لئے کہ جب موقع دیا تھا قدرت نے کہ:

"اَسۡتَكۡبَرۡتَ اَمۡ كُنۡتَ مِنَ الۡعَالِيۡنَ"

"تکبر کیا تو نے یا اپنے آپ کو عالین میں سے سمجھ لیا"۔

تو وہ جواب دیتے ہوئے گویا کہہ رہا ہے کہ میں عالین کی برابری تو نہیں کر سکتا مگر جس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے، اُس سے میں ضرور افضل ہوں۔ تو صاف پتہ چلتا ہے کہ عالین کا خمیر اُس نے مٹی نہیں مانا۔ اگر اُن کے خمیر کو بھی اس نے مٹی سمجھا ہوتا تو پھر یہ کیا کہ اُن کی برابری تو میں نہیں کر سکتا؟ یہاں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ابلیس بھی اُن کی نورانیت کو ماننے والا ہے۔ ابلیس تک نے جن کی نورانیت کو مان رکھا ہو، اب انسان اگر کوئی اُن کی نورانیت کا منکر ہو تو واقعاً اگر ایسے انسان کو میں شیطان کہوں تو شیطان کو شکایت ہوگی کہ میری توہین ہو رہی ہے۔ میں نے تو یہ جرم نہیں کیا تھا جو میرے ذمہ لگایا جا رہا ہے۔ میں تو ایسا نہیں جیسے یہ نکلے۔ غرضیکہ حقیقت ان حضرات کی خاک نہیں ہے، نور ہے اور یہ وہ نور ہے جو اوّل بھی ہے اور آخر بھی ہے۔ آنے میں پہلا آنے سے مراد ہے وجودِ اصل، وجود میں سب سے پہلا اور منصب داری میں سب سے آخر۔ اوّل بھی ہے، آخر بھی ہے۔ بجا طور پر میں اس نور کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ:

"هُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالۡبَاطِنُ"

شانِ خداوندی ہے اللہ کے نام بھی تو انؑ پر صادق آ رہے ہیں۔ خدا شاہد ہے کہ یہ ایسے صادقین ہیں کہ ان کے نام اگر بتا دیتے ملائکہ تو ملائکہ بھی صادقین قرار پاتے۔

"اَنۡبِئُوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ"

جن کے ناموں کے بتا سکنے پر کوئی صادق کی سند پا سکے، اُن صادقین کی صداقت کا کیا کہنا۔ مگر دنیا کا بگڑا ہوا مزاج، جھوٹ کو سچ کہنا، سچ کو جھوٹ کہنا۔ خداوند عالم جنہیں سچا کہے، انہیں تو لقب یہ نہ دیئے جائیں۔ کمال کی بات ہے اور آپ کو بھی شاید حیرت ہوگی مگر میں شاعری نہیں کر رہا ہوں، ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں کہ یہ مسائل علمِ کلام کے ہیں اور یہ بحث باقاعدہ موجود ہے اُس طرف کہ ابراہیم نے تین جھوٹ بولے، جس کتاب میں چاہے دیکھ لیں۔

"کَذِبَ ثَلٰثَ کَذِبَات" "ابراہیم نے تین جھوٹ بولے"۔

اب بولے یا نہیں بولے، مجھے اس سے کوئی بحث نہیں مگر میں یہ سوچا کرتا ہوں کہ ابراہیم کو خداوند عالم نے صدیق کہا۔ تو اگر یہ سچ ہے کہ انہوں نے تین جھوٹ بولے تو اگر خدا کے کہے ہوئے صدیق نے تین جھوٹ بولے، خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ:

"وَاذْکُرْ فِی الْکِتَابِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّهٗ کَانَ صِدِّیْقاً نَّبِیًّا"

اگر سچ کہہ رہے ہو تو خدا کے کہے ہوئے صدیق نے اگر تین جھوٹ بولے تو میرے اور آپ کے کہے ہوئے نے کتنے جھوٹ بولے ہوں گے۔ پھر کیا کسی کا اعتبار رہ گیا۔

غرضیکہ حضرات جناب ابوذر غفاری کیلئے ارشاد رسولؐ کریم ہے:

"آسمان نے سایہ نہیں ڈالا، زمین نے بوجھ نہیں اٹھایا اُس کا جو ابوذر سے زیادہ سچا ہو"۔

لقب صدیق ہوتا تو ان کا ہوتا، مگر انہیں وطن سے بار بار نکالا جاتا رہا۔ حضرات ایک بات میرے خیال میں آرہی ہے (میں سمجھتا ہوں کہ یہ شرف اس عزاء خانے کا ہے کہ آدھی رات ہونے والی ہے مگر مجمع یہ بتا رہا ہے کہ دن میں ہے، دن کھلا ہوا ہے اور میں بھی آپ سے سچ کہنا چاہتا ہوں منبر کی بلندی سے کہ بڑا مقدس مقام ہے جہاں میں بیٹھا ہوں، میں بھی عزاء خانے تک پہنچنے سے پہلے اکتایا ہوا ہوتا ہوں کہ اتنی رات گزر گئی کیا، پڑھوں گا، کوئی کیا سنے گا۔ ادھر عزاء خانہ پہنچا اور آپ حضرات کی جیتی جاگتی صورتوں کو دیکھا، اب تو دل چاہتا ہے کہ پڑھے ہی جاؤں) کہ یہ مسلّم ہے بین الفریقین شیعہ، سنی، مقلد، غیر مقلد، ختم نبوت کے معتقد یا نبوت جدیدہ کے معتقد، کل کے کل مانتے چلے آرہے ہیں کہ سرکار دو عالم نے جناب سلمان کیلئے فرمایا کہ:

"سَلْمَانُ مِنَّا اَھْلَ الْبَیْت" "سلمان ہم اہلِ بیتؑ سے ہے"۔

سرکار کا یہ جملہ ہے۔ میں یہ سوچا کرتا ہوں کہ جب تک سرکارؐ نے یہ جملہ نہیں کہا تھا، اس وقت تک بھی سلمان کا کوئی مقام تو تھا۔ اس ارشاد سے پہلے بھی تو سلمان کچھ تھے، تو کیا تھے؟ رسولؐ

کے صحابی تو تھے، اب سرکارؐ نے یہ جملہ فرمایا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ جملہ فرما کر سرکارؐ نے سلمان کو گرایا یا اونچا کیا۔ اگر اہلِ بیتؑ کا درجہ، درجۂ اصحاب سے کم ہے تو پھر یہ کیا کہہ دیا اور کس فائدے کیلئے کہہ دیا۔ کیا سلمان کو گرا دیا؟ کوئی دانا یہ نہیں سمجھ سکتا کہ سلمان کو گرایا جا رہا ہے۔ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ بڑھایا جا رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اہلِ بیتؑ کا مقام بلند ہے صحابہ سے۔ اب تک تو صحابی ہی تھے، اب گرانقدر خطاب مل گیا۔

"مِنَّا اَھْلَ الْبَیْت"

یہ کہنا بھی بجا ہوگا کہ یہ تو فرمایا کہ ہم اہلِ بیتؑ سے ہیں۔ کون؟ سلمان۔ مگر یہ نہیں فرمایا کہ ہم اہلِ بیتؑ سلمان سے ہیں۔ سلمان کی تو معراج ہوگئی کہ وہ اہلِ بیتؑ سے ہیں۔ یہ تو سلمان کو بڑھانا ہے، حقیقت کو گرانا نہیں ہے۔ مگر کیا کہنا اس گھر کے بچوں کا کہ جملہ یہ اکہرا رہا ہے، دہرایا نہیں جا سکا، مگر کیا کہنا راکبِ دوشِ رسولؐ کا کہ سرکارؐ نے جب حسینؑ کا نام لیا تو جملے کو دہرا کر دیا کہ:

"حُسَیْنٌ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنَ الْحُسَیْنْ"

حسینؑ کا من الرسول ہونا، یہ حسینؑ کا شرف ہے اور رسولؐ کا من الحسینؑ ہونا، یہ رسولؐ کا شرف ہے۔ حسینؑ رسولؐ سے شرف پا بھی رہے ہیں اور یقیناً رسولؐ کا شرف بڑھا بھی رہے ہیں۔

کیا کہنا اُن ہستیوں کا جن کا ہر رخ دوسرے رخ کیلئے نور آفریں ہو۔ یہ چراغ ایسے ہیں باہم دگر کہ ہر چراغ کی روشنی دوسرے پر پڑ رہی ہے، گویا آئینوں میں یہ چراغ پلٹ پلٹ کر نظر آ رہا ہے۔ آیت ہے کہ:

'یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ'

سب سے پہلے میں ایک جملہ کہنا چاہتا ہوں کہ لفظِ منکم کو لفظِ اولی الامر سے متصل دیکھ کر لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ منکم کا لفظ صرف اولی الامر کے لفظ کیلئے ہے۔ یہ بنیادی غلطی ہے اور یہ عربی سے ناواقفیت کی بناء پر غلطی ہو رہی ہے۔ منکم کا لفظ صرف اولی الامر کیلئے نہیں ہے، منکم کا تعلق پورے جملے سے ہے اور آپ کو لطف آئیگا یہ دیکھ کر کہ قدرت نے اطیعوا اللہ کہہ کر اپنے لئے

جملے کو الگ رکھ دیا یعنی سب کی اطاعت کا حکم قدرت نے ایک لفظِ اطیعو سے نہیں دیا ہے۔ ورنہ آیت یوں ہوتی کہ:

"اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ"

اطیعو اللہ کہہ کر جملے کو بالکل الگ کر دیا۔ اس کے بعد جو اطیعو آتا ہے، اس میں رسول اور اولی الامر سب کو لیا۔ اگر درمیان میں لفظِ اطیعو دوبارہ نہ آتا اور ایک حکم ہوتا تو منکم اللہ کے بارے میں بھی ہو جاتا، رسول کے بارے میں ہو جاتا، اولی الامر کے بارے میں بھی ہو جاتا اور آیت کا ترجمہ یہ ہوتا کہ:

''تم ہی میں سے جو خدا ہے اُس کی اطاعت کرو، تم ہی میں سے جو رسول ہے، اُس کی اطاعت کرو، تم ہی میں سے جو اولی الامر ہیں، اُن کی اطاعت کرو''۔

تو اللہ بھی ہم ہی میں سے ہو جاتا۔ تو اللہ نے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا، اطیعو اللہ کو الگ رکھا۔ اور اصل میں یہ لفظِ منکم کیوں کہا؟ بات اصل میں یہ ہے کہ خداوند عالم نے ملائکہ کو بھی قرآن مجید میں جا بجا کُل کو نہ سہی، بعض کو رُسُل کہا ہے:

"رُسُلاً مِّنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ"..... "لَمَّا اَنْ جَآئَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا"

اور جنابِ مریم کے پاس جو فرشتہ آیا ہے، اُس نے کہا ''اِنَّمَا رَسُوْلُ رَبِّکِ'' میں اور کوئی آدمی نہیں ہوں، میں آپ کے رب کا ایک رسول ہوں، آپ گھبرائیں نہیں۔ تو رُسُل جو اصل میں رسول کی جمع ہے تو لفظِ رُسُل ملائکہ کیلئے بھی استعمال ہوتا رہا ہے قرآن مجید میں اور لفظِ امر بھی اُن کیلئے: "فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا"۔

فرشتوں کیلئے لفظِ امر بھی آیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ ملائکہ میں سے بھی رُسُل ہیں اور ملائکہ میں سے بھی اولی الامر ہیں۔ اس لئے خداوند عالم یہ بتانا چاہتا ہے کہ ملائکہ میں سے جو رُسُل ہیں، اُن کی اطاعت تم پر نہیں ہے، ملائکہ میں سے جو اولی الامر ہیں، اُن کی اطاعت تم پر نہیں ہے۔ تم پر تو اُسی رسول کی اطاعت ہے، اُنہی اولی الامر کی ہے جو شکل و صورت میں تم ہی جیسے ہیں۔

اس بناء پر لفظِ منکم پر زور دیا گیا ہے۔ میں ایک جملہ کہہ دوں وجدانی عالم میں کہ وہ رسول اور وہ اولی الامر جن کی اطاعت تک ہم پر واجب نہیں ہے، جب وہ تک معصوم ہوں تو پھر جس رسولؐ اور جن اولی الامر کی اطاعت ہم پر ہے، وہ کیسے معصوم ہوں گے جن کی شان قدرت کی نظر میں اتنی اونچی کہ ملائکہ کبھی دربان ہیں اُس گھر کے، کبھی آسیہ گردان اُس گھر کے، کبھی تسبیح خوان ہیں، کبھی گہوارہ جنبان۔ یہ میں اپنی کتابوں سے نہیں بیان کر رہا ہوں۔ ایک ایک لفظ میرا دوسری جانب سے آرہا ہے کہ کتنے واقعات ہیں ایسے۔

ایک بی بی بیان کر رہی ہے کہ میں خاتونِ جنت کی زیارت کیلئے گئی تو میں نے یہ دیکھا کہ خاتونِ جنت چکی کے پاس بیٹھی سو رہی ہیں۔ مگر میں نے یہ دیکھا کہ چکی خود بخود چل رہی ہے اور معصومہؑ کے دوسرے ہاتھ میں تسبیح ہے۔ اُس کے دانے برابر گردش میں ہیں اور پاس ہی حسینؑ کا جھولا ہے، برابر وہ اس طرح ہل رہا ہے کہ جیسے کوئی ہلانے والا اُسے ہلاتا جاتا ہو۔ وہ بی بی کہتی ہے کہ جب میں نے یہ واقعہ دیکھا تو میں حیرت زدہ ہوئی، حیرت زدہ ہو کر میں فوراً سرکارؐ رسالت کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آ کر کہا کہ سیدؐ عالم! میں یہ دیکھ کر آرہی ہوں، یہ کیا واقعہ ہے، معصومہ تو سو رہی ہیں اور چکی برابر چل رہی ہے، گہوارہ برابر ہل رہا ہے، تسبیح کے دانے برابر گردش کر رہے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ سرکارؐ رونے لگے اور گریاں ہوتے ہوئے سرکارؐ فرماتے ہیں کہ بات یہ ہے کہ میری بیٹی کا روزہ ہے اور روزہ بھی فاقوں میں رکھا ہے۔ تو میری بیٹی کا ایسا روزہ تھا، اب میری بیٹی پر جانفشانی تھی، ضعف غالب تھا، آٹا پیسنے بیٹھی تھیں۔ چاہتی تھیں کہ ایک ہاتھ سے آٹا پیستی رہوں، ایک ہاتھ سے تسبیح ہلاتی رہوں اور بار بار حسینؑ کا جھولا بھی ہلاتی رہوں۔ قدرت نے میری بیٹی کی تاب کو دیکھ کر، اُس کی اذیت کو دیکھ کر اس پر نیند غالب کر دی تاکہ کچھ دیر کو راحت مل جائے مگر قدرت نے یہ چاہا کہ سیدہؑ کے کسی کام میں خلل نہ پڑے۔ ایک فرشتے کو مؤکل کر دیا کہ وہ آسیہ گردانی کرے۔ دوسرے فرشتے کو معین کر دیا کہ وہ تسبیح خوانی کرتا رہے، تیسرے فرشتے کو معین کر دیا کہ وہ گہوارہ جنبانی کرتا رہے۔ سیدؐ عالم فرماتے ہیں کہ یہ ملائکہ بھی عام ملائکہ نہیں ہیں بلکہ یہ

ملائکہ مقربین ہیں۔ کسی خدمت پر جبرائیل مامور ہے، کسی پر اسرافیل مامور ہے، کسی پر میکائیل مامور ہے۔ یہ تینوں فرشتے یہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اسی لئے حضرات میں نے بیان کیا کہ وہ معصوم رسولؐ اور وہ معصوم اولی الامر جب اس بارگاہ کے دربان بھی ہیں، آسیہ گردان بھی ہیں، گہوارہ جنبان بھی ہیں، جب وہ بھی معصوم ہیں تو جس کے گھر کے خادم معصوم ہوں، اُن مخدوم حضراتؑ کی عصمت میں شک کرنا، دین میں شک کرنا ہے۔ سب سے پہلے حضرات میں نے یہ بیان کیا ہے کہ منکم کا تعلق پورے جملے سے نہیں ہے۔ یہ رسول اور اولی الامر کیلئے ہے۔ یہ صرف اس لئے ہے کہ اور جو رسول اور اولی الامر ہیں (مثلاً ملائکہ) اُن کی اطاعت تم پر نہیں ہے۔ اب بڑی پُر لطف بات یہ ہے کہ اس آیت میں جس جس کی اطاعت کا حکم دیا اور جس جس کا نام لیا، ہر نام پر قدرت نے ''ال'' داخل کیا ہے اور وہ اسم جو ''ال'' کے بغیر ہو، وہ نکرہ ہوتا ہے اور جب ''ال'' آجائے، وہ نکرہ نہیں رہتا، وہ معرفہ ہو جاتا ہے۔ میں اگر مثال میں یہ کہہ دوں کہ انگریزی زبان میں اگر کوئی یہ کہے کہ "go with any man" یہ نکرہ ہوگیا کہ کسی آدمی کے ساتھ جاؤ اور اگر "go with the man"، اب ہر ایک آدمی کا ذکر نہیں ہے تو یہ معرفہ ہوگیا۔ جو کام انگریزی میں "the" کرتا ہے، وہی کام عربی میں ''ال'' کرتا ہے۔ ''ال'' آگیا جس اسم پر وہ معرفہ ہے۔ چنانچہ جس جس کی اطاعت کا ذکر ہے آیت میں، ہر نام پر ''ال'' ہے۔ بیت اور چیز ہے، البیت اور چیز ہے، حمد اور چیز ہے، الحمد اور چیز ہے۔ اِلٰہ اور چیز ہے اور اللہ اور چیز ہے۔ لفظِ رسول اور ہے، الرسول اور۔ اب لفظِ امر اور ہے، الامر اور ہے۔ تینوں جگہ آیت میں ''ال'' موجود ہے۔ اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو۔ اگرچہ ہم ترجمے میں کہہ دیں لیکن آیت میں اطیعوا الرسول الرسول کی اطاعت کرو۔ ایک خاص نبی ہے۔ اُس ایک کا دوسرا نہیں ہے۔ اُس کی اطاعت کرو۔ الامر والوں کی اطاعت کرو۔ امر پر بھی ''ال'' داخل ہوا، اس لئے کہ عربی میں مضاف پر ''ال'' داخل نہیں ہو سکتا، اولی پر نہیں آسکتا تھا، وہ مضاف ہے، مضاف الیہ پر آسکتا ہے۔ الامر والوں کی اطاعت کرو، امر اور چیز ہے اور الامر اور چیز۔ البیت خدا کا گھر ہے۔ الحمد خدا کی حمد ہے تو

الامر اللہ کا امر ہے۔ جن کے پاس اللہ کا امر ہے، اُن کی اطاعت کرو۔ اللہ کا امر انہیں کے پاس ہوگا جنہیں اللہ نے دیا ہو۔ ہم نے جن کو امر دیا بھی ہے تو اُن کے پاس ہمارا امر ہے۔ اللہ کا امر اُن کے پاس نہیں اور شاید میرا یہ جملہ کارآمد ہو، امر کے معنی حضرات حکومت کے ہیں۔ اسی سے امیر بنتا ہے۔ امیر کے معنی دولتمند کے نہیں ہیں، امیر کے معنی حاکم کے ہیں۔ امیر المومنین، مومنین کا حاکم، امیر کے معنی حاکم کے ہیں۔ امر کے معنی حکم کے ہیں۔ الامر وہ امر ہے جو خدا کا دیا ہوا ہو۔ امر وہ امر ہے جو میرا اور آپ کا دیا ہوا ہو۔ جناب والا! جس کے پاس جس کی بھی دی ہوئی حکومت ہوگی، وہ حاکم دینے والے کی مرضی کے مطابق کام کریگا۔ اگر حکومت کسی کو عوام نے دی ہے تو وہ عوام کی مرضی کے مطابق کام کرے گا۔

"اَفَکُلَّمَا جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓی اَنْفُسُکُمُ اسْتَکْبَرْتُمْ"

''تم نے میرے انبیاء کی مخالفت صرف اسلئے کی کہ اُس کا حکم تمہاری خواہشوں کے مطابق نہیں تھا۔ جو تم چاہتے تھے، وہ انبیاء نہیں چاہتے تھے۔ جو انبیاء چاہتے تھے، وہ تم نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے کہ انبیاء وہ چاہتے تھے جو میں (اللہ) چاہتا تھا۔ انبیاء میری خواہش کے مطابق کہتے تھے، تمہاری خواہشیں نفسانی تھیں، وہ خلاف تھیں''۔

"بِمَا لَا تَهْوٰٓی اَنْفُسُکُمْ"

''میرے انبیاء کی ہدایت تمہاری خواہشوں کے خلاف ہوتی تھی، اس لئے تم دشمن ہوتے تھے''۔

"فَرِيْقًا کَذَّبْتُمْ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ"

''اس لئے تم نے انہیں جھٹلایا بھی اور انہیں تلوار کے گھاٹ بھی اتارا''۔

یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ جس کے پاس امر عوام کا ہوگا، وہ عوام کی خواہشوں کے مطابق چلے گا۔ جس کے پاس امر خداوند عالم کا دیا ہوا ہوگا، وہ اللہ کی مشیت پر چلے گا۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ جس کے پاس اللہ کا دیا ہوا امر ہوگا، وہ معصوم ہوگا۔ (صلوٰۃ)۔

میں چاہتا ہوں کہ آیت کو ذرا مفصل بیان کروں۔ چاہے ترجمہ ہی ہو۔ اس لئے کہ

آیت اتنی کھلی ہوئی ہے کہ ہر بات آپ پر فوراً کھلتی جائے گی۔ اطاعت کرو اللہ کی، الرسول کی اور الامر والوں کی اطاعت کرو۔ میرا باہوش مجمع میرے اس جملے کو ضائع نہ کردے کہ جب خطاب ہی "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا" کہہ کر ہورہا ہے، پکارا ان کو جارہا ہے جن کا کلمہ ہے "اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ، اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا الرَّسُوْلُ اللّٰہ"۔ عام لوگوں کو نہیں پکارا جارہا، "یَا اَیُّھَا النَّاس" تو نہیں کہا جارہا۔ ایمان والوں کو پکارا جارہا ہے جنہوں نے خدا کو خدا اور رسول کو رسول مان لیا ہے۔ ابھی تک انہیں خبر نہیں تھی کہ اللہ اور رسول کی اطاعت بھی ہم پر ہے، بے خبر تھے کیا وہ؟ بے خبر تھے تو ایمان نہیں تھا۔ ایمان تھا تو بے خبر نہیں تھے۔ میں یہ جملہ کہنا چاہتا ہوں کہ آیت کا اصل نصب العین جو ہے، وہ اولی الامر کی اطاعت کا حکم ہے۔ آیت کے نزول کا اصل مقصد ہے اولی الامر کی اطاعت کا حکم دینا۔ اللہ اور رسول نے تو اپنا نام پہلے تمہید کے طور پر لیا ہے۔ پیش خوانی ہے یہ، اور یہ بالکل ایسی تمہید ہے کہ جب سرکار کو منظور تھا کہ علیؑ کو مولا کہیں تو تمہید میں اپنا مولیٰ ہونا بیان کیا:

"مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ" "جس کا میں مولا علیؑ اُس کا مولا"۔

یا یوں کہیے کہ خداوند عالم کو رکوع میں دینے والے کی انگشتری کی دین دیکھ کر اُس کو ولی کہنا تھا۔ انگشتری نہ رسولؐ نے دی تھی، نہ کچھ خدا نے آیت نازل کی تھی۔ علیؑ نے انگشتری دی تھی۔ آیت کو شانِ علیؑ میں آنا تھا۔ ولی اصل میں انگشتری کے دینے والے کو کہنا تھا۔ قدرت نے تمہید قرار دی اپنے نام سے، اپنے رسولؐ کے نام سے فرمایا:

"اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَ الَّذِیْنَ آمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ"۔

آخر میں جس کیلئے آیت تھی، اُس کا ذکر کیا تا کہ دنیا گرا نہ سکے ولی کو۔ خداوند عالم سے زیادہ جاننے والا کون ہے، وہ جانتا ہے کہ علیؑ نام دیا ہے میں نے، پھر بھی دنیا گرائے گی، ولی کہنا چاہتا ہوں، اگر تنہا آیت نے علیؑ کو ولی کہا، لوگ گرا دیں گے، کہیں گے کہ ولی ہونے میں کوئی خاص بات نہیں ہے، یہ کوئی بڑا عہدہ نہیں ہے۔ مگر قدرت نے اپنا نام لے کر مہریں لگا دیں۔ اب اگر کسی

کے منہ سے یہ بات نکلی کہ ولی ہونے سے کیا ہوتا ہے تو آیت یہ بڑھ کر کہے گی کہ ولی ہونے سے خدا ہوتا ہے، ولی ہونے سے رسول ہوتا ہے۔ قدرت دراصل چاہتی ہے کہ پہلے لفظِ ولی کو معراج تو دیدے۔ ایسی معراج دے جو کوئی گرا نہ سکے۔ سادہ لفظوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ خدا کو اگر کوئی نبی کہہ دے تو منکرِ خدا ہو گیا، منکرِ خدا ہوا تو کافر ہو گیا، اور قیامت ہے اور حد بندی کی انتہا ہے کہ خدا کو نبی کہہ دو تو کافر اور علیؑ کو نبی کہہ دو تو بھی کافر۔ دائرہ اتنا تنگ ہے کہ بس نبی ہی کو نبی کہو، نہ اِدھر جاؤ، نہ اُدھر جاؤ۔ لفظِ نبی کا دائرہ اتنا تنگ ہے کہ نہ بال برابر اِدھر بڑھ سکتا ہے اور نہ بال برابر اُدھر بڑھ سکتا ہے۔ خدا جانے لفظِ ولی میں کتنی گنجائش ہے۔

"اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ"

جو رکوع میں زکوٰۃ دے رہا ہے، وہ بھی ولی ہے۔ تو مجھے بجا طور پر یہ کہنے کا حق ہے کہ جو خدا کو نبی کہے، وہ کافر اور جو خدا کو ولی نہ کہے، وہ کافر۔ معلوم ہوا کہ لفظِ ولی اتنا اونچا لفظ ہے کہ خدا کیلئے بولا جائے تو خدا کی تنقیص نہیں، نبی کیلئے بولا جائے تو صاحبِ معراج کی تنقیص نہیں، علیؑ کیلئے بولا جائے تو وہ تو ہمنامِ خدا ہیں۔ اصل میں تو آپ نے علیؑ کو ولی کہنا تھا مگر قدرت نے اپنا ذکر بطورِ تمہید کیا۔

ایک عجیب سا تخیل ہے اور تخیلِ صادق ہے۔ میں آپ سے نہیں کہنا چاہتا، سرکارؐ سے عرض کر رہا ہوں کہ سرکار آپؐ نے سب سے پہلے پوچھا تھا مجمع سے:

"اَلَسْتُ اَوْلٰی بِکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ"

"تمہاری جانوں پر تصرف کا حق تم سے زیادہ میں نہیں رکھتا؟"

یعنی کیا میں تم سب کا مولیٰ نہیں؟ سرکارِؐ دو عالم نے پوچھا تھا اور جب پوچھا تھا تو سارے مجمع نے کہا: "بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہ"، اور واقعی جب ایک لاکھ سے زیادہ مجمع مل کر بلٰی کہے تو سارا جنگل گونج اٹھا ہوگا۔ مگر کسی نے دل سے کہا، کسی نے بلا ٹالنے کیلئے۔ یہ بلا کا وقت پر ٹال دینا بھی خدا جانے انسان نے کس سے سیکھا۔ شیطان کو میں موردِ الزام نہیں ٹھہراؤں گا۔ اُس نے تو

بلا خریدی، منکر تھا، انکار کرتا رہا۔ اس نے بلیٰ نہیں کہا۔ صاف کہہ دیا کہ میں کیوں سجدہ کروں، میں بوڑھیا ہوں، یہ گھٹیا۔ مگر یہ ضمیر فروشی انسان کے حصے میں آئی ہے کہ چہرہ تو اترا ہوا ہے، دل پر کچھ بیت رہی ہے، بلیٰ بھی کہہ دیا اور ساری بات سننے کے بعد مبارکباد بھی دیدی۔ سرکارؐ جب آپ کے اس سوال پر کہ کیا میں تم سب کا مولیٰ نہیں ہوں، جب بھی نے آپ کے سوال کے جواب پر بلیٰ کہا اور سب سے آپؐ نے اقرار لے لیا تو جملہ یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ "جس کا میں مولیٰ"، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ تم سب کا میں مولیٰ، تم سب کا علیؑ مولیٰ۔ جب سب ہی نے اقرار کرلیا، میں سوچتا ہوں کہ یہ بات کس طرف کو جارہی ہے۔ جس کا میں مولیٰ، "یہ جس" سے کیا مطلب ہے؟ "یہ جس" کی شرط کیا ہے؟ جب سارا مجمع آپؐ کے سامنے تسلیم کر چکا۔ ثابت کا یہ لفظ کہنا ثابت کر رہا ہے کہ کہا تم سب نے ہے، مانا بظاہر تم سب نے ہے، مگر میں تم سب کا ماننا نہیں مانتا۔ حقیقتاً جس نے مجھے دل وجان سے مولیٰ مانا ہے، اُس کا علیؑ مولیٰ ہے۔

اب فوراً حل ہو گیا حضرات کہ رسولؐ کو دل سے مولیٰ کس نے مانا۔ جب یہ دیکھنا ہو کہ رسولؐ کو مولیٰ دل سے کس نے مانا تو رسولؐ کے ماننے کو نہ دیکھئے، علیؑ کے ماننے کو دیکھئے۔

جس نے علیؑ کو مولیٰ مانا، رسولؐ کو تو اُس نے مولیٰ مانا۔ حضرات! خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جس کو وہ امر دیدیتا ہے، جس کو خدا صاحب الامر قرار دیدیتا ہے اور جن ہستیوں کو وہ اولی الامر قرار دیدیتا ہے تو خدا ہی جانتا ہے کہ اُن ہستیوں کی حکومت کہاں کہاں ہوگی، کیسی کچھ اُن کی حکومت ہوتی ہے۔ کس کس شے پر اُن کی حکومت ہوتی ہے۔ جس کو خدا امر دیدے، اُس امیر کا کیا کہنا، پھر وہ ایسا حاکم ہوتا ہے کہ اگر آفتاب کو اشارہ کردے، ڈوبتا ہوا آفتاب اچھل آئے، چاند کو اشارہ کردے، دو ٹکڑے ہو جائے، نحوست نجم پر اگر نظر کرلے تو نحوست سعادت سے بدل جائے، ہلتی ہوئی زمین سے اگر کہہ دے تو فوراً ٹھہر جائے۔ ارض وسماء پر اُس کی حکومت ہے۔ برو بحر پر اُس کی حکومت ہے۔ ملائکہ تابع فرمان ہیں۔

"یَا حَارِثَ هَمْدَانَ مَنْ یَمُتْ یَرَنِیْ"

سرکارِ ولایت ارشاد فرماتے ہیں کہ "اے حارث ہمدان! جو مرے گا، مجھے دیکھ کر مرے گا۔ مرنے والا کوئی مر نہیں سکتا جب تک مجھے نہ دیکھ لے۔ جب تک میں نہ پہنچ جاؤں، روح کسی کے بدن سے نکل نہیں سکتی"۔ "مومن ہو، کافر ہو، کسے باشد"۔

جب تک میں نہ پہنچ جاؤں گا، ملک الموت اپنا عمل نہیں کریگا۔ کیا کہنا اس حکومت الٰہیہ کا۔ مومن کی بالین پر پہنچتے ہیں، بشارتِ جنت دیتے ہیں۔ میرے پردادا مرحوم کا پرانہ زمانہ تھا، ایک سلام ہے۔ مجھے یاد آیا، عنایت علی نام تھا، فرماتے ہیں:

خدایا کب مجھے طاقت ثنا کی — میری ہر التجا تو نے ادا کی
عنایت کی فقط ہے یہ تمنا — نہ رہ جائے طبیعت اس کی شاکی
بوقتِ واپسی دیکھوں علیؑ کو — زیارت ہو مجھے مشکل کشا کی

کہا ہے کسی کہنے والے نے کہ بالینِ میت آئے ہیں قبر میں مولی، تو بڑی مدت کے ارمان قبر کے اندر نکلتے ہیں۔ مگر حضرات قبر تو بہت بعد کی چیز ہے، دنیا سے اٹھ ہی نہیں سکتا محبِ آلِ محمد جب تک کہ زیارتِ مولی نہ میسر ہو۔ ملک الموت تابع فرمان ہیں امرِ الٰہی کے۔ امیر کل ہیں، امامِ انس والجن ہیں۔

مومن ہوگا تو بشارت مجھ (علیؑ) سے سن کر مرے گا۔ کافر ہوگا تو وعیدِ جہنم کی خبر پا کر مرے گا۔ ہر ایک کی بالین پر پہنچنا، خیال میں آتا ہے وہ ہر ایک کی بالین پر پہنچتے ہیں۔ ایک خیال آ گیا انصارِ حسینؑ کا، وہ انصار تھے ہی نصرت کیلئے، روایات میں آیا ہے کہ جب سب فدا ہو چکے، انصار بھی، اقرباء بھی، کوئی نہ رہا اور وہ وقت آ گیا کہ:

نہ لشکر رہے نہ سپاہ ہے نہ کثرت الناس ہے
نہ قاسمؑ نہ علی اکبرؑ نہ عباسؑ ہے

اور اکبر کا کیا ذکر ہے، یہ اس وقت کا ذکر ہے کہ جب اصغر بھی نہیں ہیں۔ اصغر بھی شہید ہو چکے، دفن بھی ہو چکے۔ پیوندِ خاک بھی ہو چکے۔ واقعات یہ بتاتے ہیں کہ ننھی سی لحد پر امام

کھڑے تھے اور بازوئے امامؑ سے ابھی خون ٹپک رہا تھا کیونکہ تیرِ حرملہ نے گلوئے اصغر اور بازوئے امامِ عالی مقام کو ساتھ ساتھ زخمی کیا تھا۔ سر جھکائے ہوئے ننھی سی لحد اصغر پر امام کھڑے تھے کہ اچانک کسی آنیوالے نے آکر امام کو سلام کیا۔ امامؑ نے سر اٹھا کر سلام کرنے والے کو دیکھا اور دیکھ کر یہ جملہ فرمایا کہ کون ہے اے بھائی جو اس عالمِ غربت میں مجھے سلام کر رہا ہے۔ جب سے میرے انصار مجھ سے بچھڑے ہیں، میں نے کسی کے سلام کے آواز نہیں سنی۔ میرے سلام کرنے والے تو چل بسے، اب تو کون ہے جو مجھے سلام کر رہا ہے؟ اُس نے کہا کہ میں نے آپ کو مسلمان سمجھا، مسلمان سمجھ کر میں نے آپ کو سلام کیا اور آپ کو دور سے دیکھ کر میں نے یہ تصور قائم کر لیا کہ اس سے زیادہ دنیا میں کوئی مظلوم نہ ہوگا اور چونکہ مظلوم کی دعا مستجاب ہوتی ہے، اس لئے میرے دل میں خیال آیا کہ اس مظلوم کے پاس جا کر اپنی تمنا کیلئے دعا کا خواستگار ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے حق میں دعا کیجئے۔ اللہ اللہ امامؑ نے اُس کی طرف دیکھ کر پوچھا کہ تیری حاجت کیا ہے؟ اُس نے کہا کہ میں شہنشاہِ نجف کی زیارت کے شوق میں نکلا ہوں، مگر اس صحرا میں گزرتے ہی میرے دل میں کچھ یاس پیدا ہوگئی۔ ایک عجیب غم کی لہریں میرے دل پر چھا گئیں۔ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ قریب آنے کے باوجود بھی میری یہ تمنا شاید پوری نہ ہو۔ آپ دعا کریں کہ جس تمنا اور آرزو کیلئے میں نے یہ سفر طے کیا ہے، آرزو میری پوری ہو کہ شہنشاہِ نجف کی زیارت مجھے نصیب ہو۔ امامِ عالی مقام نے دعا فرمائی کہ پروردگار! اسے علیؑ کی زیارت نصیب ہو۔ یہ دعا کی آپؑ نے اور وہ مسافر جب چلنے لگا تو تشنہ کام نے پکار کر اتنا کہا کہ اگر روضۂ شہنشاہِ نجف پر پہنچنا ہو تو کہنا کہ ایک مظلوم کو صحرائے غربت میں چھوڑ آیا ہوں۔ اُس نے یہ التجا کی ہے کہ وہ وقت قریب آگیا ہے کہ خنجرِ ظلم میرے گلے پر چلے۔ اتنا چاہتا ہوں کہ اس وقت میرا سر آپ کی گود میں ہو۔ بس امام کا یہ کہنا تھا کہ وہ چلتا ہوا مسافر پھر واپس آیا۔ اُس نے کہا کہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ آپ علیؑ سے قرابت رکھتے ہیں۔ آپ کی اتنی خواہش ہے کہ میرا سر علیؑ کی گود میں ہو، بتایئے تو کہ آپؑ کون ہیں؟ امامؑ نے فرمایا کہ بھائی اس تجسس میں نہ پڑ، میرے بہت سے نام ہو گئے ہیں اس غربت میں،

غریب کربلا بھی ہوں، بے وطن بھی ہوں، بے کس بھی ہوں، بے بس بھی ہوں، میرا نام نہ پوچھ۔ میں جانتا ہوں کہ تیری جدائی سے تیری بچی وطن میں دن رات روتی ہے اور تیرے انتظار میں رہتی ہے۔ اگر میں نے اپنا نام بتا دیا تو اس بچی کی آس ہمیشہ کیلئے ٹوٹ جائے گی۔ یہ سننا تھا کہ اُس نے گھبرا کر کہا:

ہر شے کا علم آپ کو اس بیکسی میں ہے
یہ وصف تو امامؑ میں ہے یا نبیؐ میں ہے

خدا کیلئے بتایئے کہ آپ کون ہیں؟ امامؑ نے سر جھکا لیا۔

یہ تو نہ کہہ سکے شہِ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

مسافر کہتا ہے کہ:

میں تو یہ جانتا تھا کہ حضرت وطن میں ہیں
یہ کیا خبر تھی مجھ کو کہ آفت کے بن میں ہیں

یہ کیا گزر گئی آپ پر، یہ قبر کس کی ہے، فرماتے ہیں آپؑ کہ یہ میرے ششماہے کی قبر ہے۔ اے نجف کے مسافر! دیکھ میرا سب کنبہ یہ زمین پر پڑا ہے۔ یہ لاشِ اکبر ہے، یہ لاشِ قاسم ہے، یہ لاشِ عباس ہے۔ اب یہ سننا تھا کہ زائرِ نجف نے تمنا کی کہ آقا مجھے بھی اجازت دیجئے۔ شہدائے کربلا کی فہرست میں میرا بھی نام آجائے۔ یہ آخری جانثار ہے مظلومِ کربلا کا۔ قسمت نے اسے راستہ دیا۔ سعادت عطا کی۔ اب اس کے بعد میں کس زبان سے کہوں کہ وہ وقت آ گیا کہ راکبِ دوشِ رسول گھوڑے پر ڈگمگا رہے ہیں۔ ایک آخری تیر تھا جو قلبِ انور پر لگا۔ تیر بھاری اتنا تھا کہ سامنے لگا ہے اور امامؑ نے اس کو پشت کی طرف سے کھینچا ہے۔ تیر کھینچتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ:

بِسمِ اللهِ و بِاللهِ وَ عَلٰی مِلَّتِ رَسُولِ الله

پانچویں

مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"قَدْ جَآءَ کُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ کِتَابٌ مُّبِیْن"۔ (صلوٰۃ)۔

قرآن مجید کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اے انسان تیری رہنمائی کیلئے آیا ہے اللہ کی طرف سے نور و کتاب مبین۔ ایک نور ہے اور ایک کتاب روشن ہے۔ لفظ نور الگ استعمال کیا، لفظ کتاب الگ استعمال کیا تا کہ سننے والا اس ترتیب بیان کو سن کر یہ خیال نہ کرے کہ نور کتاب کو کہا گیا ہے۔ ایک نور ہے اور ایک کتاب مبین ہے۔ ان دو کو ہم نے تیری ہدایت کیلئے بھیجا۔ کہہ کہہ کر ہدایت کرنا کتاب کا کام اور کہنے کے ساتھ عمل کر کے دکھانا اور راہرو کے ساتھ ساتھ چل کر راستہ بتانا یہ نور کا کام۔

پھر حضرات اگر آیت میں یہ ترتیب انسان کی قائم کی ہوئی ہوتی تو میں سمجھ سکتا کہ انسانوں نے اکثر صحیح ترتیب کو بدلا ہے اور غلط ترتیب قائم کر دی۔ اول کو آخر کر دیا، آخر کو اول کر دیا۔ جگہ بدل دینا انسان کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ مگر آیت نے جو ترتیب قائم کی ہے وہ ترتیب انسانی نہیں، یزدانی ترتیب ہے۔ اُس نے لفظ نور پہلے کہا اور لفظ کتاب بعد میں۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ نور کو اولیت ہے، کتاب کو بعدیت ہے۔ نور پہلے ہے، کتاب اُس کے بعد ہے اور نور پہلے نہ ہوتا تو کتاب آتی کس پر؟ نور منزل ہے اور کتاب نازل ہے۔ ایک منزل اگر جائے تو پھر نور ہی کی کوئی منزل ہو کہ جس کے سہارے سے یہ نازل ٹھہرے اور رہے۔ یہ کتاب وہ کتاب ہے کہ جس کی حقیقی منزل نور کے سوا اور کوئی شے نہیں ہو سکتی۔ اگر کتاب کو رہنا ہے اور مالک کو منظور ہے کہ وہ کتاب کو قیامت تک رکھے تو ضروری ہے کہ وہ نور کو بھی منزل کتاب قرار دیکر قیامت تک قائم رکھے۔

تمہارے پاس اے انسان دو چیزیں پہنچیں اللہ کی جانب سے۔ ایک نور ہے اور ایک

کتابِ مبین ہے۔

حضرات! یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ انسان اس دنیا میں کھانے اور پینے اور عیش وعشرت سے زندگی گزارنے کیلئے نہیں آیا۔ بھیجنے والے نے یہاں انسان کو عیش وعشرت کیلئے، خورد ونوش کیلئے، اکل وشرب کیلئے نہیں بھیجا، اُس (خدا) نے انسان پر ایک بہترین امانت کا بار رکھا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ انسانی اقدار کو انتہائی بلندیوں تک پہنچائے۔ انسان کی معراج یہ کیا کچھ کم ہے کہ خداوند عالم نے ہر چیز پیدا کی انسان کیلئے مگر انسان کو پیدا کیا اپنے ذکر وفکر کیلئے۔ کچھ زبان سے کہے تو ذکر قرار پائے، کچھ دل سے کہے تو فکر قرار پائے، انسان کو اپنے لئے پیدا کیا۔ اپنی اطاعت کیلئے پیدا کیا۔ اپنی فرمانبرداری کیلئے پیدا کیا اور صریح لفظوں میں یہ کیوں نہ کہوں کہ انسان کو یہ چند روزہ زندگی خدا نے یہ مہلت عطا کی ہے کہ جس مہلت میں انسان اپنی آخرت کی زندگی کو بنا سکے اور وہاں کے انعام واکرام کا اپنے آپ کو مستحق قرار دے سکے۔ اس لئے کہ دنیا اور آخرت میں جو فرق بیّن ہے اور جو واقعی امتیاز ہے، وہ یہ ہے کہ یہاں عطا کرنے والے کا عطا کرنا اپنی مصلحت کی بنا پر ہے، یہاں وہ استحقاق دیکھے بنا دیتا ہے، یہاں کی دین کیلئے استحقاق کوئی معیار نہیں ہے، اس لئے کہ خداوند عالم نے اس جہان کو جہانِ عطا قرار دیا۔ عطا کا لفظ ہی یہ بتلا رہا ہے کہ استحقاق کے معیار پر نہیں دے رہا ہے بلکہ اپنی مصلحت کے معیار پر دیتا ہے، بغیر مانگے دیتا ہے، بغیر شعور کے دیتا ہے، مانگنا آتا نہ تھا اور وہ دے رہا تھا، مانگنے کا شعور نہ تھا اور وہ دے رہا تھا۔ سب سے بڑی دین تو اُس کی یہ ہے کہ اُس نے معدوم کو موجود کر دیا۔

جنابِ امیر علیہ السلام سے جب سرکارِ دو عالم نے سوال کیا، دوسروں سے بھی سوالات کیے ہیں کہ اللہ کی بہترین نعمات کو بیان کرو تو فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ ہر ایک نے اللہ کی نعمتوں کو اپنے ظرف کے مطابق اور اپنی نظر کے مطابق بیان کرنا شروع کیا۔ مگر سرکارِ دو عالم نے کسی کے بیان کو پسند نہیں فرمایا۔ پھر امیر المومنینؑ سے ارشاد ہوا کہ بہترین نعماتِ خدا کو بیان کرو تو آپ نے سلسلۂ نعماتِ الٰہیہ کو جب بیان کرنا شروع کیا تو سب سے پہلے یہ ذکر فرمایا کہ اللہ کی

معدوم کو موجود بنایا

بہترین نعمت یہ ہے کہ اُس نے ہمیں پردۂ عدم سے شہودِ وجود میں زینتِ وجود عطا کی۔

"لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَذْكُورًا"۔

"کچھ بھی نہ تھا، خداوندِ عالم نے ہمیں وجود عطا کیا"۔

معدوم کو موجود قرار دیا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اُس کے بعد اللہ کی بہترین نعمت یہ ہے کہ اُس نے ہمیں شجر نہ بنایا، حجر نہ بنایا، بے شعور نہ قرار دیا، بہائم اور حیوانات میں سے نہ قرار دیا بلکہ شرفِ انسانیت عطا کیا۔ اُس نے ہمیں جامۂ انسانیت پہنایا اور بصورتِ انسانیت پیدا کیا۔ اگر وہ چاہتا تو درخت بنا دیتا، پتھر بنا دیتا، حیوان بنا دیتا، بے شعور بنا دیتا! مگر خداوندِ عالم نے ہمیں اشرف مخلوق قرار دیا۔ اس کے بعد بہت سی چیزیں امام علیہ السلام نے بیان فرمائی ہیں۔ من جملہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ اللہ کی رحمت ہے اور اُس کی تائید کی شمولیت ہے کہ اُس نے اپنے دین سے ہمیں منحرف قرار نہ دیا اور اپنے آپ کا نہ پہچاننے والا قرار نہ دیا بلکہ وہ صلاحیتیں عطا کیں کہ ہم نے اُسے پہچانا اور پہچان کر اُسے مانا۔ پورا سلسلہ آپ نے بیان فرمایا ہے اور اُس کے بعد آیت پڑھ دی:

"وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا"۔

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ خداوندِ عالم نے یہ چار دن کی زندگی کھانے کھیلنے کیلئے عطا نہیں کی۔ اوقات کو ضائع کرنے کیلئے نہیں دی۔

"أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا"۔

"کیا تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بس یونہی مقصد کے بغیر پیدا کر دیا ہے"۔

"وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ"۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں نہیں دیکھنا ہے کہ تم ہماری بارگاہ میں کیا لیکر آئے ہو"۔

حضرات! یہ زندگی اصل میں اُس زندگی کو بنانے کیلئے، اُس زندگی کو سنوارنے کیلئے عطا کی گئی ہے۔

''وَمَا تُقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا''۔

''جوتم اس زندگی میں اُس زندگی کیلئے پہلے سے کر کے بھیج دو گے، اپنا بھیجا ہوا سرمایہ تم خدا کے پاس جا کر پالو گے''۔

اور یہ نہیں کہ جتنا تم نے بھیجا ہو، اتنا ہی پاؤ گے بلکہ اُس سے کہیں بہتر پاؤ گے۔ اُس سے کہیں زیادہ پاؤ گے اور اجر کے اعتبار سے اُسے بہت ہی عظیم پاؤ گے۔ بھیجا اس لئے ہے کہ ہم یہاں رہ کر کچھ وہاں کیلئے اپنے جانے سے پہلے بھیجتے رہیں اور اس زندگی میں اپنی اُس زندگی کو کامیاب، ہموار اور موجب فلاح قرار دیئے جائیں۔

انصاف کی نظر سے دیکھ کر بتایئے کہ جب یہ پوری حیات ہی اس لئے ہو کہ ہم حیات آخرت کو سنواریں اور وہاں کیلئے لیل و نہار کرتے رہیں۔ یہ زندگی وہاں کی زندگی کا سبب بن جائے۔ کتنا قیمتی ہوتا ہے مزارع کے لئے وہ وقت جو اُس کو تخم ریزی کیلئے ملتا ہے۔ اگر وہ وقت اُس نے غفلت میں گزار دیا تو اُسے کیا ملے گا؟ وہ فصل کاٹنے کے لئے اتنا بے چین نہیں ہوتا جتنا بونے کیلئے بے چین ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جانتا ہے کہ بوئے بغیر مجھے کچھ ملنے والا نہیں۔ یہاں مجھے یہ جملہ کہنا ہے کہ جب یہ زندگی ہی اُس نے اس لئے عطا کی کہ ہم اس زندگی میں کارہائے آخرت انجام دیں۔

تو جناب والا! جب کارہائے دنیا جو زندگی کی خاطر ہیں، جب دنیا کے کام روشنی کے بغیر انجام نہیں پاتے اور ذرا سا اندھیرا ہو جاتا ہے تو ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں، لکھنے والا لکھ نہیں سکتا، سینے والا سی نہیں سکتا، بلکہ اندھیرے اور ظلمت میں کچھ ایسی تاثیر ہے کہ ہم مجلس سن رہے ہیں، کان ہیں جو کہ سن رہے ہیں، آنکھیں تو نہیں سنتیں اور میری زبان ہے جو بول رہی ہے، آنکھیں تو نہیں بولتیں۔ میرا کام زبان سے کچھ کہنا ہے اور آپ کا کام کان سے کچھ سننا ہے۔ لیکن اگر رات کی مجلس ہو اور دفعتاً اندھیرا ہو جائے، نہ میں کہنے کے لائق رہوں گا اور نہ آپ سننے کے

لائق رہیں گے حالانکہ میرے کہنے میں اندھیرا مانع کب ہے؟ اور آپ کے سننے میں اندھیرا مانع کب ہے؟ کان کھلے ہوئے ہیں آپ کے اندھیرے میں بھی! میری زبان کہہ سکتی ہے اندھیرے میں بھی! لیکن حضرات اندھیرا خود موجب وحشت ہے۔ اگر روشنی کسی کام کیلئے ضروری نہ بھی ہو، تو کم سے کم اطمینانِ دل کیلئے روشنی درکار ہے۔ اندھیرے میں اضطراب پیدا ہو جاتا ہے، وحشت پیدا ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ روشنی جگاتی ہے اور اندھیرا اسلاتا ہے۔ جب دنیا کے یہ چار دن کے کام روشنی کے بغیر نہ چل سکیں اور نہ کئے جا سکیں تو جناب والا آخرت کے کام اور اُس آخرت کے کام جسے دیکھا تک نہیں! اندھیرا ہو بھی جائے اس دنیا میں گھر کے رخ کو دیکھے ہوئے ہیں، جس راستے پر چلتے ہیں اُس کو دیکھے ہوئے ہیں۔ دیدہ چیزیں دیدہ ہونے کے باوجود ہم اُن پر اطمینان سے گامزن نہیں ہو سکتے تو وہ ملکِ کبیر، وہ ملکِ آخرت جسے کبھی دیکھا نہیں، سنا نہیں، کام اُس کا اگر وہیں جا کر کرنا ہوتا تو پھر ہم دنیا کے کاروبار پوری توجہ سے اس اطمینان پر کرتے کہ وہاں کا کام ہم وہاں جا کر کریں گے۔ مگر لطف یہ ہے کہ وہاں کا کام وہاں جا کر ہم نہیں کر سکتے! اس لئے کہ یہ عالم تو عطائے خدا ہے اور وہ عالم جزائے خدا ہے۔ وہاں جا کر کئے کا بدلہ پانا ہے۔ وہاں کیلئے جو کرنا ہے، وہ بھی یہیں کیجئے! یہاں کیلئے جو کرنا ہے، وہ بھی یہیں کیجئے! دونوں جہان کے کام ہمیں اسی ایک جہان میں انجام دینا ہیں! تو جب دونوں جہان کے کام ہمیں اس جہان میں انجام دینا ہیں تو دونوں جہانوں کے کاموں کیلئے ہمارے پاس روشنی ہونی چاہئے۔ اس جہان کیلئے بھی کوئی روشنی ہو جس روشنی میں ہم اس جہان کے کام کر سکیں اور چونکہ اس جہان کا کام بھی یہیں کرنا ہے وہاں کیلئے روشنی ہمیں یہاں کی روشنیوں سے زیادہ درکار ہے۔ اُس کیلئے عظیم روشنی چاہئے تو خداوند عالم کی رحمت سے یہ بات بعید تھی کہ وہ یہاں کے کاروبار کیلئے تو آفتاب کا قمقمہ بنائے اور ماہتاب کی شمع روشن کرے اور ستاروں کی قندیلیں روشن کرے تاکہ یہ دنیا روشن رہے، اس روشنی میں انسان اپنے کاروبار انجام دے سکے۔ جب مقصد اُس کا یہ ہے کہ ہم وہاں کے کام بھی یہیں رہ

کر کریں، کوئی روشنی ضروری ہے ایسی یا نہیں کہ جس روشنی کی مدد سے ہم وہاں کا کام صحیح کریں، الٹ پلٹ نہ کردیں۔ ذرا سا بھی اندھیرا اگر چھا جائے تو ہاتھ کو بھی کام کرنے کی عادت ہے، لکھنے کی بھی عادت ہے، مگر ذرا لکھئے تو اندھیرے میں، الٹ پلٹ لکھیں گے۔ یعنی انگل پچھ نہ کچھ ہونے کے باوجود آپ صحیح کام نہیں کرسکتے اندھیرے میں۔

تو جس روش کو کبھی دیکھا ہی نہیں وہاں کا کام اندھیرے میں۔ یہ تو خداوند عالم کی قدرت اور شان ہے کہ وہ نقاشیاں اندھیرے میں کرے اور اس دعوے کے ساتھ کرے کہ ہزاروں لاکھوں، کروڑوں، اربوں شکلیں بناؤں گا اور اندھیرے میں بناؤں گا اور میرا دعویٰ یہ ہے کہ ہر شکل بے مثل ہوگی۔ یہ شان تو اسی رب ذوالجلال کی ہے۔ ہم اندھیرے میں کیا کریں؟ اس لئے کتنا ضروری ہے کہ کارِ دنیا کیلئے اگر کوئی آفتاب ہو تو کارِ آخرت کیلئے بھی کوئی آفتاب ہو! اگر دنیا کے کاموں کیلئے کوئی چاند ہو تو وہاں کے کاموں کیلئے بھی کوئی روشن چاند ہو! اگر یہاں کیلئے ستارے ہوں تو وہاں (آخرت) کی راہ کو روشن کرنے کیلئے بھی ستارے ہوں۔ مجھے یاد آرہا ہے اور میں فخر و مسرت اور اطمینان سے آپ کو سنانا چاہتا ہوں کہ امام محمد باقر علیہ السلام، جب یہ آیت آپ کے سامنے کسی نے پڑھی:

"فَاٰمِنُوْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَنُوْرِ الَّذِیْ اَنْزَلْنَا"۔

"تم ایمان لاؤ اللہ پر بھی اور اللہ کے رسولؐ پر بھی اور اُس نور پر بھی جسے ہم نے نازل کیا"۔

تینوں لفظ ہیں نا۔ اللہ اکبر۔ جب خداوند عالم ایمان کا مطالبہ کرے کہ خدا کو مانو، رسول کو مانو، ماننا تو اصل میں خاموشی میں ہوتا ہے، ماننے میں کوئی شور نہیں کرتا کیونکہ دل مانتا ہے اور دل زبان نہیں رکھتا۔ مگر یہ قانونِ قدرت ہے کہ جب انسان کسی کو مانتا ہے تو مانتا دل ہے اور اُس کا ظہور زبان سے ہوتا ہے۔ زبان ظاہر کرتی ہے اور ظاہر کرنا حضرات اتنا ضروری ہے۔

مجھے ذرا انصاف سے بتایئے کہ جب نمازی نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو وہ نماز میں کونسی

ایسی بات کہتا ہے جو پہلے سے اُس کے دل میں نہیں ہوتی جس کو وہ پہلے سے مانتا ہوا نہیں ہوتا۔ کوئی بات نمازی نئی کہتا ہے؟ مانی ہوئی باتوں کو خداوند عالم چاہتا ہے کہ بار بار زبان پر آئیں۔ آخر کوئی مصلحت یا کوئی فلسفہ ہے۔ الحمد، ایک نمازی بھی مانتا ہے کہ الحمد للہ رب العالمین اور ایک بے نمازی مسلمان بھی آخر یہی مانتا ہے۔ الحمد للہ رب العالمین ماننے میں تو کوئی فرق نہیں ہے۔ الرحمٰن وہ بھی مانتا ہے جو نماز نہیں پڑھتا۔ ماننے میں تو کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر فرق ہو تو پھر وہ مسلمان نہیں ہے۔ مگر خداوند عالم چاہتا ہے کہ مانی ہوئی باتیں زبان پر بار بار آتی رہیں۔ اس لئے کہ زبان کا اظہار دلی عقائد کے استحکام کا خود بخود موجب ہے۔ جو بات زبان پر آتی رہے گی اور اظہار میں آتی رہے گی، پس اظہار سے دل کے نقش ابھریں گے، مٹیں گے نہیں۔ قوی ہوں گے، کمزور نہیں پڑیں گے۔ جو بات تم مانتے ہو، اُسے کہا بھی تو کرو۔ اُس کا اظہار بھی تو کرو۔ اس لئے کہ جن چیزوں کا اظہار نہیں ہوگا اور انہیں تم خاموشی کے پردے میں رکھتے رہو گے، وہ نقوش دھندلے ہوتے رہیں گے۔

کیا نئی بات کہتے ہیں رکوع میں ہم؟ سبحان ہے، تو رب ہے، تو عظیم ہے! تو سجدے میں کیا کہتے ہیں؟ سبحان ہے تو، رب ہے تو، اعلیٰ ہے تو! کیا نئی بات کہتے ہیں؟ کہنے کی کیا بات ہے؟ یہ تو ہمارا دل ہر وقت ہی مانتا ہے۔ مگر نہیں کوئی بات ہے ضرور کہنے کی کہ جو مانو وہ کہو۔ جسے مانو، اُس کا ماننا بیان بھی کرو اور جسے نہ مانو اُس کا نہ ماننا بھی بیان کرو۔ اظہار محبت بھی ہوتا رہے اور اظہار نفرت بھی ہوتا رہے۔ اگر اظہار نفرت نہیں ہوگا تو مضمون محبت محفوظ نہیں رہیگا اور وہ محبت صحیح نہیں قرار پاسکے گی۔ اُس محبت کی بقا کی ضمانت وہ نفرت ہے۔ وہ نفرت جو ہے وہ عمارت محبت کا پشت بان پشتہ ہے۔

میں اگر یہ لفظ کہتا ہوا آگے بڑھوں تو بے جا نہیں ہوگا کہ لکھے پڑھے ہر مذہب میں ہوتے ہیں، عقلمند بھی ہوتے ہیں، بحث مباحثے بھی کرتے ہیں، بہکانے والے بہکاتے رہتے ہیں۔ ہمارے افراد میں جو مذہبی پختگی ہے، مخصوص پختگی کہ ہمارا آدمی بدل جائے اور کچھ سے کچھ

ہو جائے، عموماً یہ نہیں دیکھا جاتا۔ آپ نام بتائیں کہ ہمارا کوئی عالم معاذ اللہ آج یہ تھا، کل وہ ہو گیا۔ برخلاف اس کے دوسری طرف معاملہ بالکل مختلف ہے۔ میرا خیال ہے کافی ہے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ اس استحکام کا سبب کیا ہے؟ ہماری تولیٰ کو جو شے محفوظ رکھتی ہے، وہ نفرت ہے اعدائے دین سے، وہ نفرت ہے اہلِ باطل سے، وہ نفرت جو سمائی ہوئی ہے اور رچی ہوئی ہے، تو کب اب یہ ممکن ہے کہ جن پر ہم برسوں نفرین کر چکے ہوں، اب ہم اُن کے شیدائی ہو جائیں؟ اب ہم اُن کے فدائی ہو جائیں؟ یہ ضمانتِ بقائے ایمان اور ضمانتِ بقائے ولائے آلِ محمدؐ، یہ اعدائے محمدؐ وآلِ محمدؐ سے نفرت اور بیزاری ہے۔

غرضیکہ حضرات! میں یہ کہہ رہا تھا کہ خداوند عالم ہر اُس بات کو جو دل میں ہو، چاہے بصورتِ محبت ہو یا بصورتِ نفرت ہو، خداوند عالم چاہتا ہے کہ اُس کا اظہار ہوتا رہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی تبدیلی آئی ہے تو وہ انہی مجبوریوں سے آئی ہے کہ کسی مجبوری سے بات کو چھپایا گیا۔ زیادہ اظہار کا موقع نہیں ملا۔ شروع شروع میں تو دل میں پختگی تھی مگر حالاتِ زمانہ نے مجبور کیا کہ اظہار نہ کیا جا سکے، اظہار اُس کے خلاف کرنا پڑا اور اُس پر نسلوں کا عمل درآمد چلتا رہا اور رشدہ شدہ انقلاب پیدا ہو گیا اور آگے کی نسلیں یہ سمجھنے لگیں کہ ہمارے بزرگوں کا دین یہی تھا۔

چنانچہ بت پرستی کے بارے میں کہتا ہوں کہ یہ چلی کیسے اور اس کی بنیاد کیسے پڑی۔ تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں لوگوں نے اپنے پیشواؤں کی تصویریں بحیثیت یادگار اپنے گھروں میں رکھیں۔ جیسے آج بھی ہم اپنے گھروں میں اپنے دادا پردادا کی تصویریں یادگار کے طور پر رکھتے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ابتداء میں جو تصویریں بنتی تھیں تو اتنی ہنرمندی نہیں تھی کہ وہ رنگ آمیزی سے بنائی جائیں۔ ابتداء کی تصویریں جو ہوتی تھیں، مجسمے ہوتے تھے، جسم کی شکل میں ہوتے تھے، اُن کو رکھا جاتا تھا کہ بزرگوں کی ہیں۔ پیشوا بھی ہیں اُس میں، اولیا بھی ہیں اس میں، کسی کی یاد میں یہ تصویر ہے، کسی کی یاد میں وہ تصویر ہے، اور ظاہر ہے جب بزرگوں کی وہ تصویریں ہیں احترام کی نظر سے اُن کو صبح شام دیکھا جاتا ہے۔ مگر ابتداء میں علم ہے کہ یہ ہمارے

بزرگوں کی یادگاریں ہیں۔اس پر نسلیں چلتی رہیں اور نسلیں چلتی رہیں تو پھر کبھی یہ خیال پیدا ہونے لگا اور لوگ یہ سمجھنے لگے کہ ہمارے بڑے اصل میں انہی کی پرستش کرتے تھے، انہی کی پوجا کرتے تھے۔بس اس چیز نے پرستشِ غیرِ خدا، پرستشِ اصنام شروع کر دی۔ایک آپ نے جملہ سنا ہوگا، میں اُس کو بیان نہیں کرنا چاہتا۔بہرحال یہ پتا چلتا ہے کہ بہت سی تصویریں اچھے بڑے بڑے معقول افراد کی تھیں، بڑے بڑے متبرک افراد کی تھیں۔ظاہر ہے کہ متبرک اُس حیثیت میں ہیں کہ خدا نہیں ہیں۔اسی دھوکے میں دنیا پڑ گئی.......اور آج میری زبان پر یہ بات آرہی ہے کہ آپ نے کبھی نظر فرمائی ہے اس پر کہ خداوند عالم نے اس کائنات کو ایک مستحکم نظام کے تحت خلق کیا۔

جس نظام میں ہم ہیں یہ نظامِ شمسی کہلاتا ہے اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ ایک ایسا نظام ہے (اندازہ ہے کہ) ہر شے کرۂ شمس کا طواف کر رہی ہے، آفتاب کے گرد گھوم رہی ہے، زمین بھی گھوم رہی ہے، چاند بھی گھوم رہا ہے، پورا نظام اس آفتاب کا طواف کر رہا ہے۔یہ نظامِ شمسی کہلاتا ہے۔اس شمس کی یہ عظمت دیکھ کر ہر چیز اُس کے گرد چکر لگاتی ہے یا قربان ہوتی ہے یا گھوم رہی ہے یا طواف کر رہی ہے۔اس عظمت کو دیکھ کر کتنی دنیا آفتاب پرست ہوگئی کہ بس جو کچھ بھی ہے، یہ ہے۔

آفتاب کی پرستش کرنے لگی۔اب ذرا اسلام کا قدمِ احتیاط دیکھئے کہ پانچ نمازیں جو خدا نے ہم پر فرض قرار دی ہیں اور اُن نمازوں کے جو اوقات مقرر کیے ہیں، یہ اوقات کتنی احتیاط سے مقرر کیے گئے ہیں۔خداوند عالم تو ہر لمحہ لائقِ عبادت ہے۔اُس کیلئے تو کوئی وقت مقرر نہیں ہے کہ اس وقت وہ لائقِ عبادت ہو اور گھنٹہ بھر کے بعد وہ کچھ اور ہو گیا۔مگر خداوند عالم نے عروجِ آفتاب سے ان پانچ نمازوں میں سے ہر نماز کو الگ رکھا۔صبح کی نماز میں نمازی یہ دیکھتے ہیں کہ کہیں سورج نکل تو نہیں آیا۔یہ نماز کب تک ہے؟ جب تک سورج نہ نکلے۔طلوعِ آفتاب ہوا اور وقتِ نماز ختم۔حالانکہ خدا کی احدیت عبادت تو بدستور ہے۔اب اگر کوئی نماز پڑھے بھی تو اس شرط سے کہ وہ قضا کی نیت کرے، نماز تو بالکل وہی رہی، قضا نماز وہی تو ہے، بالکل وہی، ترتیب اجزاء تو وہی رہے، بالکل اُسی طرح پڑھے گا لیکن اگر ادا کی نیت سے پڑھے گا تو نماز باطل۔یہ کیا

ہو رہا ہے؟ قضا کی نیت کرنا شرط ہے۔ قضا کی نیت کے معنی یہ ہیں کہ اب اگر نمازی نماز پڑھے تو یہ طے کر کے پڑھے کہ یہ اس وقت کی نماز نہیں ہے۔ یہ اُس وقت کی ہے جب سورج نہیں تھا۔ اُس کے بعد اب سورج نکل آیا تو ظاہر ہے کہ آفتاب کے دو حصے قرار پائیں گے۔

کسی کی ایک طرح سے بسر ہوئی نہ انیس

عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

ایک وقت آفتاب کے کمال کا ہے اور دوسرا وقت آفتاب کے زوال کا ہے۔ شریعت کا اقتضاء یہ ہے کہ جب تک یہ کمال میں رہے، کوئی نماز نہیں ہے، پانچوں نمازوں میں سے کوئی نماز نہیں ہے۔ یہ وہ عبادت ہے جو جزوِ دین ہے، فرضِ عین ہے۔ اب تم نماز ادا کرنے کیلئے زوال کا انتظار کرو۔ خداوند عالم نے کتنا احتیاط کا پہلو ملحوظ رکھا ہے کہ اگر کمالِ آفتاب کے وقت نمازیں رکھی جائیں، حالانکہ اُس وقت بھی خدا لائقِ عبادت ہے تو دنیا کو کہیں یہ دھوکا نہ لگ جائے کہ اس میں احترامِ آفتاب کی بھی شمولیت ہے۔ اب نماز کب ہوگی، دیکھتے رہیں کہ زوال ہوا یا نہیں"۔ جب زوال کا انتظار کرو گے تو لفظِ زوال خود بتائے گا کہ اس میں آفتاب کی کوئی رعایت نہیں۔ اس میں آفتاب کے احترام کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ اگر ہم احترام کی شائبہ رکھتے ہوتے تو کمال کے وقت پڑھتے! مگر ہم تو زوال دیکھ کر پڑھتے ہیں، تو جب ہم اس (سورج) کے زوال کے قائل ہیں تو ہماری یہ عبادت لازوال خدائے لازوال کے لئے ہے۔ کمالِ آفتاب میں، عروجِ آفتاب میں پنجگانہ نمازوں میں سے کوئی نماز نہیں رکھی، یا طلوعِ آفتاب سے پہلے ہے اور یا زوالِ آفتاب کی شرط پر اور یا پھر غروبِ آفتاب۔ خداوند عالم نے ہمیں گمراہیوں سے بچانے کے تمام ذرائع اختیار کئے کہ بھولی بھالی میری دنیا اور یہ سادہ انسان کہیں بھٹک نہ جائیں۔ (صلوٰۃ)۔

امام باقر علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ آیت میں جو ہے کہ:

"فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا"۔

"ایمان لاؤ تم اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر اور اُس نور پر جسے ہم نے نازل کیا"۔ ظاہر

ہے کلماتِ آیت خود بتا رہے ہیں کہ نور یہاں قدرت نے نہ اپنی ذات کو کہا، نہ نور یہاں قدرت نے ذاتِ رسول کو کہا۔ "وَرَسُوْلِہٖ" خود آپ کا "وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا" اللہ اور رسولؐ کے بعد اس لفظ کا آنا اور واوٴ عطف کے ساتھ آنا بتاتا ہے کہ اللہ اور رسولؐ کے نام کے علاوہ بھی کوئی شے ہے کہ جس کو ماننا ہے۔ امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ واللہ واللہ کہ اس نور سے مراد ہم آئمہ اہلِ بیتؑ ہیں۔ ہماری پہلی فرد علی مرتضٰی کی ہے۔ اگر صرف اُن کا نام لیا جائے تو کافی ہے۔ ورنہ لفظ نور سے مراد ہر امام ہے اور امام علیہ السلام نے یہ جملہ کتنا بجا فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ وہ آفتاب جو دائرۂ نصف النہار میں ہو وہ اتنی روشنی نہیں دے سکتا جتنی روشنی دینے والے ہم ہیں، اس لئے کہ آفتاب نصف النہار کی روشنی کتنی تیز سہی مگر یہ دلِ مومن کو روشن نہیں کر سکتی۔ اس کی شعاعیں دلِ مومن تک نہیں پہنچ سکتیں۔ قلبِ مومن تک جو شعاعیں پہنچتی ہیں وہ ہمارے ہی نور کی شعاعیں ہیں۔ وہ ہمارا نور ہے جو دلِ مومن کو روشن کرتا ہے اور ایک دلِ مومن ہی کو روشن نہیں کرتا، میں تو صاف کہوں گا کہ قرآن بھی اگر پُرنور ہے تو انہیؑ کی بدولت ہے ورنہ بحرِ ظلمات کے موتی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو انہیں چھوڑ کر قرآن کو دیکھتا ہے وہ قرآنی مقصد تک نہیں پہنچ پاتا۔ وہ اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا ہے اور اسی لئے قرآن نے کہا کہ:

"یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّ یَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا"۔

"اس قرآن کے ہوتے ہوئے بہت سے لوگ اس کی وجہ سے بھٹک جاتے ہیں"۔

مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ صادقِ آلِ محمد علیہ السلام کا زمانہ۔ بڑا قابل ایک آدمی کفر کی راہ پر چلنے والا۔ بڑا ادیب، بڑا ذہین۔ اُس نے ایک کتاب مکمل لکھ دی جس میں اُس نے یہ ثابت کیا کہ قرآن میں تضاد ہے۔ ایک بات یہاں کہی، دوسری بات وہاں اُس کے خلاف کہی کہ قرآن میں تضاد ہے اور اعلانیہ طور پر اُس نے ثابت کر کے رکھ دیا کہ قرآن کی آیتیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں اور متضاد ہیں۔ وہ کتاب مرتب ہوگئی۔

امام کا ایک ادنیٰ شاگرد کوئی جب اُس کے سامنے سے گزرا۔ اُس نے بلایا اور بلا کر کہا

کہ میں نے تمہارا چراغ بجھا دیا۔ میں نے ایسی کتاب لکھ دی ہے کہ جب وہ منظر عام پر آئے گی تو حقیقت کھل جائے گی کہ تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔ جب قرآن ہی غلط ہے تو پھر نبوت کیسی اور امامت کیسی اور وہ دین کیسا؟

اُس نے وہ کتاب کہیں کہیں سے انہیں (شاگردِ امامؑ) کو سنائی۔ یہ بھی گھبرا گئے اور آج بھی ہمارے کتنے لوگ اس قسم کی چیزوں کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں۔ خیر یہ گھبرا گئے اور گھبرائے ہوئے امام علیہ السلام کی خدمت میں جب حاضر ہوئے تو ردِ قرآن جو کتاب تھی اُس شخص کی، اُس کا ذکر کیا اور اُس کے کچھ مضامین بھی ممکن ہے کہ کچھ سنائے ہوں جو انہوں نے سنے تھے۔ اپنی اضطراب اور گھبراہٹ کا بھی ذکر کیا۔

امام علیہ السلام اپنی جگہ مطمئن۔ آپؑ نے کمالِ اطمینان سے ایک جملہ فرمایا۔ سب نہیں قدر کر سکتے اس جملے کی، اس لئے کہ ہنر مند کی بات کو ہنر مند پہچانتا ہے۔ امام علیہ السلام نے اپنے اُس ادنیٰ شاگرد سے ارشاد فرمایا کہ اب جب بھی اس سے ملنا ہو، اتنا پوچھنا کہ جہاں جہاں جس جس لفظ کے جو معنی سمجھ کر قرآنی تضاد تم نے ثابت کیا ہے وہاں اُس لفظ کے معنی اور بھی کچھ ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ جو لفظ تم نے نظر میں رکھ کر تضاد ثابت کیا ہے وہاں اُس لفظ کے اُس کے بدلے کچھ اور معنی ہو سکتے ہیں یا نہیں۔

میرا خیال تو یہ ہے شاگرد نے بھی کیا قدر کی ہوگی اس جملے کی جیسی قدر ہونی چاہئے تھی۔ پھر جب شاگردِ امامؑ اُس شخص سے ملا اور اُس نے پھر اپنا راگ الاپنا شروع کر دیا کیونکہ جب کوئی شخص محنت کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ مجھے ہر طرف سے داد ملے یا میرا رعب قائم ہو۔ اُس نے پھر وہی ذکر کیا۔ ان کو امامؑ بتا ہی چکے تھے کہ یہ پوچھ لینا۔ انہوں نے یہ کہا کہ بھئی جہاں جہاں جس جس لفظ کے جو جو معنی سمجھ کر تضاد ثابت کیا ہے اور تردید کی ہے قرآن کی، وہاں اُس لفظ کے معنی کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ بڑی سادگی سے اُس نے یہ جملہ کہہ دیا۔

اُس (مصنف) نے ان کے منہ کو دیکھا اور کہا کہ یہ بتلاؤ کہ یہ جملہ تم نے خود کہا ہے یا

تمہیں یہ کسی نے بتایا ہے اور تم سے کس نے کہلوایا ہے؟ یہ تمہاری اپنی بات ہے یا کسی اور کی بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ میں ہی کہہ رہا ہوں تم سے۔ اس نے کہا کہ غلط، یہ بات تمہارے ذہن کی نہیں ہے۔ ایسی اونچی بات تمہارے امامؑ کی کہی ہوئی ہے۔ انہوں نے پوچھا کیسی اونچی بات؟ اُس نے کہا کہ یہ ایسی اونچی بات ہے کہ میری کتاب ملیامیٹ ہوگئی، میری کتاب ہی ملیامیٹ ہو گئی۔ یہ کہہ کر اُس نے وہ کتاب منگوا کر ان کے سامنے پرزہ پرزہ کر دی کہ اب کچھ نہیں رہا اس میں۔ اُس نے بیان کیا کہ اگر یہ کہوں کہ وہاں اُس معنی کے سوا دوسرے معنی نہیں ہو سکتے تو مجھ سا کوئی جاہل نہیں، جہالت کا ثبوت ہوگا یہ اور اگر یہ کہوں کہ وہاں اور بھی دوسرے معنی ہو سکتے ہیں تو حضرات یہ منطق کا اصول ہے کہ:

''اذاجاء الاحتمال بطل الاستدلال''۔

''جب کسی شے کا احتمال موجود ہے کہ یہ معنی ہیں یا وہ پھر وہ استدلال کے لائق نہیں ہے''۔

ہمیشہ دلیل وہ چیز ہوتی ہے جو اپنی جگہ محتاج دلیل نہ ہو۔ جب وہ شے ہی محتاج دلیل ہے تو وہ دلیل کب رہی۔ اُس نے کہا کہ اس جملے نے میری ساری کتاب کا ستیاناس کر دیا۔ میری کتاب اب کچھ نہ رہی۔ یہ جملہ اتنا بھاری ہے۔ یہ بات تمہارے امامؑ کی کہی ہوئی ہے۔ وہ شخص امام کہہ رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وارث قرآن کی کہی ہوئی ہے۔ قرآن لاوارث نہیں ہے۔ قرآن پُر نور ہے۔ اسی نور کی بدولت، ورنہ ہم قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے۔ آج بحمد للہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود ہم نے خدا کا ہاتھ ہی اس قرآن میں دیکھا۔ ید اللہ بھی ملتا ہے، یداہ مبسوطتان اس قرآن میں ملتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہاں اس لفظ کے معنی یہ ہیں۔ ہر بات کا ایک مفہوم ہوتا ہے۔ ہر جگہ ایک معنی ہوتے ہیں۔

اللہ اکبر! دنیا نے کوئی قدر نہیں کی اس حضرات کی، جو زبانیں معرفت کے دریا جاری کرنے والی تھیں، وہ زبانیں خشک ہو گئیں۔ جن لبوں پر ذکرِ خدا رہتا تھا، ابواب معرفت جن لبوں

پر آتے رہتے تھے، جن سینوں میں علم قرآن کے خزانے تھے بلکہ حقیقت قرآن تھی وہ نیزوں سے چھلنی ہو گئے۔ دنیا نے کتنی مخالفت کی ہے اور مجھے بیمار کربلا کا وہ جملہ یاد آتا ہے۔ کتنا حسرت ناک جملہ ہے بیمار کربلا کا کہ اللہ نے ہماری محبت کا حکم دیا تھا تب تو ہم پر یہ ظلم کیے گئے۔

اب میں یہ سوچتا ہوں کہ امامؑ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ ہم سے دشمنی کرنے کا حکم دیتا تو یہ لوگ اور کیا کرتے؟ کوئی ظلم باقی نہیں رکھا۔ یاد آتا ہے مجھے اور کہنے کو دل چاہتا ہے کہ شہیدوں کو دفن نہیں کرنا تھا تو نہ کرتے۔ شہید کرنے کے بعد لاشوں کو چھوڑ دیتے۔ کوئی نہ کوئی آتا، کبھی نہ کبھی آتا، شہیدوں کی لاشوں کو دفن کر دیتا۔ مگر قیامت ہے کہ شہید کرنے پر بھی ان کا دل ٹھنڈا نہ ہوا، صبر نہ آیا۔ اب یہ گھوڑوں کی نعل بندی کیوں ہو رہی ہے۔ اب کس سے لڑنا ہے۔ جناب فضہ آئی ہیں، شہزادی سے کہتی ہیں۔ کنیز اپنے آپ کو کنیز سمجھتی ہے۔ شاہزادی کو شاہزادی سمجھتی ہے۔ کہتی ہیں شاہزادی میں یہ دیکھ کر آئی ہوں کہ گھوڑوں کی نعل بندی ہو رہی ہے۔

اللہ اللہ۔ بہن نے یہ سنا، سمجھ گئیں کہ یہ پامالی لاشہ ہائے شہداء کا سامان ہو رہا ہے۔ فریاد ابھی کر چکی تھیں بھائی کی شہادت کے وقت، مگر کس نے سنا تھا۔ بہن فریاد کرتی رہ گئی تھی۔ بھائی کا سر نیزے پر پہنچ گیا تھا۔ اب پھر زینبؑ فریادی ہو کر نکلی ہیں۔ خدا جانے کس کس طرح فریاد کرتی رہ گئیں۔ مگر گھوڑے جو اُدھر کھڑے تھے، اِدھر پہنچ گئے، جو اِدھر کھڑے تھے اُدھر پہنچ گئے۔

الا لعنۃ اللہ علی القوم الظالمین۔

چھٹی مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ"۔ (مائدہ:۵)

خداوند عالم حرفِ تاکید کی تاکیدی حیثیت سے ارشاد فرمارہا ہے کہ "یقیناً پہنچ گیا تمہارے پاس اللہ کی جانب سے ایک نور اور ایک کتاب مبین"۔ سب سے بڑی عظمت ان آنے والوں کیلئے جو ہے، وہ یہ ہے کہ یہ دونوں من اللہ ہیں۔ اللہ کی جانب سے ہیں اور یہ سب سے عظیم شے ہے۔ خداوند عالم نے اسی بناء پر "نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ" کے بعد من اللہ نہیں کہا۔ عربی قواعد میں یہ بات آتی ہے جار مجرور، یہ متعلق لفظ اصل کلام کے بعد آیا کرتے ہیں۔ مگر آیت نے یہاں آنے والوں کے ذکر سے پہلے یہ بتانا چاہا ہے کہ یہ آنے والے کہاں سے آئے۔ زور دیا جارہا ہے اس پر کہ سننے والو! یہ سن لو کہ آئے کہاں سے ہیں؟ کس کی جانب سے آئے ہیں؟ اللہ کی جانب سے آئے ہیں۔ ایک نور ہے اور ایک کتاب مبین ہے۔ حضرات! چیز جہاں سے آتی ہے، وہاں کے آثار اپنے ساتھ لیکر آتی ہے۔ گرد و غبار سے ہو کر آتی ہے تو گرد آلود ہو کر آتی ہے۔ خوشبوؤں سے گزر کر آئے گا تو خوشبودار ہو کر آئے گا۔ کثافتوں سے گزر کر آئے گا تو کثافت کے آثار ساتھ لائے گا۔ جہاں سے چیز آتی ہے، وہاں کے آثار ساتھ لائے گی۔ جہاں سے چیز آتی ہے، وہاں کے آثار وہاں کے حالات، وہاں کی صفات اپنے ساتھ لیکر آتی ہے۔ جو اللہ کی جانب سے آئیگا، وہ الٰہی صفات لیکر آئیگا، وہ الٰہی کمالات لیکر آئے گا، وہ شانِ الٰہیت لیکر آئیگا اور واقعاً اگر اس پر خدا ہونے کا دھوکا ہو جائے تو وجہ تو ہے۔ (صلوٰۃ)۔

آپ حضرات دیکھتے ہیں اور روزِ روشن کی طرح دیکھتے ہیں کہ نور بھی آیا تو اللہ کی طرف سے اور کتاب مبین بھی آئی تو اللہ کی جانب سے۔ لفظِ من اللہ دونوں ہی کیلئے ہے۔ جس اللہ کے یہاں سے آئے ہیں، اُس کے بے مثل ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ بے مثل کے یہاں سے جو

آئے، بے مثل ہو کر آئے اور شانِ بے مثلی بار بار خداوند عالم خود بیان کرتا ہے:

"فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ"

"اگر تم میں دم ہو تو قرآن کی سورتوں میں سے تم لے آؤ کسی سورت کی مثل"۔

اور سورۂ بنی اسرائیل آیت: ۸۸ میں فرمایا:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۔

"اگر انس و جن بھی جمع ہو کر یہ چاہیں کہ اس قرآن کی مثل لے آئیں تو اس کی مثل نہیں لا سکتے۔ ایک دوسرے کی مدد کیلئے مہیا ہو جائیں"۔ (سب مل کر کام کرنا چاہیں کہ مثل لے آئیں، نہیں لا سکتے)۔

جو بے مثل کی طرف سے آتے ہیں وہ بے مثل قرار پاتے ہیں، عالم میں اُن کی کوئی مثال نہیں۔ میں یہاں "یہ لفظ کہے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا کہ اگر قرآن کتاب خدا ہو کر بے مثل ہے، حالانکہ کتاب کے الفاظ مخلوقِ خالق نہیں ہیں۔ تمام تر وہی الفاظ ہیں جو پہلے سے موجود تھے۔ قرآن نے نئے لفظوں کی ایجاد نہیں کی۔ صرف اُس کے ہاتھوں اور اُس کے اہتمام کے تحت ترتیب قائم ہوئی ہے۔ انہیں مستعمل لفظوں کو جب خداوند عالم اپنی ترتیب میں پیش کرتا ہے تو عالمِ کائنات میں یہ طاقت نہیں ہوتی کہ اُس کی مثال لا سکیں۔ سمجھ رہے ہوں گے آپ حضرات کہ وہی عینؑ ہے جو عربی زبان میں ہے، وہی علیؑ ہے جو عربی زبان میں ہے، وہی لفظ کل ہے، وہی لفظ قدیر ہے۔ کوئی نئے لفظ قرآن نے ایجاد نہیں کئے۔ صرف ترتیب ہے جو قدرت نے اپنے انداز کیلئے مخصوص کی ہے۔ یہاں کی چیزیں جب خدا کی ترتیب میں آجائیں تو معجزہ ہیں اور بے مثل ہیں تو اُس نور کا کیا کہنا جسے خدا نور بھی کہے، مِنَ اللّٰہ بھی کہے اور اُس نور کا خالق بھی وہی ہو، ایجاد اُس (خدا) نے کیا ہو، پیدا اُسی نے کیا ہو، وہ نور کیسا ہوگا!

واہ

آج میں یہ رخ پیش کرنا چاہتا ہوں سب سے پہلے یہ لفظ کہنا چاہتا ہوں کہ نور بھی اللہ

کی طرف سے، تو اسی لئے اُسے نور اللہ کہا گیا۔ کتاب بھی اللہ کی طرف سے، اُس کا نام کتاب اللہ قرار پایا۔ دونوں کی نسبت ذاتِ خداوندی سے ہے۔ وہ خدا کی کتاب ہے، یہ اللہ کا نور ہے۔ جو خدا کی کتاب ہے، وہ کلام اللہ ہے اور جب نور کا ذکر آپ اسی کتاب میں دیکھیں گے تو قرآن اگر کلام اللہ ہے، یہ نور کے افراد کلمات اللہ ہیں۔ شاید اس لفظ کو سن کر آپ متعجب اور حیران ہوئے ہوں کہ یہ بولتے ہوئے افراد کلمات اللہ کیسے؟ ان کو کلمات اللہ کیسے کہہ دیا؟ میں نہیں کہہ رہا۔ آیات پر نظر ڈالیے گا خداوند عالم ان ہستیوں کو اپنا بول کہتا ہے۔ یہ میرا کلمہ ہیں اور وجہ تسمیہ بالکل ظاہر ہے۔ اپنے دل کی بات جب ہم آپ کے دل میں ڈالنا چاہیں، اگر چپ بیٹھے رہیں تو ہم نہیں ڈال سکتے۔ اپنے دل کی بات آپ کے دل میں پہنچانا کتنا مشکل مرحلہ ہے۔ کتنا مشکل ترین مرحلہ ہے کہ جو میرے دل میں ہو وہ آپ کے دل میں پہنچے۔ کوئی رابطہ نہیں، کوئی راستہ نہیں۔ دل کی بات دوسرے کے دل میں داخل کرنا کتنا مشکل ہے۔ مگر حضرات کتنا آسان ہو جاتا ہے، بول اٹھوں۔ بول کر اپنے دل کی بات آپ تک پہنچا رہا ہوں۔ آپ اپنے دل کی بات بول کر دوسرے کے دل میں ڈال رہے ہیں۔ اب آپ کے دل میں تھی وہ بات، دوسرے کے دل میں نہ تھی، پہنچ گئی آپ تک لفظوں کے ذریعے سے۔ جس طرح ہم اپنی بات دوسرے تک اپنے لفظوں سے پہنچاتے ہیں، اسی طرح خداوند عالم نے بھی اپنی باتیں جن کے ذریعے سے ہم تک پہنچائیں اور وہ خدا کی بات کے پہنچانے کا ذریعہ قرار پائے تو وہ کلمات اللہ ہیں۔ ہم نے بھی کلمات ہی کے ذریعے سے اپنی بات دوسرے تک پہنچائی، خداوند عالم نے جن کے ذریعے سے اپنی بات پہنچائی، وہ اُن کو اپنے کلمات کے نام سے تعبیر کرتا ہے کہ یہ میرے کلمات ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں کتنی آیات ہیں اس مفہوم کو ظاہر کرنے کیلئے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

"يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ"

"اے مریم! اللہ تمہیں خوشخبری (بشارت) دیتا ہے ایک کلمہ کی جس کا نام مسیح ہے"۔ وہ توریت کو اپنا کلمہ نہیں کہہ رہا، انجیل کو نہیں، زبور کو نہیں، کسی ملفوظی کتاب کو نہیں، مریم تمہیں اللہ

بشارت دیتا ہے اپنے ایک کلمہ کی جس کا نام مسیح ہے۔ دوسرے مقام پر فرماتا ہے:

"اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَ کَلِمَتُہٗ"

"مسیح کون ہیں، وہ عیسیٰ ابن مریم ہیں، رسول ہیں اللہ کے اور اللہ کا کلمہ ہیں"۔

صاف صاف جناب عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ اپنا کلمہ ارشاد فرما رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تخصیص انہی کی ذات کی نہیں ہے۔ ذرا سورۂ تحریم کی آخری آیت پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ یہ مسئلہ واضح ہو جائیگا کہ خداوند عالم جن کو اپنی پیغام رسانی کیلئے متعین کرتا ہے، ان کو اپنے کلمات کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ سورۂ تحریم کی آخری آیت جنابِ مریم ہی کے بارے میں ہے۔ اُن کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے۔

"وَ مَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا وَ نَفَخْنَا فِیْہِ مِنْ رُّوْحِنَا"

اس کے بعد ارشاد فرماتا ہے:

"صَدَّقَتْ بِکَلِمٰتِ رَبِّھَا"

"مریم یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے کلمات کو مانا"۔ جنہوں نے اپنے رب کے کلمات کی تصدیق کی۔ آپ کہیں گے کہ ہو سکتا ہے کہ خدا نے اپنی کتابوں کا ذکر کیا ہو کہ مریم نے اللہ کی کتابوں کو مانا۔ پھر ذرا آیت کو سنئے گا کہ:

"صَدَّقَتْ بِکَلِمٰتِ رَبِّھَا وَ کُتُبِہٖ وَ کَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ"

"انہوں نے اپنے رب کے کلمات کو بھی مانا اور اپنے رب کی کتابوں کو بھی مانا۔ وہ عبادت گزاروں میں ہیں، فرمانبرداروں میں ہیں"۔

لطف یہ ہے کہ یہاں انبیاء کے ماننے کا ذکر الگ نہیں ہے۔ کتابوں کو بھی مانا اور اپنے رب کے کلمات کو بھی مانا، یہاں کلماتِ رب سے مراد انبیاء ہی تو ہیں۔ انبیائے خدا کو بھی مانا۔ خداوند عالم بے جان لفظوں کو اپنا کلمہ نہیں کہتا بلکہ بولتے ہوئے وہ انسان جو اللہ کے پیغام کے پہنچانے والے ہیں، خداوند عالم انہیں اپنے کلمات کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ سورۂ لقمان کی آیت

۲۷ جس میں ارشاد فرمایا جاتا ہے:

''روئے زمین پر جتنے اشجار ہیں سب سے قلم بنالئے جائیں، جتنے دریا ہیں، وہ سب سیاہی ہو جائیں اور ایسے ایسے سات دریا اور بہیں اور روشنائی کا کام دیں، مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللّٰهِ، تب بھی اللہ کے کلمات کا احصاء نہیں ہو سکتا۔'' اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کلمات اللہ کیا ہیں، معنی کیا ہیں، تعبیر کیا ہے؟ آئمہ اہلِ بیت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی متواتر آوازیں کلمات اللہ ہیں۔ ہمارے فضائل کا، ہمارے مناقب کا شمار نہیں ہو سکتا۔ آپ اندازہ تو کریں ان کے فضائل کا اور اُن فضائل میں سے خاص طور پر اُن فضائل کا کیسے احصاء ہو سکتا ہے جن کیلئے خدا یہ کہے کہ:

"وَكُلُّ شَيْءٍ اَحْصَيْنَاهُ فِيْ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ"

''ہم نے امامِ مبین میں ہر شے کا احصاء کر دیا''۔

خداوند عالم یہ فرماتا ہے اور پوچھنے والے سرکارِ رسالت سے پوچھتے ہیں کہ سرکارؐ امامِ مبین سے مراد توریت ہے؟ فرماتے ہیں ''نہیں''۔ انجیل ہے؟ ''نہیں''۔ سوال ہو ہی رہا تھا کہ قدرت نے امامِ مبین کو بھیج دیا۔ جب آپؑ تشریف لائے تو آپؐ نے فرمایا کہ:

"اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْاِمَامُ الْمُبِيْنُ"

اب لفظ کل کو دیکھ کر مجھے یاد آتا ہے کہ خداوند عالم اپنی ذات کیلئے فرمائے:

"اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"

اور امامِ مبین کیلئے فرمائے کہ:

"وَكُلُّ شَيْءٍ اَحْصَيْنَاهُ فِيْ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ"

کتنا کچھ ملایا ہے قدرت نے اپنے صفات سے انؑ کے صفات کو کہ اپنے لئے ارشاد فرماتا ہے:

"يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتَابِ"

''خدا جسے چاہے مٹادے اور جسے چاہے قائم کر دے۔ (محو اور اثبات اُسی کے ہاتھ

میں ہے")۔

"وَعِندَہٗ اُمُّ الْکِتَاب"

"اور اصلِ کتاب تو اُسی کے پاس ہے"۔

یہ اپنا ذکر کر رہا ہے۔ یہ اپنے لئے کہا ہے اور امام کیلئے فرماتا ہے:

"وَعِندَہٗ عِلْمُ الْکِتَاب"

"اور اُس (امامؑ) کے پاس علمِ کتاب ہے"

میں سمجھتا ہوں کہ وزنِ حرفی کے اعتبار سے دونوں جملے برابر کے ہیں۔ اُم الکتاب اور علم الکتاب میں حرفوں کی گنتی کا بھی فرق نہیں ہے۔ اُس کے پاس اُم الکتاب ہے، امامؑ کے پاس علم الکتاب ہے۔

اللہ کے کلام کا احصاء نہیں ہو سکتا، چاہے روئے زمین کے تمام اشجار قلم ہو جائیں، تمام دریا سیاہی ہو جائیں۔ حضرات ایک حدیث ہے، سن کر ہم حیران تو ہونے لگتے ہیں، اس لئے کہ ہمارے چھوٹے دماغوں میں بڑی بات سمائے کیسے؟ دماغ محدود ہیں۔ مگر ایک حدیث متواتر ہے جس کو فریقین نے نقل کیا ہے۔ اپنے اپنے مستندات میں بیان کیا ہے کہ سرکارؐ نے فرمایا:

"لَوْ کَانَ الرِّیَاضُ اَقْلَاماً وَ الْبُحُوْرُ مِدَاداً وَالْجِنُّ حِسَاباً وَالْاِنْسُ کُتَّاباً مَّا اَحْصَوا فَضَائِلَ عَلِیِّ ابْنِ اَبِیْ طَالِب"

"دنیا کے تمام باغات سے اور درختوں سے اگر قلم اور جتنے دریا ہیں وہ سب کے سب روشنائی ہوں اور تمام جن محاسب بنیں اور تمام انسان کاتب بنیں، اس اہتمام کے باوجود فضائلِ علی ابن ابیطالب کا احصاء نہیں ہو سکتا"۔

خدا جانے کہ یہ ذوات کیسی مجمع الفضائل ہیں۔ میں نے یہ حدیث پیش کی تھی کہ سرکارؐ دو عالم ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن کا ایک حرف بھی ایسا نہیں ہے جس میں ستر ہزار معنی نہ ہوں۔ جب ایک ایک حرف میں ستر ستر ہزار معنی ہوں گے تو انصاف سے دیکھ کر کہئے کہ اگر قرآن کا ایک

حرف کسی کی شان میں حرفِ مدح ہے، کتنی خوبیوں کا ذکر ہو گیا؟ کتنے فضائل کا ذکر ہو گیا اور اگر کسی کی شان میں قرآن نے کئی حرفوں سے بنا ہوا ایک لفظ پیش کیا، اُس کے کتنے فضائل کا ذکر ہو گیا! اگر کسی کی شان میں قرآن نے پوری ایک آیت بیان کر دی، اُس کے فضائل کتنے ہوں گے! اگر کوئی ذی شان ایسا ہو کہ جس کی شان میں قرآن نے ہم جیسے لوگ کہ جو خود کسی شمار میں نہیں، ہماری شمار کے مطابق کسی کی شان میں قرآن نے تین سو آیتیں پیش کی ہیں۔ ایک عالمِ اہلِ سنت کا شعر ہے کہ:

زتفسیر کلام اللہ چو می پرسی شود ناطق
کہ سہ صد آیہ نازل شد بہ شانِ شوہرِ زہرا

''قرآن کی تفسیر کے بارے میں اگر تو پوچھتا ہے تو قرآن خود بتا رہا ہے کہ شوہرِ زہراؑ کی شان میں تین سو آیتیں آئی ہیں''۔

جس کی شان میں قرآن تین سو آیتیں پیش کرے، اُس قرآن کی تین سو آیتیں، جس کے ہر حرف میں ستر ستر ہزار معنی ہوں، ہے کوئی طاقت کہ اُس کے فضائل کو شمار کر سکے اور اُس کی حقیقتِ فضائل کو سمجھ سکے۔ اسی بناء پر کسی عارف نے تو فیصلہ کن شعر کہہ دیا کہ:

کتابِ فضلِ تُرا آبِ بحر کافی نیست
کہ تر کنم سرِ انگشت و صفحہ بشمارم

''یا علیؑ! آپ کی فضیلت کی کتاب کیلئے دریائے عالم کا پانی کافی نہیں ہے۔ یہ پورے دریا کا پانی اس کام کیلئے بھی کافی نہیں ہے کہ اس دریا کے پانی میں میں اپنی انگلی بھگو بھگو کر آپ کی کتابِ فضیلت کی ورق گردانی کر سکوں''۔

یعنی صفحے پلٹنے کیلئے انگشت بھگو بھگو کر ورق گردانی کر سکوں، اس کام کیلئے بھی دریائے عالم کا پانی کافی نہیں۔ (صلوٰۃ)۔

''مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللّٰهِ''۔ ''اللہ کے کلمات کا احصاء نہیں ہو سکتا''۔

میں دکھا چکا ہوں قرآن مجید میں کہ خداوند عالم حرفوں کو اپنا کلمہ نہیں کہتا۔عیسیٰ میرا کلمہ ہے۔عیسیٰ کی ماں نے میرے کلمات کی بھی تصدیق کی اور میری کتابوں کی بھی تصدیق کی۔ وہ کلمات کتابوں کے علاوہ ہی تو کچھ ہیں اور کتابوں کے علاوہ جو ہیں وہ انبیاء اور رسل ہی تو ہیں۔ اولیائے خدا ہی تو ہیں جن پر ایمان لانا ہر مومن کا فرض ہے۔خداوند عالم ان بولتے ہوئے قرآنوں کو اپنا کلمہ کہتا ہے۔ مجھے تو اس سلسلہ میں الہام ہوا ہے، میں اُسے ہمیشہ فخر و ناز کے ساتھ بیان کیا کرتا ہوں۔ آیہ مودّت ہے نا قرآن مجید میں:

"قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى"

جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہر فریق نے لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی، سرکارؐ دو عالم سے سوال کیا گیا کہ وہ آپؐ کے مخصوص اقرباء کون ہیں کہ جن کی محبت ادائے اجرِ رسالت ہے تو آپؐ نے اس وقت چار نام لئے ہیں، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ و حسینؑ۔ تو مجھ پر ایک امر وارد ہوا دل میں خود بخود یہ خیال گزرا کہ سرکارؐ نے یہ چار نام جو لئے، آیت میں یہ چاروں نام ہوں گے کہیں نہ کہیں، ہوں گے کسی نہ کسی گوشے میں، ضرور ہوں گے، اگر آیت میں نہ ہوتے تو زبانِ رسولؐ پر یہ نام آتے کیسے؟ ایک دھن سوار ہوگئی، یہ تو ظاہر ہے کہ یہ چاروں نام کسی آیت میں کھلم کھلا تو نہیں ملتے، میں ایسا بے خبر تو نہیں تھا مگر دل نے کہا کہ رازِ قرآن میں کہیں نہ کہیں ہے، یہ نام زبانِ قدرت پر کسی مخصوص انداز میں آئے ضرور ہیں۔ پھر کہاں ہیں؟ فوراً دل نے جواب دیا کہ اس آیہ مودّت کے بعد خداوند عالم فرماتا ہے کہ:

کیا تم لوگ یہ کہہ رہے ہو کہ نبی نے اپنے اقرباء کی محبت کا حکم خدا کے کہے بغیر صرف اپنی طرف سے دیدیا ہے اور رسولؐ نے خدا پر افترا کیا ہے، خدا کے نام سے بیان کر دیا ہے۔ اگر رسول کوئی میرا اپنے دل سے بات کہنا بھی چاہے تو الزام رسولؐ پر نہیں آتا، مجھ پر آتا ہے، میں نے منتخب کیا ہے، تم تو اپنے منتخب کے بارے میں کہہ سکتے ہو کہ ہمیں اس کے مستقبل کا حال کیا معلوم مگر میں کیا کہوں۔ اگر میرا منتخب مجھ سے پھر جائے، میرا پیغام رساں میرے کہے بغیر اگر اپنی طرف

سے کوئی بات کہے، کیونکہ انتخاب میں نے کیا ہے تو میں جاہل بنا۔ میں بے خبر ہوتا اُس کے مستقبل سے۔ تو جو بے خبر ہے، وہ خدا نہیں ہے۔ اگر رسول میرا اپنے دل سے کوئی بات میرا نام لیکر کہنا چاہے تو میرا فرض ہے کہ میں اُس کے دل پر مہر لگادوں اور وہ بات نہ کہنے دوں۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے، خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

''نبی نے اپنے دل سے یہ بات نہیں کی، حکم میرا ہے اور میرا حکم عبث اور بیکار نہیں ہے۔ میں نے اقربائے پیغمبر کی محبت کا حکم غرض وغایت کے بغیر نہیں دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں باطل کو مٹانا چاہتا ہوں اور حق کو حق ثابت کرنا چاہتا ہوں''۔ مگر یہ کام میرے کلمات کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ خدا اپنے کلمات کے ذریعے سے باطل کو مٹانا چاہتا اور حق کو ثابت کرنا چاہتا ہے۔ فوراً دل نے کہا کہ اپنے کلمات جو کہا ہے تو انہی ہستیوں کو کہا ہے۔ جیسے کہ دل نے جواب دیدیا یہ چاروں نام اسی لفظ میں ہیں۔ میں بڑے اشتیاق سے گھبرایا ہوا، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ وحسینؑ اصلی نام ہیں، ان چاروں ناموں کے عدد نکالے تو چاروں کے عدد ۴۹۱ (چار سو اکیانوے) برآمد ہوئے۔ اب میں نے گھبرائے ہوئے دل سے اور مشتاق نگاہوں سے لفظ ''کلمات'' کے عدد نکالے، اللہ اللہ میں حیران رہ گیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یا اللہ یہ اِلقا تیری طرف سے ہے، یہ تو نے دل میں بات ڈالی ہے کہ جو عدد اُن چار ناموں کے چار سو اکیانوے، وہی عدد چار سو اکیانوے لفظ کلمات کے۔ اور یہاں سے شانِ نبوت کا پتہ چلا کہ واقعی جو نام قدرت لے چکی وہی نام نبی کی زبان پر آئے اور خداوند عالم نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ:

''مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى''

''یہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا، وہی کہتا ہے جو ہم کہتے ہیں''۔

یقیناً اس کی بنیاد مستحکم ہے۔ وہی کہتا ہے نبیؐ جو خدا کہتا ہے مگر کہنے کے انداز الگ الگ ہیں۔ عربی کی ایک ضرب المثل ہے اور کلیہ ہے کہ:

''اَلْكِنَايَةُ اَبْلَغُ مِنَ التَّصْرِيْحِ''

"تصریح سے کنایہ زیادہ بلیغ ہوتا ہے"۔

میں سمجھتا ہوں کہ جولوگ کسی مفہوم کو بیان کرنے کیلئے نام بنام ہندی کی چندی بیان کرتے ہیں، اُن کے بیان میں لطف نہیں رہتا۔ اگرچہ وہ بات کو واضح کر رہے ہیں۔ برائی کے موقع پر کسی کا صاف صاف نام لے رہے ہیں، وہ ٹھیک ہے مگر بلاغتِ کلام باقی نہیں رہتی۔ بلاغت جب ہوگی کہ جب کنایہ کہا جائے۔ جو بات کنایۃً اور اشارۃً ہوگی، وہ زیادہ بلیغ ہوگی۔ تصریح سے کنایہ زیادہ بلیغ، جب تصریح سے کنایہ زیادہ بلیغ تو اس میں کوئی شک نہیں کہ کلامِ رسولؐ سے کلامِ خدا زیادہ بلیغ ہے۔ جب زیادہ بلیغ ہے تو ہونا بھی یہی چاہئے کہ کلامِ خدا میں کنایہ ہو، سرکارؐ کے کلام میں تصریح ہو۔ جو نام رسولؐ نے کھل کر لئے، وہ نام قدرت نے کنایۃً لے لئے۔

حضرات! عجائباتِ قرآن میں سے یہ چیزیں ہیں۔ یہاں چار نام چار سو اکیانوے اعداد کے کھلے ہوئے آپ کے سامنے ہیں۔ مقامِ مدح ہے یہ کہ یہاں چار نام برآمد ہو رہے ہیں، پھر ایک آیتِ مذمت بھی ہے:

"اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِیْنَ مُنْتَقِمُوْنَ"

پوری آیت ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "یقیناً ہم مجرمین سے انتقام لینے والے ہیں"۔ خدا جانے کیسی عجیب بات ہے یہ کہ اس آیت کے اعداد سے بھی میں گنتی نہیں گننا چاہتا۔ وہ تو میری چیز تھی، میں نے بیان کر دیا کہ کلمات کے لفظ میں چاروں نام، نہ ایک عدد کی کمی ہے، نہ ایک عدد کی زیادتی ہے۔ میں نے اعداد کا سلسلہ بہت سوں کی تلاش میں دیکھا مگر جہاں تصنع پیدا ہو جاتا ہے، وہاں سے طبیعت میری ہٹ جاتی ہے۔ فاطمہؑ کی جگہ بہت سے لفظ آ سکتے ہیں، زہراؑ بھی ہے، بتول بھی ہے، رضیہ بھی ہے، مرضیہ بھی ہے، بہت سے لفظ ہیں جو معصومہؑ کیلئے بولے جاتے ہیں مگر اصل نام فاطمہؑ ہے۔ اسی طرح علیؑ کیلئے حیدر کہہ لیں، علی کے عدد نہیں ملتے تو حیدر کے عدد شامل کر دیں اور اسی طرح بہت سے لفظ مل سکتے ہیں، علی مرتضیٰ، مگر نہیں جو اصل نام ہے وہ علیؑ ہے۔ چاروں اصل نام اُن کے اعداد چار سو اکیانوے اور کلمات کے بھی وہی۔ تلاش نہیں دین ہے قدرت کی۔

میں نے کوئی جستجو نہیں کی، خود بخود بیٹھے بٹھائے ایک بات گزری دل میں۔ خدا شاہد ہے کہ نہ کہیں دیکھا، نہ کسی سے سنا، مگر ڈال دی دل میں اُس نے بات۔ اور میں جب تک زندہ ہوں حضرات اور جب اُسے یاد کرتا ہوں تو مسرت کی لہریں میرے دل میں دوڑتی ہیں کہ یہ اللہ کی عطا ہے۔ جب یہ طے کر رہا ہے قرآن کہ کلمہ خدا لفظ کو نہیں کہتا، وہ کلمہ اپنے پیغام رساں کو کہتا ہے، اپنے خلیفہ کو کہتا ہے، اپنے نائب کو کہتا ہے، اپنی طرف سے بھیجے ہوئے ہادی کو اپنا کلمہ کہتا ہے تو اُس نے کلمات اپنے کہا ہی ان ہی کو ہے۔ ان کی محبت کو جو ہم نے واجب کیا ہے، وہ اس لئے واجب کیا ہے کہ ہمارے کلمات کے ذریعے سے باطل مٹ جائے، حق ثابت ہو جائے تو کلمات تو کہا ہی ان حضرات کو ہے، کلمات اللہ یہی ہیں اور پھر لفظِ کلمات میں یہی چار نام۔ میں نے اُس آیت کو پیش کیا۔ ہم یقیناً مجرموں سے انتقام لینے والے ہیں۔ اس پوری آیت کے عدد، ہیں کچھ نام ایسے اور کئی ہیں، وہ جمع کا صیغہ ہے۔ اُن ناموں کے بالکل ہم عدد۔ نہ ایک عدد کی کمی ہے، نہ ایک کی بیشی ہے اور آیت ضمناً، اشارۃً اور کنایۃً بتا رہی ہے کہ مجرمین یہ ہیں۔ خدا جانے کتنے خزانے اس قرآن میں مخفی ہیں جن تک ہماری نگاہیں پہنچ ہی نہیں سکتیں۔ اگر کوئی چیز اس بحر ناپیدہ کناہ میں سے گوہر خوشاب بن کر ہمیں مل جاتی ہے تو ہم اپنے آپ کو دولتمند پانے لگتے ہیں اور سرمایہ دار سمجھنے لگتے ہیں۔

جنابِ والا! اگر کتاب بے مثل ہے اور جن و انس بھی مل کر اس کی مثال نہیں لا سکتے تو خداوند عالم نور کے پتلوں کیلئے بھی فرما رہا ہے "ما نفذت کلمات اللّٰہ" اللہ کے کلمات کا احصاء نہیں کر سکتے۔ یہ آیت قرآن مجید میں دو جگہ۔ امام علی نقی علیہ السلام بقسم فرماتے ہیں کہ کلمات اللہ ہم آئمہ اہلِ بیتؑ ہیں۔ خداوند عالم ہمیں اپنے کلمات کے لفظ سے تعبیر کر رہا ہے۔ پھر آپ نے یہ حدیث مبارک ضرور سنی ہوگی، موقع کی بات ہے، اس لئے کہتا چلوں، آیت قرآنی ہے:

"وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا"

"اللہ کیلئے اچھے اچھے نام ہیں۔ جب خدا کو پکارا کرو تو انہی اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے سے

پکارا کرو"۔

ہم تو یہی سمجھ کر بیٹھے رہتے کہ رحمٰن و رحیم ہی مراد ہیں، حکیم و کریم ہی اسماءِ حسنٰی سے مراد ہیں لیکن صادقِ آلِ محمدؐ فرماتے ہیں:

"وَاللّٰهِ نَحنُ الاَسْمَاءُ الحُسنٰی"

"خدا کی قسم! وہ اللہ کے اسماءِ حسنٰی ہم ہیں"۔

اور منشائے ایزدی یہ ہے کہ جب خدا کو پکارو، ہمارا واسطہ دے کر پکارو، ہمارا ذریعہ اختیار کر کے پکارو۔

حضرات! بات سمجھ میں تو آتی ہے کہ نام ہمیشہ اس لئے ہوتا ہے کہ نام کے ذریعے سے نام والا پہچانا جائے اور نام کی غرض و غایت ہے کیا؟ نام ذریعۂ تعارف ہے نام والے کا اور یہ اتنا آسان ذریعۂ تعارف ہے کہ اس کی قدر اس وقت ہوتی ہے اگر ہم کسی کا نام بھول جاتے ہیں اور اُس کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ کسی سے اب ہمیں پوری لمبی چوڑی تقریریں کرنا پڑتی ہیں اور وہ جو کل مجلس میں آیا تھا، وہ صاحب جن کا حلیہ یہ ہے، جن کا قد ایسا ہے۔ ایک پورا چربہ اور نقشہ کھینچنا پڑتا ہے۔ پھر بھی جو کام نام سے چلتا، وہ ساری تقریر سے نہیں چلتا۔ نام لے دینا کسی نام والے کا ایسا بہترین ذریعۂ تعارف ہے کہ بڑی آسانی سے تعارف ہو جاتا ہے۔ نام نام والے کی پہچان کے لئے ہوتا ہے۔ اب انصاف سے بتائیے یہ حضرات نہ ہوتے، کیا پہچانتے ہم خدا کو؟ خدا کو پہچانے جانے کا ذریعہ یہی حضرات ہیں۔ جو کام ہماری پہچان کروانے کیلئے ہمارا نام دیتا ہے، وہی کام خدا کی پہچان کروانے کیلئے یہ حضرات دیتے ہیں۔ لہٰذا جس طرح میرا نام لفظی ہے، اُسی طرح سے خدا کے یہ نام ہیں۔

جس نے خدا کو پکار لیا اور ان کا ذریعہ اختیار کیا، وہی لفظِ کلمات آتا ہے۔

"فَتَلَقّٰی آدَمُ مِن رَّبِّهٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيهِ"

"آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھ لئے، اللہ نے فوراً ان کی توبہ کو (ان کی

معذرت کو جو ترک اولیٰ کی بناء پر تھی) قبول کرلیا"۔

"فَتَابَ عَلَيْهِ"، "ف" ہے نا یہاں، "ف" جہاں پر آتی ہے، فور کیلئے آتی ہے۔ "ثم" جہاں آتا ہے وہاں تاخیر کیلئے آتا ہے۔ آدم نے اپنے رب کے کچھ کلمات سیکھے، آدم کی توبہ فی الفور قبول کرلی گئی۔ جن کے ناموں کے توسل سے دعائیں فی الفور قبول ہوں، خود اُن کی دعا کتنی سریع الاجابت ہوگی۔ "ف" ہمیشہ فور کیلئے ہے۔

"من کنت مولاه فهذا علیّ مولاه"

وہی فائے فور آتی ہے اور جہاں بھی یہ "ف" ہوگی،

"اِذَا نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُوْحِىْ فَقَعُوْالَهٗ سَاجِدِيْنَ"

"اے میرے ملائکہ! جب میں اس پتلے میں اپنی روح پھونک دوں، فَقَعُوْالَهٗ سَاجِدِيْنَ"، تو سجدے میں دیر نہ لگے"۔

یہ "دیر نہ لگے" ترجمہ کس کا کیا؟ "ف" کا۔ فوراً سجدے میں گر پڑنا۔ آدم نے کچھ کلمات سیکھ لئے اور اللہ نے اُن کی توبہ کو فوراً قبول کرلیا۔

یہ ہیں حضرات وہ کہ جن کے توسل سے دعا اور توبہ قبول ہوتی ہے۔ میں تو یہ جملہ کہہ کر آگے بڑھوں گا کہ یہ حضرات ہمارا وسیلہ تو بہت بعد میں ہیں۔ ہم سے پہلے تو یہ خدا کا وسیلہ ہیں، اس لئے کہ خدا کی کوئی بات انہی کے ذریعے سے تو پہنچی اور خدا نے اپنی بات انہی کے ذریعے سے تو پہنچائی۔ پہلے اللہ نے اپنے پیغام کیلئے، اپنے احکام کیلئے انہی کو وسیلہ قرار دیا۔ یہ وسیلۃ اللہ بھی ہیں، وسیلۃ العباد بھی ہیں۔ ہمارے اور خدا کے درمیان وہ واسطہ ہیں کہ ہم کو خدا سے ملا رہے ہیں۔ خدا کو ہم سے ملا رہے ہیں۔ (صلوٰۃ)۔

ہم نے تمہاری ہدایت کیلئے ایک نور بھیجا، ایک کتاب مبین بھیجی۔ حضرات! اگر اس کتاب کی ایک سو چودہ سورتیں ہیں، پھر نور کی بھی چودہ صورتیں ہیں، کتاب کی بھی ایک سورت تو نہیں، بہت سی سورتیں ہیں تو پھر نور کی بھی اگر قدرت نے چودہ صورتیں قرار دیں، کیا محلِ

تعجب ہے۔

صورتیں ایک ہی نور کے اجزاء ہیں۔ جب ایک نور کے اجزاء ہیں تو خواص بھی ایک، صفات بھی ایک، صورت بھی ایک، سیرت بھی ایک، رفتار بھی ایک، گفتار بھی ایک، بات بھی ایک، ہر طرح سے ایک ہیں۔ جابر پوچھ رہے ہیں کہ سرکار اولی الامر کون ہیں جن کی اطاعت ہم پر فرض ہے۔ سرکار نے اس مقام پر بارہ نام لئے ہیں۔ یہ چیز جو میں بیان کر رہا ہوں، یہ صرف آپ ہی کے یہاں کی نہیں ہے، اُدھر بھی کتابوں میں یہی لکھا ہوا ہے کہ جب جابر نے اولی الامر کے بارے میں پوچھا تو سرکار نے فرمایا کہ بارہ امام۔ پہلا علیؑ ہے، دوسرا حسنؑ ہے، تیسرا حسینؑ ہے، چوتھا علیؑ ابن الحسینؑ، پانچواں محمد ابن علیؑ اور یہاں تک کہ آپؐ نے فرمایا کہ جابر تم میرے اس فرزند کو دیکھو گے، تمہاری عمر اللہ دراز کریگا اور تم میرے فرزند باقر کو دیکھو گے۔ اے جابر! جب دیکھنا تو میرا سلام کہہ دینا۔ صواعق محرقہ ہو، روضۃ الاحباب ہو، ینابیع المودہ ہو، جس کتاب میں چاہیں دیکھ لیں، یہ واقعہ اتنا مشہور اور متواتر ہے کہ سب نے بیان کیا ہے۔ اے جابر! میرا وہ فرزند علم کے خزانوں کو اس طرح سے شگافتہ کریگا جس طرح زراعت کیلئے زمین کو شگافتہ کیا جاتا ہے۔ یہی لفظ ہے سرکار کا فرمایا ہوا جس کی بناء پر ہمارے پانچویں امامؑ کا لقب باقر ہو گیا۔ باقر کہتے ہیں بند چیزوں کا کھولنے والا، شگافتہ کرنیوالا۔

"یَبْقَرُ الْعِلْمَ کَمَا یَبْقَرُ الثَّوْرُ الْاَرْضَ"

''جس طرح مویشی کھولتے ہیں زمین کو زراعت کیلئے، اسی طرح وہ علمی زمینوں کو کھول دے گا''۔

باقر العلوم اسی بناء پر آپؑ کا لقب ہوا ہے۔ صاحب روضۃ الاحباب نے یہ واقعہ لکھا ہے، مشہور کتاب ہے محدث جمال الدین کی۔ جابر سے سرکار نے یہ فرمایا کہ میرا اسلام کہہ دینا۔ اُس دن سے جابر مشتاق باقر ہیں اور ان کی زبان پر یا باقر یا باقر، راستہ چلتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں۔ سننے والے سن کر کہتے ہیں کہ پاگل ہو گیا ہے، دیوانہ ہو گیا ہے، جانے کیا کہہ رہا ہے۔

اگر جابر یہ کہتے ہوئے سن لیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ دیوانہ تو ہے، میں دیوانہ نہیں ہوں، میں خبر رسولؐ کا منتظر ہوں جو صادقؐ نے فرمایا ہے، وہ ہو کر رہیگا۔ فرمایا ہے حضورؐ نے کہ تم میرے فرزند باقرؑ کو دیکھو گے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا، آپ (جابر) نے نام پوچھا۔ آپ نے فرمایا کہ "اِسمی محمد"، "میرا نام محمد ہے"۔

نام بھی سن لیا۔ فرمایا تھا کہ وہی نام ہوگا جو میرا ہے۔ اس کی تصدیق ہوگئی۔ جب نام امام نے بتایا تو لب ولہجہ بھی سن لیا۔ فرمایا تھا کہ اس کی گفتگو کا انداز وہی ہوگا جو میرا ہے۔ اب جابر کمال اشتیاق میں عرض کرتے ہیں، ہے تو ایک حد تک بے ادبی مگر حقیقت شناسی کیلئے اگر کوئی بے ادبی بھی ہو تو وہ عین ادب ہے کہ ہم غلط نہ پہچان رہے ہوں، عرض کیا ہے کہ ذرا کچھ قدم آگے بڑھا کر مجھے رفتار بھی اپنی دکھا دیجئے۔ امامؑ نے چند قدم آگے بڑھائے، پیچھے ہٹائے، رفتار بھی دیکھ لی کہ وہی رفتار رسولؐ ہے۔ اب جابر تیاری کر رہے تھے پیغام پہنچانے کی کہ میرے امامؑ گوہر افشاں ہوئے کہ جابر تم ساری علامتیں دیکھ چکے، اب ہمارے جد کا پیغام وسلام کیوں نہیں پہنچاتے۔ میں نے اپنی کسی کتاب میں دیکھا ہے کہ مولائے کائنات نے اپنی رحلت کے وقت جناب سید سجاد علیہ السلام کو بلا کر یہی فرمایا ہے کہ بیٹا تم اپنے بیٹے کو میرا اور رسولؐ کا سلام کہہ دینا۔ بہر حال حضرات خدا جانے اس فقرے کو سن کر جابر کا کیا حال ہو گیا ہوگا۔ بالآخر انہیں کہنا پڑا کہ آپؑ کو سرکارِ دو عالم نے سلام فرمایا ہے۔ امام باقر علیہ السلام نے جواب دیا کہ میرا بھی درود وسلام ہو آپؐ پر۔ جب تک مشرق ومغرب قائم ہیں اور جب تک زمین وآسمان موجود ہیں، اے جابر! تم نے اُن کا سلام پہنچایا، اس لئے تم پر بھی سلام ہے۔ صاحب روضۃ الاحباب نے یہ لفظ صاف اور نمایاں طور پر لکھے ہیں کہ جابر کا عالم یہ ہے کہ کبھی امامؑ کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہیں، کبھی امامؑ کے ہاتھوں کو چومتے ہیں اور اس وجدانی کیفیت میں ایک دفعہ عالم یہ ہوا کہ گر پڑے اور انتہائی کوشش کی کہ امام علیہ السلام کے پیروں کو چومیں مگر امام علیہ السلام نے اپنے پیر ہٹا لئے۔ یہ ہیں حقیقت شناس صحابہ پیغمبرؐ جو اپنی حقیقت کو پہچانتے ہیں اور آل محمدؐ کی حقیقت کو پہچانتے ہیں۔ (صلوٰۃ)۔

اب میں آپ حضرات کو پیغام رسانی کے طور پر کہہ دوں کہ رسولؐ نے اپنے فرزند باقرؑ کو سلام کہلوایا۔ جناب امیر علیہ السلام نے بھی ارشاد فرمایا کہ سید سجاد اپنے بیٹے کو میرا اور رسولؐ کا سلام کہنا۔ کیا کہنا اُن ہستیوں کا جن پر الٰہی سلام ہو۔ جن پر اللہ کی جانب سے درود و سلام ہو۔ عزادارانِ مظلومِ کربلا! ذرا اپنے مظلوم آقا کے کرم کو دیکھئے کہ جن ہستیوں پر اللہ کا درود و سلام ہو، وہ عظیم ہستی اپنے بیمار فرزند سے رخصت ہوتے ہوئے فرما رہی ہیں کہ بیٹا میرے شیعوں کو میرا سلام کہنا اور کہہ دینا کہ جب آب سرد پینا تو میری پیاس کو یاد کر لینا۔ امامِ مظلومِ کربلا نے ہم جیسے بدترین گنہگاروں کو اپنا سلام کہلوایا ہے اور ہمیں یاد کیا ہے۔

الا لعنة اللّٰہ علی القوم الظالمین۔

❀❀❀

ساتویں

مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ. (عنکبوت: ۴۹)

قرآنِ کریم اپنی حقیقت کو اپنی زبانِ بے زبانی سے خود بیان کر رہا ہے۔ ارشاد فرما رہا ہے کہ:

''اصلِ قرآن اور حقیقتِ قرآن وہ آیاتِ بینات ہیں جو اُن کے سینوں میں ہیں جن کو علم دیا جا چکا، وہ میری حقیقت کے امین ہیں، میری اصل اُن کے پاس ہے۔ میں اُن سے وابستہ، وہ مجھ سے وابستہ ہیں''۔

وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ. (عنکبوت: ۴۹)

خداوندِ عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ ہماری آیات کا منکر وہی ہو سکتا ہے جو ظالم ہو، ظالمین ہی ہماری آیات سے انکار کر سکتے ہیں، ورنہ اور کوئی ہماری آیات کا منکر نہیں ہو سکتا۔ خداوندِ عالم نے ایسا وصل پیدا کیا ہے قرآن اور اہلِ بیتؑ میں کہ اس سے زیادہ وصل اور اتصال کا کوئی عنوان ہو ہی نہیں سکتا۔ محاورہ تو یہ ہے کہ جب دو کو ایک دوسرے سے وابستہ دکھانا چاہتے ہیں تو کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ دو یکجان و دو قالب۔ قالب دو ہیں، جان ایک ہے مگر قدرت نے قرآن اور اہلِ بیتؑ کے اتصال کو اس محاورے سے بھی اور اس زبان زدِ مثل سے بھی بلند تر کر دیا۔ یہاں دو قالب ہیں کہاں، ایک قالب ہے اور وہی دو کا حامل ہے اور اب قالب بھی کیوں کہوں، قلب ہی کیوں نہ کہوں! ایک قلب ہے کہ وہی قلبِ قرآن بھی ہے اور قلبِ آلِ محمدؐ بھی ہے۔ یک جان دو قالب نہیں بلکہ قالب بھی ایک، جان بھی ایک۔ جس قلب میں جان ہے اُن کی، اُس قلب میں قرآن ہے اور قرآن ہی اصل میں اُن کی جان ہے۔

خداوندِ عالم نے انہی کو اپنی کتاب کا وارث قرار دیا اور فرمادیا کہ:

"ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا"

''ہم نے اپنی اس کتاب کا وارث قرار دیا ان کو جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا''۔

خداوند عالم جب اپنی کسی قرارداد پر زور دینا چاہتا ہے تو باوجودیکہ اُس کی ذات ایک ہے، واحد ہے، یکتا ہے، لاشریک ہے مگر جب کسی قرارداد کے ساتھ اپنے جلال کو اور اپنے کمال کو پیش کرنا چاہتا ہے تو وہاں وہ "میں" نہیں کہتا، اپنے آپ کو ہم کہتا ہے۔ اور "نا" میں بھی وہی متکلم کی جمع کا صیغہ ہے۔ ہم نے وارث قرار دیا کتاب کا اُن کو جن کا ہم نے اصطفےٰ کیا۔ اب تم بتاؤ تم نے کس کو وارث قرار دیا۔ ہم نے تو وارث اُن کو قرار دیا ہے کتاب کا جن کا ہم نے اصطفےٰ کیا۔ حضرات! ہر انتخاب، انتخاب کرنیوالے کا آئینہ ہوتا ہے۔ جیسے ہر کلام اصل میں متکلم کا آئینہ ہے کہ اگر کوئی متکلم آپ کو نظر نہیں آ رہا یا نظر نہیں آ سکتا مگر آپ اُسے دیکھنا چاہتے ہیں اُس متکلم کو تو اگر اس کا کلام آپ کو مل جائے تو وہ آئینہ کمالات متکلم ہے۔ کلام کو دیکھ کر متکلم کا تعارف ہو جاتا ہے۔ کلام کو متکلم سے اتنا ربط ہے کہ کلام خود بول اٹھتا ہے کہ متکلم عالم ہے یا جاہل ہے، مطمئن ہے یا مضطرب ہے، تندرست ہے یا بیمار ہے، مسرور ہے یا مغموم ہے۔ متکلم کی تمام کیفیات اُس کے کلام میں آ جاتی ہیں۔

تو کلام آئینہ دار متکلم ہے۔ شانِ متکلم دیکھنا ہو اور متکلم نہ ملے دیکھنے کیلئے تو اُس کے کلام کو دیکھ لیجئے۔ اس وجہ سے خداوند عالم نے اپنے کلام پر اپنی کتاب پر ناز کیا ہے اور منشائے قدرت یہ ہے کہ مجھے تو بہر حال تم نہیں دیکھ سکتے مگر میری بات ہی کو دیکھ لو۔ میرے کلام ہی کو دیکھ لو۔ جس کا کلام اتنا بے مثل ہو کہ:

"لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ"

آیت میں لفظ اجتماع آیا ہے، اجماع نہیں ہے۔ اگر جن وانس بھی مجتمع ہو کر، ان کا اجتماع بھی اگر یہ کوشش کرے اس امر کی کہ اس جیسا قرآن لے آئیں تو خداوند عالم بغیر کسی تامل

کے دعویٰ کر رہا ہے کہ:

"لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ"

"کبھی اس کی مثل نہ لا سکیں گے"۔

اگر چہ ایک دوسرے کا اس کوشش میں مددگار بن جائے، پشت پناہ بن جائے مگر اس قرآن کی مثل نہیں لایا جا سکتا اور پھر خداوند عالم کو کتنا ناز ہے اور ناز کہوں یا اطمینان کہوں، اپنے کلام کی بے مثلی پر قدرت کو کتنا کچھ اطمینان ہے کہ اُس نے پورے قرآن کی مثل لانے کی طلب کو بھی چھوڑا اور اپنی طلب کو سہل کر دیا۔

اگر پورے قرآن کا جواب نہیں لا سکتے تو دس ہی سورتوں کا جواب لے آؤ جو اس کی مثل ہوں۔ لیکن کون لاتا؟ دس سورتوں کے جواب لانے کیلئے بھی ایک نہ نکلا۔ جب یہ بھی نہ ہو سکا تو خداوند عالم نے اپنے مطالبے کو اور سہل کر دیا۔ سہل ترین مطالبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ"

اگر دس سورتوں کا جواب بھی تم کسی صورت میں نہیں لا سکتے، اگر تمہاری صورت ہی نہ ہو قرآن کی سورۃ کی مثل لانے کی تو لو ہم اور آسان کئے دیتے ہیں۔ جہاں جہاں میرے سامعین ہیں، مستفیض ہوں، ایک بات آنے والی ہے آپ کے سامنے، ایک ہی سورۃ لاؤ جو اس کی مثل ہو، میں نے کل بھی اشارہ کیا تھا کہ اگر خداوند عالم کی کتاب کی سورتوں میں نشیب و فراز ہوتا، فصاحت و بلاغت میں کچھ اونچ نیچ ہوتی، کسی سورت کی فصاحت کچھ زیادہ ہوتی، کسی کی کم ہوتی، کسی کی بلاغت بیس ہوتی، کسی کی اُنیس ہوتی تو خداوند عالم کمال اطمینان سے بسورۃ نہ کہتا، کسی سورت کو معین کرتا۔ یہ ارشادِ باری کہ کسی ایک سورت کا جواب لے آؤ، اس کے معنی یہ ہیں کہ اب لانے والے کو یہ اختیار دیدیا گیا کہ جس سورت کو وہ جواب دینے کیلئے سہل سمجھے، اُس سہل راستے کو اختیار کرے۔ تین ہی آیتوں کی سورت لے آئے مگر تین کیلئے بھی کسی کی صورت نہ ہوئی۔ سورۂ کوثر بھی ہے نا قرآن مجید میں۔ جب یہ کہہ دیا کہ کسی بھی سورت کا جواب لے آؤ، تب تو موقع ہے کہ چھوٹی

سے چھوٹی سورت کا جواب لے آئیں۔ بڑی کی قید نہیں لگائی۔ پھر کسی خاص سورت کا نام نہیں لیا، اس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم کو قرآن کی ہر سورت کی بے مثلی پر یکساں اطمینان ہے اور یکساں اطمینان اس بناء پر ہے کہ اُس کے کلام کی کسی سورت کو کسی سورت پر فوقیت نہیں اور کوئی سورت کسی سورت سے کم نہیں۔ واحد کا کلام واحد سطح پر۔ ایک سطحِ فصاحت ہے، ایک سطحِ بلاغت ہے، کیسا اونچ، کیسی نیچ؟

زیر و بالا نمی توانم گفت

خالق ارض و سمٰوٰت

جب خداوند عالم کیلئے زیر و زبر نہیں، جب خداوند عالم کی ذات کیلئے نشیب و فراز نہیں تو اُس کے کسی کمال کیلئے نشیب و فراز نہیں اور جب کسی کمال کیلئے نشیب و فراز نہیں، گویا کہ زبانِ حال سے خداوند عالم یہ فرما رہا ہے کہ میری کتاب کی چھوٹی اور بڑی سب سورتیں برابر ہیں۔ اس کتاب کی صغیر سورت ہو یا کبیر سورت ہو، کوئی صغیر میں کمی نہیں اور کوئی کبیر میں زیادتی نہیں۔ بس یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کے وارث بس وہی ہو سکتے ہیں کہ جو مثلِ قرآن ہیں۔ ان کا صغیر بھی ویسا ہی ہے اور کبیر بھی ویسا ہی ہے۔ جب قرآن کی سورتوں میں کبیر و صغیر کا امتیاز نہیں تو اس کتاب کے وارثوں میں بھی صغیر و کبیر کا امتیاز نہیں۔

یہ آواز اٹھی ہے رسولؐ کی بارگاہ سے کہ:

"صغیرنا و کبیرنا سواء"

"ہمارا صغیر اور ہمارا کبیر سب برابر ہیں"۔

میں تو حضرات آگے بڑھ کر یہ جملہ کہنا چاہتا ہوں۔

حضرات! یہ طے شدہ ہے کہ نزولِ قرآن کا جب آغاز ہوتا ہے، خداوند عالم نے بڑی سورتیں پہلے نازل نہیں کیں۔ اگر بڑی سورتیں پہلے نازل ہو جاتیں تو یا تو نماز قائم نہ ہوتی یا پھر سویرا ہو جاتا۔ غالباً آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ ایک حکایت سنی ہے، وہ عبادت جو ہوتی ہے ماہِ صیام

میں، خاص طور پر ایک آدمی اُس عبادت میں شامل ہوا، اتفاقاً سورۂ بقرہ کی تلاوت ہو رہی تھی۔ بچارہ یہ اڑھائی پاروں کی سورت میں ذبح ہوگیا۔ طولانی سورت ہے نا۔ کھڑے کھڑے مشکل ہوگئی۔ بہرحال گزر گیا وقت۔ اُس نے پوچھا کہ کونسی سورت آج پڑھی گئی ہے۔ کہا گیا کہ سورۂ بقرہ پڑھی گئی ہے۔ دوسرے دن لانے والے اُسے پھر لے آئے شریک عبادت کرنے کیلئے، اب جناب قاری نے پڑھا:

"اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ"

بس اس نے نیت توڑی اور بھاگا کہ جب کل سورۂ بقرہ نے یہ حال کر دیا، آج تو سورۂ فیل ہے۔

حضرات! قرآن کی سورتوں کا بھی یہی عالم ہے کہ بڑی ہو تو یہی شان ہے اور چھوٹی ہو تو وہی شان ہے۔ بے مثلی ہر سورت کیلئے ہے، چاہے وہ چھوٹی ہو، چاہے وہ بڑی ہو۔ مگر قدرت نے اُس کی تنزیل کا عنوان یہ قرار دیا ہے کہ سب سے پہلے چھوٹی چھوٹی سورتیں آئیں تاکہ نماز قائم ہو جائے اور نماز پڑھنے والا تھوڑے سے وقت میں پورا سورہ پڑھ سکے۔ میں نے پہلے کہا تھا کہ اگر بڑی سورتیں پہلے آجاتیں تو یا تو نماز نہ ہوتی یا پھر نمازیوں کا ڈھیر ہو جاتا۔ لہٰذا چھوٹی سورتیں یہ اوّل نزول ہے قرآن کریم کا۔

چنانچہ بڑے بڑے زبردست علمائے کرام نے، سوادِ اعظم کے، خود بھی بیان کیا ہے کہ وہ قرآن جس کو مولائے کائنات امیر المومنین علیہ السلام نے ترتیب دیا تھا، اُس کے آغاز میں چھوٹی ہی سورتیں تھیں جن کا نزول پہلے ہوا۔ وہ قرآن مطابق تنزیل تھا اور اُس کی ترتیب مطابق تنزیل تھی۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے کہا ہے کہ اُس قرآن میں پہلا سورہ، سورۂ اقراء تھا، پھر مثلاً سورۂ مدثر تھا۔ کئی سورتوں کی ترتیب بیان کی ہے انہوں نے۔ یہ علیؑ کے قرآن کی بات ہے اور علیؑ کے قرآن کی کیا بات ہے۔ یہ اصل میں قرآن ہی کی بات ہے۔ قرآن کی بات ہے اور اصل میں یہ ایمان ہی کی بات ہے۔ بہرحال تنزیل ابتداء میں چھوٹی سورتوں کی ہوئی ہے اور جب

استعداد طالبانِ علم کی آگے بڑھی تو خداوند عالم نے سبق کی مقدار بھی بڑھانا شروع کردی۔ بڑی سورتیں، پھر اور بڑی سورتیں، پھر اور بڑی سورتیں۔ یہ ترتیب تھی قرآن کریم کی۔ لیکن آج وہ صورتِ قرآن نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی سورتیں جو مکہ میں اتری تھیں مثلاً:

اِنَّا اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ. فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ. اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ.

سب سے چھوٹی سورت ہے یہ اور یہ طے شدہ ہے کہ مکی ہے اور اس سورت کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا کہ اس زمانے میں اساتذۂ کلام کے اشعار کہ جن کا قصیدہ اول نمبر قرار دیدیا جاتا تھا، ایک سال کیلئے انہیں حق ملتا تھا کہ وہ اپنا قصیدہ لکھ کر دیوار کعبہ میں لٹکا دیں۔ وہ ایک ہی قصیدہ لٹکا رہتا تھا اور ایک سال کیلئے اُس کیلئے گنجائش تھی۔ اس لئے کہ ہر سال طے ہوتا تھا کہ اب آج کے شعراء میں کس کا کلام سب سے بہتر ہے۔

غرضیکہ بہترین کلام کو دیوار کعبہ میں لٹکانے کا ایک مستقل رواج تھا۔ قرآنِ کریم کا جب نزول ہوا اور سورۂ کوثر جب نازل ہوئی، ارشادِ الٰہی ہوا اور منشائے الٰہی ہوا کہ میرے رسولؐ! یہ تو لمبے لمبے قصیدہ لٹکاتے ہیں، یہ تو طولانی کلام اپنا لٹکاتے ہیں، تم یہ تین ہی آیتیں لکھ کر برابر میں رکھ دو۔

دیوار کعبہ پر سورہ کوثر

چنانچہ جب سورۂ کوثر کو دیوار کعبہ سے وابستہ کیا گیا اور دیکھنے والوں نے آ کر اس سورت کو دیکھا اور پڑھا۔ باوجود اس کے کہ وہ ماہرین کلام تھے اور اساتذۂ کلام تھے، انہوں نے بھی ملایا نہیں، یہ کہا کہ:

"لَیۡسَ هٰذَا بِکَلَامِ الۡبَشَرِ"

بڑھا ہوا تو ہے یہ ہمارے کلام سے مگر یہ بشر کا کلام ہی نہیں"۔

ظاہر ہے کہ قافیہ ہی ملا نہیں اور حل کیا سکتا ہے۔ چھوٹی سورتوں کا نزول پہلے ہوا۔ خداوند عالم نے انسانوں کو چھوٹی سے چھوٹی سورتوں سے سب سے پہلے متعارف کروایا۔

جو قدرت نے صورت تنزیل قرآن رکھی، ایک موقعہ ایسا آیا کہ ناطق قرآنوں کو پیش کیا

connection

جائے۔ قرآن صامت کام کر چکا، نصاریٰ کے مقابلے میں آیت مقابلہ کر چکی:

"اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَاب"

یہ آیت ہی تو ہے۔ خداوند عالم ہی تو جواب دے رہا ہے نصاریٰ کو۔ کس بناء پر کہتے ہو تم عیسیٰ کو ابن اللہ، اس لئے کہ باپ نہیں ہے۔ آدم کے تو نہ باپ ہے نہ ماں۔

یہ اگر ابن اللہ ہو سکتے ہیں تو وہ ان سے بدرجۂ اولیٰ ابن اللہ ہو سکتے ہیں۔ انہیں بھی تو کہو۔ جواب نہایت معقول اور قرآن کریم کی بات معقول نہ ہوگی تو پھر اور کس کی ہوگی؟ بہترین تقابل تھا، بہترین جواب تھا، ایک ہدایت نامہ تھا مگر وہ چپ ہونے والے کہاں تھے۔ اپنی حجتوں کو اور اپنی بحثوں کو اس کے بعد بھی جاری رکھا۔

آخریت دلیل افضلیت

میرا مجمع ذرا انصاف سے بتائے کہ ایک کارگزار اپنی کارگزاری جب دکھا چکے اور کام رہ جائے، اُس کے بعد کیسا کارگزار ہو جو میدان میں آئے۔ ایک علمدار اگر ہار چکے اور ایک ہو، دو ہوں کہ تین، مجھے اس سے بحث نہیں ہے، میں ایک عام بات کہہ رہا ہوں کہ کتنے علمدار اگر جا جا کر واپس آجائیں اور فتح خیبر نہ ہو تو آخری علمدار ان سے گھٹیا جائے گا یا بڑھیا جائے گا۔ بیمار کو اگر لاکھ دواؤں سے شفا نہیں ہے تو آخری دوا پہلی دواؤں سے کم اثر رکھنے والی وہ تاثیر دکھائے گی۔ کتنے استادوں سے ہم پڑھ چکے ہیں اور اب ہمارا علم بڑھتا چلا جا رہا ہے تو آخری استاد پہلے استادوں سے بڑھ کر ہونا چاہئے یا نہیں۔

آخریت دلیل افضلیت ہے۔ آخری معالج پہلے ہر معالج سے بہتر ہونا چاہئے، آخری مدرس کو پہلے مدرسوں سے زیادہ قابل ہونا چاہئے۔ آخری کارگزار پہلے تمام کارگزاروں سے (اگر کام رہ گیا ہے) افضل و اعلیٰ ہونا چاہئے۔

آخری حربہ پچھلے تمام حربوں سے تیز تر ہونا چاہئے۔ اب قرآن کریم مقابلہ کر چکا اور یہ چپ نہ ہوئے۔ ضرورت ہے پہلے اثر سے زیادہ اثر پیش کیا جائے۔ پہلے کارگزار سے زیادہ بہتر کارگزار کو پیش کیا جائے۔ اب آیت آتی ہے۔ وہ بھی قرآن ہی میں آرہی ہے:

"فَمَنْ حَاجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَاجَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ"

علم تو آچکا، علم تو ان کا مقابلہ کر چکا۔ اگر یہ بے علم اب بھی حجتیں جاری رکھیں تو رسولؐ اب ان سے بات نہ کرو۔ بات کی بات ختم ہوگئی۔ اب ان سے یہ کہو کہ:

"نَدْعُ اَبْنَاءَ نَا وَاَبْنَاءَ كُمْ وَنِسَاءَ نَاوَ نِسَاءَ كُمْ"

ترتیب قائم کی قدرت نے اور تاثیر دنیا کے سامنے ہے کہ سامنے قرآن آیا تو خاموش نہ ہوئے مگر جب یہ قرآن آئے۔ قرآن جو آیا تھا وہ صامت تھا، زبانِ رسولؐ پر آ کر ناطق ہوا۔ یعنی وہ آیت تو خاموش تھی نا۔

"ان مثل عیسیٰ عند اللّٰہ"

خود صامت تھا مگر ناطق ہوا رسولؐ کی زبان کے سہارے سے۔ صامت سے ناطق ہو کر زور لگایا اور ان کے بعد جو آئے وہ تھے ناطق۔ مگر صامت ہی رہ کر کامیاب ہوگئے۔ بولنے نہیں پائے، خاموش رہتے ہوئے کفر کے چراغ خاموش کر دیئے۔ زبانیں اُن کی خاموش کر دیں۔ لو اُن کی بجھا دی۔

میں یہ دکھانا چاہتا تھا کہ، اللہ اللہ، کیا اہتمام ہے قدرت کا کہ اُس نے صامت اتارا تو اس طرح ہے کہ اُس نے چھوٹی چھوٹی سورتیں پیش کیں، پھر بڑی سورت، پھر بڑی سورت۔ اب یہ موقع آیا تھا مباہلہ میں، ناطق قرآنوں کے پیش کرنے کا۔ وہی ترتیب قدرت نے یہاں بھی رکھی۔ اس ناطق قرآن میں، جو چھوٹی سورتیں تھیں، سب سے پہلے انہیں اَبْنَاءَ نَا۔۔۔۔، اس کے بعد جو اُن سے بڑی سورت تھی نِسَاءَ نَا۔۔۔۔، اُن کو پیش کیا پھر جو سب سے بڑی سورت تھی وہ صورت کہ جس کا دیکھنا عبادت، وہ صورت جو ہر جنگ میں پس نہ رہتی تھی، پیش رہتی تھی۔ پس و پیش کے بغیر آگے آگے۔ آج قدرت نے اُسے سب کے پیچھے رکھا ہے، اصل میں قدرت نے بھی یہ دکھانا ہے کہ یہ گھرانہ وہ ہے کہ جس گھرانے کا چھوٹا اور بڑا سب برابر ہیں۔ کوئی فرق نہیں۔ صغیر کو سب سے پہلے پیش کیا، اُن سے بڑی ذات کو اُن کے بعد پیش کیا۔ سب سے بڑی خوبی کو سب

سے آخر میں رکھا۔

"اَبْنَآءَ نَا، نِسَآءَ نَا، اَنْفُسَنَا"

میں حضرات ایک بات کہتا ہوں کوئی مانے یا نہ مانے، اس سے بحث نہیں ہے۔ جابر ابن عبداللہ انصاری نے اور زید ابن ارقم نے ایک اشارہ کیا ہے اور اُس کی روشنی میں بھی میں ایک جملہ کہنا چاہ رہا ہوں۔ جملہ حضرات یہ ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے عرض پیش کی تھی خداوند عالم کی بارگاہ میں کہ:

"رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَ یَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ الْعُقْدَةَ مِنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ هَارُوْنَ اَخِیْ"۔

"خداوندا! میرے سینے کو کشادہ کردے۔ میرے لئے میرا کام آسان کردے۔ میرے عقدۂ لسان کو کھول دے تا کہ ہر شخص میری بات کو آرام سے، اطمینان سے، آسانی سے سمجھے۔ خداوندا! میرے اہل سے میرا وزیر بنادے، میرے بھائی ہارون کو اور اُس کو میرے کام میں میرا شریک کردے"۔

یہ سب سنے ہوئے ہیں نا آپ حضرات! لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو میں سنا رہا ہوں، وہ نہیں سنے ہوئے آپ۔ اب یہاں تک تو میرا میرا، جتنے صیغے ہیں سب واحد متکلم، میرا سینہ، میرا کام، میرا بھائی، میرا وزیر۔ اب تک تو جناب موسیٰ اکیلی ذات کو اپنی پیش کررہے ہیں۔ اب آ گیا ہارون کا نام۔ یہاں تک تو آپ اکیلے تھے، میں، میرا، یہی لفظ تھے آپ کی زبان مبارک پر۔ اب دفعۃً آپ کہتے ہیں، میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر کردے، میرا شریک کردے، میری کمر اُس کے ذریعے سے مضبوط کردے۔

"کَیْ نُسَبِّحَکَ"

"تا کہ ہم تیری تسبیح کریں"۔

اب یہ جتنے بھی صیغے ہیں، تا کہ ہم تیری کثیر تسبیح دنیا میں چھاکے، تیرے ذکر کا ہم چرچا

کریں۔ تیری یاد کو ہم قائم کریں۔ یہاں ہم کیوں کہا؟ صاف ہے یہ مطلب کہ ہم کا اشارہ اپنی ذات اور ہارون دونوں کی طرف ہے۔ ہم مل کر تیرے احکام پہنچائیں، تیری یاد کو تازہ کریں، تیرے ذکر کو پھیلائیں۔ جب "ہم" کہتے ہیں "موسیٰ" تو "ہارون" کو ساتھ لے کر کہتے ہیں۔

اس چیز کو نظر میں رکھئے گا۔ سرکارِ دوعالم نے بھی جب تنہا اپنی ذات کا ذکر کیا ہے، آپ آیات دیکھیں قرآن کریم کی، آپ نے اپنی اکیلی ذات کو کبھی ہم نہیں کہا۔

"اِنَّمَا اَنَا".

یہی لفظ ہے انا "میں"۔

"اِنِّیْ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ"

"کہو کہ میں نذیر ہوں، مبین ہوں"۔

کبھی آپ نے اپنی اکیلی ذات کو ہم نہیں کہا۔

موسیٰ نے بھی جب تنہا اپنی ذات کو کہا ہے تو "میں" کہا، کتنی عبارتیں اور جملے ہیں اور جب ہارون کو ملا کر کہا ہے تو ہم کہنا ہی چاہیے تھا۔

"یَا عَلِیُّ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی"

"یا علیؑ! تم کو بھی مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے ہے"۔

جب سرکار نے "میں" کہا تو اپنی اکیلی ذات کو کہا اور جب "ہم" کہا تو ملا کر کہا۔ آیۂ مباہلہ میں کیا ہے؟ "اَدْعُوْ" نہیں ہے، "نَدْعُوْ" ہے۔

ابنائی نہیں ہے، ابناءنا ہے، نسائی نہیں ہے، نساءنا ہے۔ ہمارے بیٹے، ہماری عورتیں، ہماری جانیں۔

سرکارؐ! اس آپؐ کے ہم میں کون ہے آپؐ کے ساتھ؟ کوئی نظر تو آرہا ہے کہ کوئی ہے آپ کے ساتھ۔ اور میں بالکل پتھر کی لکیر کہہ کر اور پختہ ترین بات کہہ کر آپ حضرات کو سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ یوں میں تفسیر سے اور واقعات سے اور روایات سے بحث نہیں کرتا۔ میں تو اس حقیقت

کو بیان کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی ذات رسولؐ کے ساتھ ہے کہ اُس ذات کی شمولیت پر ابناء نا کا لفظ بن سکے۔ ہمارے بیٹے! جو اگر جناب علیؑ کے سوا کوئی اور ہے تو بات غلط ہو جائے گی۔ حسنؑ اور حسینؑ کو لائیں تو ایسی ذات کو لائیں کہ جب بیٹے آئیں تو وہ بیٹے رسولؐ کے بھی، اُسؑ کے بھی ہوں اور جب نساء نا کی تفسیر بن کر کوئی خاتون آئیں تو وہ رسول کی بھی ہوں اور علیؑ کی بھی ہوں۔ اور انفسنا، ہم اپنے نفسوں کو لائیں۔ صحابہؓ کرام نے بتایا ہے اور یہ اشارہ اس طرف ہے کہ علیؑ گئے تو نفسِ رسولؐ بن کر گئے اور رسولؐ گئے تو نفسِ علیؑ بن کر گئے۔ ہر ایک دوسرے کا نفس۔ رسولؐ کی جان یہ ہیں، انؑ کی جان رسولؐ ہیں۔

غرضیکہ حضرات! خداوند عالم نے جیسی کتاب تھی، ویسوں ہی کو اس کتاب کا وارث قرار دیا۔ کتاب پاک تھی، ناپاک کو وارث کیسے بناتا؟ کتاب بے خطا تھی، خطا کاروں کو وارث کیسے بناتا؟ جیسی کتاب تھی ویسے اس کے وارث قرار دیئے گئے۔ اور حضرات! جو کسی شے کا وارث ہوتا ہے، وہی اس کا حافظ ہوتا ہے۔ ایک واقعہ علامہ مجلسیؒ نے بحار میں لکھا ہے:

حیات القلوب میں لکھا ہے کہ فصاحت اور بلاغت کا جھنڈا بہت اونچا تھا، جیسے رسولؐ کے عہد میں، پھر اُس کے بعد عرب میں دوسرے مشاغل کا زور ہو گیا۔ اسلام پھیلا۔ اسلام پھیلا تو جنگ کا دائرہ بڑھا۔ شب و روز جنگ و جدل ہے، اس لئے فصاحت و بلاغت کی طرف سے کنارہ کشی ہو گئی۔ مگر صادقِ آلِ محمدؐ کے زمانے میں مسلمانوں میں تو زورِ کلام نہ بڑھا، کفار پھر فصاحت کے جھنڈے بلند کرنے لگے اور اس ضمن میں ابن ابی العوجاء سرآمد بن گیا اور یہ لشکرِ فصاحت کا سالار بن گیا۔ بڑا فصیح ہوا، بڑا بلیغ ہوا، بڑا قادر الکلام ہوا۔ ایک مرتبہ کا ذکر یہ ہے کہ اُس نے اپنے شاگردوں میں سے تین شاگردوں کو بلایا۔ رازداری کی انتہا کے ساتھ یہ ذکر کیا کہ ہمیں اپنی ادبیت اور اپنی فصاحت اور بلاغت پر ناز کرنے کا کوئی حق نہیں۔ سر ہمارے جھکے ہوئے ہیں اور جھکے رہیں گے جب تک یہ قرآن پکارتا ہے کہ:

"فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ"

ایک جگہ ہے کہ: "فَاْتُوْ بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ"

ہمارے ترجمہ کرنے والوں کے یہاں "مِن" نہیں ہے اور جہاں مِن ہے، وہاں کا ترجمہ ایک سا کیا ہے اور یکساں ہو نہیں سکتا۔ خداوند عالم کا مِن بھی بے وجہ تو نہیں ہو سکتا۔

بہر حال جس کی چیز نہ ہو، اُسے کیا پرواہ ہوتی ہے، جائے یا رہے، پرواہ اُسے ہوتی ہے جس کی چیز ہوتی ہے۔ قرآن کی حفاظت کا کام اُس کے وارثوں کا کام ہے۔ ابن ابی العوجاء نے اپنے مخصوص تین شاگرد جمع کئے اور بڑی رازداری سے یہ بات کہی کہ کیا منہ نکال کر ہم بول سکتے ہیں کہ ہم فصیح ہیں، بلیغ ہیں اور زبان دان ہیں، سخن ور ہیں، آیتِ قرآنی تو ہمیں جھنجوڑ رہی ہے کہ:

"فَاْتُوْ بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ"

"لے آؤ ایک سورۃ قرآن کی جو پوری مثل بھی نہ ہو، لگ بھگ ہو"۔

ہمارے تو سر توڑ رکھے ہیں قرآن کی آیت نے، ہمیں تو نیچا دکھا رکھا ہے۔ اگر سر بلند ہونا چاہتے ہو (یہ اُن شاگردوں سے کہہ رہا ہے جن کو اپنے برابر کر چکا ہے ادبیت میں، فصاحت میں، بلاغت میں، زورِ کلام میں) تو کرو ہمت مثلِ قرآن لانے کی، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ آپس میں یہ بات طے ہو رہی ہے کہ کون سے حصے کا جواب کون لکھے، کون سے حصے کا جواب کون لکھے۔ قرآن کے چار حصے ہو گئے۔ سب نے ایک ایک حصہ لیا۔ معاہدہ یہ ہوا کہ ایک سال تک ہر شخص اپنے حصے کا جواب لکھے اور دیکھو پانچواں آدمی ہمارے راز پر مطلع نہ ہو۔ محفوظ رہے یہ راز خدا جانے جواب ہو سکے نہ ہو سکے۔ اگر جواب نہ ہو سکا اور راز کھل گیا تو ہماری اور ذلت ہے۔ یہ راز فاش نہ ہو اور کہیں اس کا ذکر نہ ہو۔ چنانچہ یہ مجمع چاروں طرف متفرق ہو گیا۔

پورے ایک سال بعد جس جگہ یہ طے پایا تھا، اُسی جگہ آنا بھی طے ہوا تھا۔ جب وہ دن آیا تو یہ چاروں اُسی جگہ پھر جمع ہوئے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ سر ہر ایک کا جھکا ہوا ہے۔ ہر شخص خاموش ہے، مثلِ آئینہ حیران ہے۔ شاگردوں کو انتظار اس کا ہے کہ استاد کچھ اپنا احوال بیان کرے۔ استاد کو انتظار اس کا ہے کہ شاگرد کچھ بیان کرے۔ آخر شاگردوں نے ہمت باندھ کر

اپنے استاد سے کہا کہ آپ تو یقیناً اپنے حصے کا جواب لے آئے ہوں گے۔ استاد نے کہا کہ کیا بتاؤں؟ گھر جا کر میں نے کام شروع کرنا چاہا تھا۔ پہلے دن کی اور پہلے وقت کی بات سنا رہا ہوں کہ جب میں نے اپنے حصے کا قرآن جوابدہی کی نیت سے کھولا تو میری نظر اس آیت پر پڑی کہ:

" وَقِيْلَ يَا اَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَ كِ وَيَا سَمَاءُ اَقْلِعِيْ "

میرے تو بدن میں تھرتھری پڑ گئی۔ میرا دل اتنا کانپا اور میں نے یہ طے کر لیا کہ میں بہ نیتِ جواب قرآن کو کھولوں گا ہی نہیں۔ میرے بس کی بات نہیں۔ تم بتاؤ؟ مضمون سب کا ایک تھا کیونکہ نیت سب کی ایک تھی اور مقصد سب کا ایک تھا۔ لہٰذا جواب سب کا ایک تھا۔ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے آیت یہ پڑھی۔ اُس نے کہا کہ میں نے جب قرآن کھولا، میری نظر اس آیت پر پڑی، میں کانپنے لگا کہ اللہ اللہ، یہ جلالت اور یہ شوکتِ بیان، ہمارے کلام میں کیسے آسکتی ہے تو جواب ہمارے پاس کسی کے نہیں۔

اب آپ حضرات بھی سوچیں اور میں یہ یاد دلا رہا ہوں کہ جب یہ طے پا گیا کہ کسی کے پاس کوئی جواب رتی برابر بھی نہیں ہے تو وہ آپس میں یہ ذکر کرنے لگے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بات کیا ہے۔ قرآن نے نئے الفاظ تو استعمال نہیں کیے۔ جو روزمرہ کے الفاظ زبان میں تھے، اُن ہی کا استعمال کیا ہے۔ حروف نئے نہیں ہیں، اسماء نئے نہیں ہیں، افعال نئے نہیں ہیں، زبان نئی نہیں ہے۔ رات دن ہو گئے ہیں۔ ہم واقعاً، اتنا کتنا بولا جاتا ہے عربی میں، لفظ اللہ، لفظ علیٰ، جار کے کلّ کا لفظ کُل ہی بولتے ہیں، قادر اور قدیر کچھ نئے نہیں ہیں مگر جب خداوند عالم نے ان لفظوں کو اپنی ترتیب سے بیان کیا:

" اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ "

" وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنَاهُ فِيْ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ "

ترتیب کا کمال ہے۔

وہ وجہ تلاش کر رہے تھے، اس تفکر میں تھے، اپنے راز کو انتہائی راز بنا رکھا تھا مگر خدا کا

رازدار بھی اُس زمانے میں کوئی تھا! کتاب خدا کا بھی کوئی وارث تھا۔ یکایک اُن کے قریب سے صادقِ آلِ محمد گزرتے ہیں۔ قریب سے امامؑ گزرنے لگے اور آپؑ ان چاروں سے کیا کہتے! گزر رہے تھے اور یہ آیت پڑھ رہے تھے:

''رسولؐ کہہ دو کہ اگر انس و جن بھی جمع ہو کر اس قرآن کی مثل لانا چاہیں گے تو کبھی نہیں لاسکیں گے، چاہے ایک دوسرے کے مددگار ہوں''۔

اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ یہ امامؑ تو تازیانہ لگا کر گئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا راز ان پر ظاہر ہے۔ اس آیت کو پڑھتے ہوئے اور سناتے ہوئے گزرنا یہ بتا رہا ہے کہ انہیں ہمارے راز کا علم ہے۔

صورت اُن سینوں کی یہ ہے کہ مشیتِ خدا کا ان حضرات کو علم ہے۔ آپ حضرات نے اکثر یہ سنا ہے کہ ان حضراتؑ کی شان یہ ہے کہ:

''وَمَا تَشَاؤُنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ''

''آلِ محمدؐ تم کچھ نہیں چاہتے، وہ چاہتے ہو کہ جو خدا چاہتا ہے''۔

میں نے اس آیت پر یہ جملہ کبھی کبھی کہا ہے کہ خداوند عالم کا یہ فرمانا کہ تم کچھ نہیں چاہتے، وہ چاہتے ہو کہ جو اللہ چاہتا ہے۔ یہ اللہ کا چاہنا ہے کہ ان حضراتؑ کو اللہ کی ہر مشیت کا علم ہو۔ جبھی تو وہ چاہیں گے کہ جو خدا چاہے جب وہ چاہنے کا انہیں علم ہو۔ اِس لمحے میں خدا ہم سے یہ چاہتا ہے، اُس لمحے میں خدا ہم سے یہ چاہتا ہے۔ جب تک چاہنے کا علم نہ ہوگا، چاہا کیسے جائیگا؟ میں یہ کہتا ہوں کہ چاہنا اتنا کمال نہیں ہے جتنا کہ چاہنے کا علم ہونا۔ کمال تو یہ ہے کہ مشیتِ خدا کے عالم ہیں اور ہر ہر آن کی مشیت کو جانتے ہیں اور اسی صورتِ حال کو آئمہ علیہم السلام نے یوں بیان کیا ہے کہ ہمارے قلوب وہ آئینہ ہیں جس میں مشیتِ خدا کا عکس پڑتا رہتا ہے۔

کیا کہنا ان سینوں کا اور کیا کہنا ان دلوں کا! اور میں اس زمانے کی مناسبت سے یہ جملہ نہ کہہ دوں کہ سینے کتنے معظم تھے، یہ نقلِ قرآن، یہ عبارتِ قرآن ہمارے سامنے ہے نا کتابت کی

صورت میں، کوئی بے ادبی اگر اس سے کرے اور اس کی کوئی بے حرمتی کرے، وہ کیا مسلم رہ جائیگا؟ پھر جس سینے میں اصلِ قرآن ہو، وہ سینہ کیسا معظم ہوگا!

اسی بناء پر مجھے نظر آتا ہے کہ ایک موقع ایسا بھی آیا تھا کربلا میں کہ مظلومِ کربلا نے بند آنکھیں کھولی ہیں اور یہ جملہ کہا ہے کہ:

"یَا ھٰذَا لَقَدْ اِرْتَقَیْتَ مَرْتَقاً عَظِیْماً"

"اے بے ادب! تو نے عظیم مقام پر پیر رکھا ہے"۔

جن سینوں میں اصلِ قرآن ہو اُن سینوں پر تیروں کا مینہ برسے! ان سینوں کو چھلنی کر دیا گیا۔ تیر پشت پر نہیں لگ رہے تھے، تیر سینے پر لگ رہے تھے۔ اُن عظیم سینوں کو تیروں سے چھلنی کر دیا گیا۔ اب میں حضرات یہ جملہ کہنا چاہتا ہوں، یہ میں اپنا عقیدہ، اپنا جذبہ پیش کر رہا ہوں کہ وہ تیر جو امامؑ کے سینے پر لگے، بہت لگے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ اُن تیروں کی اتنی اذیت نہ پہنچی ہوگی جتنی اُس نیزہ کی پہنچی ہوگی جو سینۂ اکبر پر لگا ہوگا۔ ہم شکلِ پیغمبر ہے، یادگارِ رسولؐ ہے، موذنِ فوجِ خدا ہے۔

عاشورہ کی صبح کی اذان کا کہنے والا، اس لئے کہ:

"خَلْقاً وَ خُلْقاً وَ مَنْطِقاً بِرَسُوْلِکَ"

جنابِ علیؑ اکبر کی خصوصیات میں یہ بات ہے کہ آپ خلقاً، خُلقاً، منطقاً، صورت میں رسولؐ سے مشابہت، خُلق میں رسولؐ سے مشابہت، آواز میں، گویائی میں بھی رسولؐ سے مشابہت رکھتے ہیں۔

بے غیرتو! جب وہ آواز اذان تم نے سنی، جب بھی تمہیں رسولؐ یاد نہ آئے۔ اللہ، اللہ۔ کیا داغ لگا ہوگا۔ قلبِ حسینؑ پر، علیؑ اکبر کا شہید ہو جانا۔ ابھی چونکہ ذکر تھا، اس لئے میں بھی ذکر کر دوں۔ یہ عشرہ کیوں اُنؑ کے ذکر سے خالی رہے۔

علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ ہم یہ طے نہیں کر سکتے کہ شجاعت کے اعتبار سے علیؑ اکبر زیادہ

تھے یا عباسؑ! شانِ علیؑ اکبر بھی حضرات کوئی معمولی شان نہیں ہے۔

فلک پیر تجھے شہ کی ضعیفی کی قسم

علی اکبر سا زمانے میں جواں اور بھی ہے

کیا حال ہوا ہوگا امام علیہ السلام کا جب علیؑ اکبر نے عرض کیا ہوگا کہ بابا! مجھے بھی اجازت دیجئے۔ اجازت کے بغیر تو نہیں جاسکتے تھے۔ علیؑ اکبر نے امامؑ سے اجازت چاہی۔ امامؑ نے نگاہ اٹھا کر علیؑ اکبر کے منہ کو دیکھا۔ ایک نظر کی چہرۂ علیؑ اکبر پر، مگر کیسی نظر تھی وہ، نظر کی بہت سی اقسام ہوتی ہیں۔ محبت کی نظر سے بھی دیکھا جاتا ہے، حیرت کی نظر سے بھی دیکھا جاتا ہے، ولولہ کی نظر بھی ہوتی ہے، شوق کی نظر بھی ہوتی ہے، مگر معصومینؑ کے کلام میں یہ جملہ ہے:

"فَنَظَرَ عَلَیْهِ نَظْرَةَ آیِسٍ مِنْهُ"

امامؑ نے علیؑ اکبر کے چہرے پر ایک نظر کی اور وہ کوئی اور قسم نظر کی نہ تھی، مایوس نظر سے دیکھا، نااُمید ہونے کی نظر سے دیکھا۔

اجازت تو مل گئی مگر اشارہ ضرور ہوا ہوگا۔ ماں بہنوں سے، پھوپھی سے بھی رخصت ہولو۔ خیمے میں علیؑ اکبر ضرور گئے ہوں گے۔ جب گئے ہوں گے اور آخری بار رخصت ہو رہے ہوں گے، اہلِ دل سوچیں، اس وقت کیا کہرام برپا ہو رہا ہوگا۔ خیمۂ معلی میں کیا تلاطم ہوگا۔ پرچہ نویس فوج یزید کا بیان کرتا ہے کہ خیمے کے اندر کا حال تو مجھے کیا معلوم ہوسکتا تھا، مگر میں دور کھڑا ہوا یہ دیکھ رہا تھا، علیؑ اکبر کے خیمے سے نکلتے وقت بار بار یہ ہو رہا تھا کہ کبھی پردہ اٹھ جاتا تھا، کبھی گر جاتا تھا۔ پردہ خیمے کا کبھی گرتا ہے، کبھی اٹھ جاتا ہے جس سے میں یہ سمجھ رہا تھا کہ علیؑ اکبر خیمے سے نکلنا چاہتے ہیں، پردہ اٹھتا ہے، بیبیاں لپٹ جاتی ہیں۔ اٹھا ہوا پردہ پھر گر جاتا ہے۔

بہر حال سواری چلی مگر امام کا دل بھی ساتھ ساتھ۔ یہ اس فرزند کی رخصت کا واقعہ ہے۔ مظلومِ کربلا جب کوئی مسافر جاتا تھا میدان کی طرف، اُس کے پیچھے پیچھے تو نہیں جاتے تھے مگر یہ جنابِ علیؑ اکبر کی روانگی کا واقعہ ہے کہ اِدھر بیٹا گھوڑے پر سوار ہو کر چلا، دیکھا تو یہ دیکھا کہ باپ

پیچھے چلا آ رہا ہے: ''بابا! کچھ کہنا ہے؟'' ارشاد ہو رہا ہے کہ ''نہیں بیٹا! کہنا کچھ نہیں ہے، تقدم، تم آگے بڑھو''۔

آگے چل کر مڑ کر دیکھا تو پھر یہ دیکھا کہ امام حسین علیہ السلام چلے آ رہے ہیں۔ ''بابا! کچھ کہنا ہے؟''

میں سمجھتا ہوں کہ جنابِ علیؑ اکبر کا یہ جملہ بھی وقت کی ضرورت سے تھا، وگرنہ یہ سمجھ رہے تھے کہ باپ کیوں آ رہے ہیں! منشائے امامؑ یہ تھا کہ جب تک یہ نورِ نظر، نظر کے سامنے ہے، جب تک نظر آ سکتا ہے، دیکھتا ہی رہوں۔ اب تو اس نورِ نظر نے خاک پر گرنا ہے اور خاک میں ملنا ہے۔

میدان میں پہنچے، پیاس کی جو حالت تھی، وہ تو تھی مگر نام علیؑ تھا۔ میدان پر جو رجز خوانی کی ہے، وہ آج بھی مکمل کی مکمل کتابوں میں موجود ہے۔ بڑے دندان شکن الفاظ ہیں آپؑ کے جو آپؑ نے کہے ہیں۔ اس کا پہلا مصرعہ یہ ہے کہ:

" اَنَا عَلِیُّ ابْنُ الْحُسَیْنِ ابْنِ عَلِی "

''میں علیؑ ہوں حسینؑ ابن علیؑ کا بیٹا!''

علیؑ کا نام ہی یہ ہے کہ کمزور کی بھی زبان پر آ جائے تو شجاع ہو جائے۔ یہ تو علیؑ بھی ہیں اور علیؑ کے پوتے بھی ہیں۔

" لایحکم فینا ابن الدعی "

اس کا ترجمہ اس وقت ذکر کے لائق نہیں ہے۔ بہر حال اپنے مخالفین کی اصل کو بیان کیا ہے کہ تم بے اصل ہو اور تم اپنے باپ سے نہیں ہو ورنہ تم آلِ محمدؐ سے بغض نہ رکھتے۔ کمالِ شجاعت سے آپؑ نے مردانہ وار حملے کیے۔ اب کون فیصلہ کر سکتا ہے کہ شجاعت میں عباسؑ علیؑ زیادہ ہیں یا علی ابن الحسینؑ زیادہ ہیں۔

بہر حال لڑتے لڑتے دادِ شجاعت دیتے دیتے ایک دم یہ خیال پیدا ہوا کہ باپ کو تن تنہا

چھوڑا ہے۔ اگر خاک پر پڑے ہوں گے تو کوئی اٹھانے والا نہیں، بیقرار ہو رہے ہوں گے تو کوئی غم کا خط کرنے والا نہیں، ذرا ایک نظر جا کر باپ کو دیکھ لوں۔

امامؑ کے پاس آئے، پدر بزرگوار نے نامدار بیٹے سے پوچھا: ''علیؑ اکبر! حال کیا ہے؟'' اب باپ کا سوال کرنا، ناز بردار کا سوال کرنا اپنے نازنین سے، جناب علیؑ اکبر نے جواب دیا:

''یَا اَبَتِ اِنَّ الْعَطَشَ قَدْ قَتَلَنِیْ وَثِقْلُ الْحَدِیْدِ اَجْھَدَنِیْ.....''

''بابا جان! پیاس نے مجھے مار ڈالا ہے اور لوہے کے بوجھ نے مجھے تھکا دیا ہے اگر اس وقت ایک گھونٹ پانی کا مل جاتا تو میری گئی ہوئی طاقت واپس آ جاتی اور میں دل بھر کر قتال کرتا''۔

امام علیہ السلام نے سنا۔ کیسی مظلومیت ہے، کیا نوبت پہنچ گئی، جوان بیٹا، وقت آخر بھی ہے اُس کا، پیاس کی شدت کا اظہار کرے اور باپ ایک گھونٹ پانی کا نہ دے سکے۔ دورِ امتحان تھا آلِ محمدؐ کے لئے۔ امامؑ نے جواب میں فرمایا کہ ''بیٹا! اب تھوڑی دیر میں پیاس بجھ جائے گی، ساقی کوثر تمہارا انتظار کر رہے ہیں''۔

یہ سنتا تھا کہ جناب علیؑ اکبر نے عرض کیا کہ ''بابا! جب میں میدان میں بڑھ بڑھ کر حملے کرتا ہوں تو میرے کان میں آواز آتی ہے، کوئی کہتا ہے کہ:

مَرْحَباً بِکَ یَا وَلَدِیْ وَیَا قُرَّۃَ عَیْنِیْ

شاباش! میرے لال، مرحبا،

یہ آواز میرے کانوں میں آتی ہے، چاروں طرف دیکھتا ہوں مگر بولنے والا کوئی نظر نہیں آتا''۔

امامؑ نے رو کر کہا کہ بیٹا! وہ تمہارے دادا علیؑ مرتضٰی ہیں، تمہاری شجاعت کی شان دیکھ رہے ہیں اور گویا زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ علیؑ اکبر، زندگی میری بھی میدانوں میں گزری ہے، بڑی بڑی مہم مجھے پیش آئی ہے، مگر شاباش، علیؑ اکبر، بہت لڑا ہوں میں، مگر پیاسا نہیں لڑا۔ تین

دن کے میرے پیاسے فرزند، کیا کہنا تیری ہمت کا اور کیا کہنا تیری شجاعت کا"۔

امام فرماتے ہیں کہ" بیٹا! امیرالمومنین جامِ کوثر لئے کھڑے ہیں، تمہارا انتظار کر رہے ہیں"۔

بس یہ سننا تھا کہ پھر پلٹے، دادِ شجاعت پھر دینے لگے۔ زخم کھا رہے ہیں، تیر بھی لگ رہے ہیں، آخر وہ نوبت بھی آگئی کہ اب شہسوار سے گھوڑے پر سنبھلا نہیں جارہا۔ مگر غیرتِ فاطمی اور غیرتِ ہاشمی، گھوڑے پر سنبھلا نہیں جاتا مگر جنابِ علیؑ اکبر نے دونوں ہاتھ گھوڑے کی گردن میں ڈال دیئے اور جھک گئے۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ جھک جانا تھا کہ وار پر وار ہونے لگے، تلوار پر تلوار برسنے لگی، ابھی گرے نہیں ہیں زمین پر۔

"قَطَعُوْهُ اِرْبًا اِرْبًا" "بدن ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا"۔

اب وہ ہاتھ بھی گھوڑے کی گردن میں نہ رہ سکے۔ جب چھوٹنے لگے ہاتھ تو جنابِ علیؑ اکبر نے باپ کو پکارا اور پکار کر یہ نہیں کہا کہ بابا آیئے، صرف اتنا کہا کہ:

"یَا اَبَتِ عَلَیْکَ مِنِّی سَلَام" "بابا! علیؑ اکبر کا آخری سلام قبول کیجئے"۔

الا لعنة اللّٰہ علی القوم الظالمین

آٹھویں مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِىْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ.

قرآنِ مجید کی اس آیت میں حقیقتِ قرآن کو واضح کیا جا رہا ہے۔ ہر شے کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ حقیقت کا کوئی مجاز ہوتا ہے۔ ہر شے کی کوئی اصل ہوتی ہے اور ہر اصل کی پھر نقل ہوتی ہے۔ خداوند عالم نے اپنے بیان کو لفظِ ''بَل'' سے شروع کیا۔ یہ لفظ ہماری زبان میں بھی اکثر و بیشتر بولا جاتا ہے، ''بلکہ''، ہم ''کہ'' کا اضافہ کرتے ہیں۔ ہے یہ وہی عربی کا لفظ ''بل'' جس کا ترجمہ بلکہ۔ یہ لفظ ہمیشہ تخیلاتِ ماسوا کی تردید کیلئے آیا کرتا ہے۔ کسی دوسرے خیال کو رد کرنے کیلئے اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔ پچھلے تخیلات کی نفی کے بعد اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ فرمایا جاتا ہے کہ بَلْ هُوَ ''بلکہ وہ قرآن آیاتِ بینات ہیں، اُن کے سینوں میں جن کو علم دیا گیا ہے، ہماری آیات کا انکار کرے گا نہیں کوئی سوائے ظالموں کے''۔ جس کے معنی یہ قرار پاتے ہیں کہ ہم نے جن سینوں کو مخزنِ خزانۂ قرآن قرار دیا ہے اور جن سینوں کو ظرفِ علومِ قرآن قرار دیا ہے، اُن سینوں کے ظرفِ علومِ قرآن ہونے کا منکر وہی ہوگا جو ظالم ہوگا۔

حقیقتِ قرآن یہ ہے کہ قرآن اصل میں اُن آیاتِ بینات کا نام ہے جو کہاں ہیں؟ کاغذوں میں نہیں! زیرِ نظر نہیں! کانوں میں آنے والی چیزیں نہیں! یہ تو وہ آیاتِ بینات ہیں جو اُن کے سینوں میں ہیں جن کو علم دیا گیا۔ (صلوٰۃ)۔

نزولِ قرآن کے بارے میں بھی خداوند عالم نے اپنے حبیب کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ:

''نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ''

"یہ قرآن روح الامین کے ذریعے سے تمہارے دل پر اترا ہے"۔

تمہارا سینہ اس قرآن کی منزل ہے۔ ہر نازل محتاج منزل ہوتا ہے۔ ضروری ہے کہ منزل پہلے سے ہو، پہلے سے منزل ہوگی تو کوئی اس پر نازل ہوگا۔ قرآن نازل ہے اور صدورِ اہلِ علم اُس قرآن کی منزل ہیں۔

آج قاریوں نے کچھ اپنی قرأت کی سہولت کیلئے منزلیں قرار دی ہیں۔ مشہور ہے کہ وہ سات منزلیں ہیں۔ تیس پارے ہیں، سات منزلیں ہیں۔ میں کسی اور رخ کی طرف تو نہیں جانا چاہتا۔ اصل میں کسی مہینے میں تھوڑا تھوڑا قرآن پڑھنے کی غرض سے اُس مہینے کے تیس دن قرار دے کر تیس پارے قرار دیئے گئے ہیں۔ سات منزلیں بھی قرآنِ مجید کی اُس کو ایک ہفتہ میں ختم کرنے کے لئے قرار دی گئی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ سات قرآن کی منزلیں ہیں۔ لیکن حقیقتاً دھوکہ لگ رہا ہے۔ قرآن کی منزل خود قرآن کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ منزلیں قرآن کی نہیں ہیں، یہ تو قاری کی منزلیں ہیں کہ یہ یہاں سے چلتا ہے، وہاں پر پہنچ کر رک جاتا ہے۔ قرآن کی منزلیں جہاں قرآن رہتا ہو، اُترتا ہو، ٹھہرتا ہو، برقرار رہتا ہو، وہ ہیں اصل میں قرآن کی منزلیں اور قرآن اُن منزلوں کے بارے میں صاف پتہ دیتا ہے کہ:

" صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ "۔

نکتہ رس حضرات سے میں خاص طور پر کہوں گا کہ قرآن کا یہ لفظ، ظاہر میں، معنی ہے کہ اُن کے سینوں میں آیات بینات ہیں جن کو علم دیا گیا۔ یہاں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ علم پہلے دیا گیا ہے اور علم دیئے جانے کی بناء پر انہیں سینوں کو مخزنِ خزانہ قرآن قرار دیا گیا۔

قرآنِ کریم کے بارے میں حاملِ قرآن نے، قرآن کی پہلی منزل نے، یعنی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جن کا قلب طاہر قرآن کی پہلی منزل قرار پایا، وہ فرماتے ہیں، ایک جملہ کافی ہے آپؐ کے فرمانے کا، ورنہ حدیث تو طولانی ہے:

" ظَاهِرُهٗ اَنِيْقٌ وَبَاطِنُهٗ عَمِيْقٌ "

''ظاہر اس کا نہایت خوشنما ہے اور باطن اُس کا گہرا ہے''۔

سرکار فرماتے ہیں کہ:

''قرآن کا ایک ظاہر ہے اور اُس کا ایک باطن ہے اور اُس کے باطن میں ایک اور باطن ہے یہاں تک کہ سات باطن ہیں بلکہ ستر باطن ہیں''۔

جس قرآن کی جامعیت کا یہ عالم ہو، ہم تو حضرات ظاہر ہی کو لے کر مظاہرے کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کے دست و گریبان تک پہنچ رہے ہیں۔ ظاہر کی بھی حدِ آخر تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ باطن تو باطن بینوں کیلئے ہیں، اہلِ باطن کیلئے ہے۔ کیا کہنا اُن حضرات کے علم کا، اُن حضرات کی رفعتوں کا جو باطنِ قرآن کے جاننے والے ہیں۔ مفاہیم باطنِ قرآن اُن کے سینوں میں ہیں۔ اُنہی کے بارے میں ارشادِ الٰہیہ ہوتا ہے کہ:

''وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ''

''تاویلِ قرآن کا جاننے والا ہے کون! نہیں جانتا کوئی تاویلِ قرآن کو سوائے اللہ کے اور اُن کے جو علم میں راسخین ہیں''۔

نکتہ رس حضرات ذرا توجہ دیں میرے اس لفظ کی طرف کہ خداوند عالم نے پورے طور پر تاویلِ قرآن کے جاننے کی نفی کر دی۔ مستثنٰی قرار دیا ہے صرف اپنی ذات کو یا راسخینِ علم کی ذوات کو۔ آیت میں آپ لفظِ نبی اور لفظِ رسول الگ سے کہیں نہیں دیکھیں گے، ترتیب یہ نہیں ہے کہ:

''اِلَّا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ''۔

نامِ رسولؐ آیت میں الگ لیا ہی نہیں گیا۔ جب الگ لیا ہی نہیں گیا تو لامحالہ ہر شخص یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ خداوند عالم نے رسولؐ کو بھی راسخون فی العلم ہی میں رکھا ہے۔ راسخون فی العلم اُن حضرات کو کہا ہے جن میں سے ایک رسولؐ بھی ہیں۔ اب لفظِ راسخون فی العلم میں رسولؐ کا ہونا اور پھر جمع کا صیغہ یہ بتانا اُس کا کہ رسولؐ کے سوا بھی تو

ہیں۔ جبھی تو جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا۔ ان سب کیلئے ایک لفظ کا استعمال کیا جانا منجانب قدرت یہ بتارہا ہے کہ رسوخ فی العلم کی حیثیت ہر جگہ یکساں ہے۔ میں اگر لفظِ علماء کہہ رہا ہوں، اپنی قوم کے علماء کیلئے، امت کے علماء کیلئے، میں کبھی اس لفظِ علماء میں لغت کی بناء پر ذاتِ رسولؐ کو شامل نہیں کرسکتا۔ اگر شامل کروں تو پیغمبرؐ کی توہین ہے۔ کہاں قوم کے علماء، چاہے وہ کتنے ہی عالم کیوں نہ ہوں، اور کہاں رسولؐ کے علم کی حیثیت! فقہاء کہوں، علماء کہوں اور اس قسم کے جتنے بھی الفاظ استعمال کروں گا، غیر معصوم ہستیوں کیلئے، اُن میں میں معصوم کو کبھی شامل نہیں کرسکتا۔

یہاں سے اندازہ کرسکتے ہیں آپ حضرات کہ اگر راسخین فی العلم، جن کو رسولؐ کے ساتھ رکھا، جن کے ساتھ رسولؐ کو رکھا، اگر اُن کے علم کی حیثیت الگ الگ ہوتی، کہ رسول کا علم لدنی اور ان کا علم یہیں لکھ پڑھ کر ہماری طرح سے ہوتو خداوند عالم علیم رسولؐ کی توہین ہرگز گوارہ نہیں کرسکتا تھا۔

خدا جانے کیسی بلند مرتبہ ہیں وہ ہستیاں کہ اُن کیلئے ایک لفظ کہہ کر خداوند عالم نے ذاتِ رسولؐ کو بھی شامل رکھا ہے اُسی طرح سے:

"یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ"

صادقین

اس آیت میں بھی خداوند عالم نے نامِ رسول الگ سے نہیں لیا اور جب الگ نہیں لیا تو کون عقل مند یہ کہہ سکتا ہے کہ خداوند عالم نے صادقین کی پیروی کا حکم دینے کے باوجود رسولؐ کی پیروی کا حکم نہیں دیا۔ ماننا پڑے گا کہ صادقین اللہ نے جن حضرات کو کہا ہے، رسول بھی انہیں میں سے ایک ہیں۔ سب کیلئے لفظِ صادقین کا (ایک لفظ) کا آنا اس کی دلیل ہے کہ عنوانِ صداقت ان میں سے ہر ایک کا ایک ہے۔ شانِ صداقت ان میں سے ہر ایک کی ایک ہے۔ میرا رسولؐ اگر کاذب سے صادق نہیں ہوا بلکہ صادق ہی تھا اور صادق ہی رہا تو ان میں سے جو بھی ہے، وہ اُسی حیثیت کا ہے کہ وہ کاذب سے صادق نہیں ہوا بلکہ جب سے ہے صادق ہے اور جب تک ہے، صادق ہے۔ حیثیتِ صداقت کی وحدت بتارہی ہے لفظ کی وحدت۔

"آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ"

اب نظر ڈالیے گا کہ خداوند عالم کا یہ ارشاد کہ "بلکہ"، بلکہ سے مراد یہ ہے کہ جو تمہارے سامنے ہے، ہاتھ میں جو تمہارے ہے قرآن، کانوں میں جو تمہارے پڑتا ہے، زبانوں پر جو تمہاری آتا ہے، دکھائی جو تمہیں دیتا ہے، یہ سب نقلیں ہیں۔ اصلی قرآن تو وہ ہے جو اُن کے سینوں میں ہے جن کو علم دیا گیا۔ یہاں بھی خداوند عالم نے نام رسولؐ الگ نہیں لیا بلکہ صدور کہہ کر لفظِ جمع کا استعمال کیا اور اس میں کسے شک ہو سکتا ہے کہ ان صدور میں سب سے پہلا صدر صدرِ پیغمبرؐ ہے۔ سب سے پہلا سینہ ان سینوں میں رسولؐ ہی کا سینہ ہے۔

مگر خدا جانے کہ یہ سینے حیثیات میں، مراتب میں، رفعتوں میں، پاکیزگی میں کیسی وحدت لئے ہوئے ہیں کہ پروردگارِ عالم نے حیثیتِ رسولؐ کو الگ نہیں پیش کیا بلکہ سب کو ملا کر کہا کہ فی صدور الذین اوتو العلم ۔ اصل قرآن اُن سینوں میں ہے جن کو علم دیا گیا۔ اب آپ یہ اندازہ لگائیں کہ ایک جگہ خداوند عالم کا یہ فرمانا کہ اصل قرآن اُن سینوں میں ہے جنہیں علم دیا گیا، کہا جاتا ہے اور بے شک کہا جانا چاہئے کہ خداوند عالم نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اور "اِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ" کہہ کر خداوند عالم نے اصل حافظ اس قرآن کا اپنی ذات کو قرار دیا ہے یعنی حفاظت کرنے والا۔ یہ وعدۂ حفاظت اصل کے بارے میں ہے یا نقلوں کے بارے میں۔ اگر نقلوں کے بارے میں ہے تو اس کے معنی تو یہ ہونا چاہئیں کہ جب بھی قرآن نقل ہو کر آئے قیامت تک، برقرار رہے، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج سے صدہا برس پہلے کے قرآن کہاں ہیں، کتنے قرآن ہیں کہ جنہیں ہم نے اپنے ہاتھوں سے دفن کیا ہے۔ خدا حفاظت کا وعدہ کرے اور وہ دفن ہوتا رہے، وہ مختار ہے، میں آگے کوئی لفظ نہیں کہنا چاہتا ورنہ قرآن پر واردات بہت سے وارد ہوئے ہیں۔ تاریخ میں یہ واقعہ آپ کو ہر جگہ ملے گا کہ ولید ابن عبدالملک تفأل کرتا ہے قرآن مجید سے۔ سوال کرتا ہے اپنی کسی مراد کو نظر میں رکھ کر کہ میری مراد ملے گی یا نہیں۔ فال دیکھتا ہے۔ تفأل میں جو اس کے آیت نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ:

"قَدْ خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ"

"جو لوگ جبار ہوتے ہیں اور دشمن خدا ہوتے ہیں، وہ نامراد رہتے ہیں"۔

اب بتائیے یہ تو ہے ہی جبار، یہ تو ہے ہی عنید، ولید مثل یزید۔ بس اس آیت کا بیان ہوتا تھا اور اس آیت پر اس کی نظر کا پڑنا تھا، میں کس طرح سے کہوں اور کس زبان سے کہوں کہ اس نے قرآن کے ساتھ کیا سلوک کیا! وہ سلوک اس کا خود سامنے آئے گا۔

دست درازی ہے اور قرآن اُس کے ظلم کا نشانہ ہے اور جو کچھ وہ قرآن کے ساتھ کر رہا ہے، یہ دو شعر اُس نے پڑھے ہیں اور یہ دو شعر کہتا ہوا وہ کر رہا ہے، جو کچھ کر رہا ہے:

"کیا تو ہر جبار و عنید کو ڈراتا ہے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے، بے شک میں جبار بھی ہوں اور عنید بھی ہوں"۔

"جب تو حشر کے دن اپنے رب کے پاس جائے، کہہ دینا اے میرے مالک! مجھے ولید نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا"۔

خداوند عالم جس کی حفاظت کا وعدہ کرے، اُس پر کوئی یہ عمل کر سکتا ہے اور اُس پر قادر ہو سکتا ہے۔

قرآن کی یہ خصوصیت ہے کہ اُس کی ایک آیت دوسری آیت کی مفسر بن جاتی ہے۔ ایک جزو دوسرے جزو کا مفسر بن جاتا ہے۔ ذرا اس "فی" پر نظر رہے:

"فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ"

اصل قرآن وہ آیات بینات ہیں جو اُن کے سینوں میں ہیں جن کو علم دیا گیا۔

"فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ"

دوسرے مقام پر قرآن مجید کہتا ہے:

"لَا اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ"

ہیں کچھ ستارے جن کے اترنے کی قسم، جن کے نازل ہونے کی قسم اور حضرات یہ

عجیب پُر لطف بات ہے، میرے خیال میں روحانی لطف حاصل کریں آپ، خداوند عالم کے ارشادات میں یہ عنوان نظر آتا ہے کہ اگر وہ قرآنِ ناطق کی فضیلت بیان کرتا ہے، ایک قرآنِ صامت ہے، ایک ناطق ہے، کیا شک ہے اس میں کہ پیغمبر قرآنِ ناطق ہیں اور پھر جنگ صفین کی وہ آواز مولائے کائنات کی، امیرالمومنین کی کہ:

"اَنَا الْقُرْآنُ النَّاطِقُ"

"میں قرآنِ ناطق ہوں"۔

تو ایک عجیب پُر لطف منظر مجھے قرآنِ مجید میں یہ نظر آتا ہے کہ جب وہ قرآنِ ناطق مدح اور توصیف کرتا ہے تو فرماتا ہے قرآنِ صامت:

یٰسٓ وَالْقُرْآنِ الْحَکِیْمِ. اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ

"اے سید و سردار! قسم ہے مجھے قرآنِ حکیم کی، یقیناً تم مرسلین میں سے ہو، صراطِ مستقیم پر ہو"۔

قرآنِ ناطق کی مدح منظور تھی تو قرآنِ صامت کی قسم فرمائی۔ اب یہ مقام جسے میں پیش کر رہا ہوں، یہاں قرآنِ صامت کی حقیقت کو بیان کیا جا رہا ہے تو جب قرآنِ صامت کے متعلق بیان کرنا ہے تو قسم کس کی ہو!

"لَا اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ"

"کچھ ستارے ہیں اُن کے نازل ہونے کی (اترنے کی) قسم"۔

"اِنَّهٗ لَقُرْآنٌ کَرِیْمٌ"، جیسے وہاں تھا "اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ"، "قرآنِ کریم کی قسم! تم مرسلین میں سے ہو"۔

یہاں فرمایا جاتا ہے، کچھ ستاروں کی قسم!

یہ قرآن نہایت کرم والا ہے۔ کرم کے معنی ہیں بزرگ مرتبہ ہونا۔ یہ قرآن بزرگ مرتبہ ہے۔ اور ہے کہاں؟

"فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ"

آیت کو آیت سے ملایئے، وہاں تھا:

"فی صدور الذین اوتو العلم"

''اُن کے سینوں میں ہے جن کو علم دیا گیا''۔

یہاں فرمایا جاتا ہے:

"فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ. لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ"

ایک محفوظ کتاب میں ہے، اس کو مَس نہیں کریں گے سوائے اُن حضرات کے جن کو پاک و پاکیزہ قرار دیا گیا۔ امر نہیں ہے، خبر ہے، غلط ہے یہ جملہ کہ اُسے کوئی مَس نہ کرے۔ اس لفظ کا یہ ترجمہ یہاں نہیں ہے۔ اور میں ذرا سا شبہ یہ مٹاتا ہوا آگے بڑھوں کہ ہم تو یہی سمجھ سکے ہیں کہ اس کا مطلب ہے چھو دینا۔ لیکن مَس کے معنی صرف چھو دینے ہی کے نہیں ہیں۔ جب فرشتے نے جناب مریم کو بشارت دی ہے:

"اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَهَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا"

''میں تمہارے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لئے آیا ہوں کہ میں تمہیں ایک پاکیزہ لڑکے کی ولادت کی بشارت دوں''۔

تو آپ (جناب مریم) نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

"اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ"

''میرے بیٹا ہو کیسے سکتا ہے جبکہ کسی بشر نے مجھے مَس نہیں کیا''۔

یہ چیزیں سوچنے کی ہوتی ہیں، سمجھنے کی ہوتی ہیں۔ اگر مَس کے معنی یہاں چھونے کے لیں گے تو جملہ غلط ہے۔ ناممکن ہے کہ ابتدائے پیدائش سے اس وقت تک جناب مریم کو کسی نے چھوا تک نہ ہو۔ ماں نے نہیں چھوا، باپ نے نہیں چھوا، عزیز و اقرباء نے نہیں چھوا، کیا چھونے سے مقصد محض چھو دینا ہے؟

فرماتی ہیں کہ کیسے میرے بیٹا ہوسکتا ہے جبکہ کسی بشر نے آج تک کبھی مجھے مَس نہیں کیا کیونکہ لَم ہوتا ہے تاکیدِ نفی کیلئے، ماضی کی ہمیشگی کیلئے۔ "لَمْ يَمْسَسْنِيْ": "مجھے کسی بشر نے کبھی مَس نہیں کیا" ۔ یہاں مس سے مراد چھو دینا نہیں ہے، تصرف کرنا ہے۔ مجھ پر کسی بشر نے آج تک تصرف نہیں کیا۔ خداوند عالم کا یہ فرمانا کہ قرآن مجید کتابِ مکنون میں ہے، سوائے مطہرین کے کوئی اُس پر تصرف نہیں کرسکتا۔ سوائے مطہرین کے کوئی اُس کو برت نہیں سکتا، اس پر تصرف نہیں کرسکتا۔ اُسے کوئی صَرف میں نہیں لاسکتا۔ اُس کو صَرف میں لانا صِرف مطہرین کا کام ہے۔ مطہرین کا ذرا ترجمہ تو کیجئے اردو میں، تو حقیقت واضح ہوجائے۔ سوائے مطہرین کے قرآن کو کوئی مَس نہیں کرسکتا، مَس کریگا ہی نہیں قرآن کو، مَس کیا ہی نہیں جاسکتا وہ قرآن جو کتابِ مکنون میں ہے۔

اگر لوحِ محفوظ ہی مراد لیں تو وہاں مطہرین کہاں ہیں؟ کوئی نہیں تصرف کرسکتا اُس قرآن پر جو کتابِ مکنون میں ہے، سوائے اُن کے جن کو پاک قرار دیا جاچکا ہے، جن کو پاک کیا جاچکا ہے، پاک کیا جاچکا ہے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کو پاک کرنے والا کوئی اور ہے۔ اگر میں نے اپنے ارادے سے وضو کیا اور اپنے ارادے سے غسل کیا تو میں پاک تو ہوگیا مگر میں مطہر نہیں ہوں۔ یہ لفظ غلط ہے کہ مجھے پاک کیا گیا۔ پاک کیا گیا کے معنی ہی یہ ہیں کہ پاک کرنے والا کوئی اور ہے۔

مطہرون کا لفظ یہ صاف بتا رہا ہے کہ وہ تطہیر کرنے والا کوئی اور ہے اور وہ کون ہے تو آیت صاف کہتی ہے کہ:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا

بعض لوگ جو یہ کہہ دیتے ہیں کہ لفظِ مذکر اس آیۂ تطہیر میں لفظِ اہلِ بیت کی مناسبت کی بناء پر ہے، ورنہ یہ ضروری نہیں ہے کہ مرد ہی مراد ہوں تو اگر یہاں یہ لفظ مذکر بفرضِ محال، اس کی تردید میں نے بحمدللہ ایسی کی ہے کہ جو قابلِ دید ہے، (خدا کرے کہ وہ رسالہ چھپ گیا ہو یا چھپنے

والا ہو)، بہر حال میں یہاں صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھنا چاہتا ہوں کہ جن کا یہ تخیل ہے کہ لفظِ اہلِ بیتؑ، کیونکہ عربی قواعد کی رو سے یہ لفظ مذکر ہے، اس کی مناسبت سے ضمیریں مذکر کی آئی ہیں، تو خدا کے بندو! ''لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ'' میں کون سا لفظ اہلِ بیتؑ ہے کہ جس کی مناسبت سے مطہرون مذکر کے صیغے میں آیا ہو۔ یہاں تو کوئی لفظ ہی نہیں ہے کہ جس کی مناسبت کا کوئی ذکر ہو۔

''اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ''، حقیقتاً وہاں ''فِىْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ''، اور یہاں ''فِىْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ''، دونوں آیتوں کا اتصال یہ بتا رہا ہے کہ انہیں صدور کو خداوند عالم کتابِ مکنون کہہ رہا ہے اور اسی کتابِ مکنون کو خداوند عالم ''فِىْ صدور الذين اوتوا العلم'' کہہ رہا ہے۔

انسان پر لفظِ کتاب کا اطلاق

علمائے اسلام نے اس کی نظیریں پیش کی ہیں کہ انسان پر لفظِ کتاب کا اطلاق کوئی نئی بات نہیں ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے مشہور ارشادات ہیں:

دواءک فیک ولا تشعر وداؤک منک ولا تبصر

وانت الکتاب المبین الذی باحرفه اظهر المضمر

''انسان! تیری دوا تجھ ہی میں ہے مگر تجھے شعور نہیں ہے اور تیرا مرض تجھ ہی سے ہے مگر تو بصیرت نہیں رکھتا اور اے انسان! تو وہ کتابِ مبین ہے، جس کے حروف سے پوشیدہ رازِ قدرت نمایاں ہوتے ہیں''۔

آپؑ نے عام انسانوں کو بھی کتاب کہا ہے۔ اگر یہ عام انسان کتاب ہیں تو جس کو خدا کہے، وہ کیوں نہ کتابِ مکنون کہلائے۔ فی صدور الذین وہاں اور فی کتابِ مکنون یہاں اور جب وہ اصل قرآن ہے ہی اُن کے سینوں میں جن کی تطہیر اللہ نے کی ہے تو خدا کیوں نہ کہہ دے:

''لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ''

''اس کو کوئی تصرف میں نہیں لا سکتا سوائے مطہرین کے''۔

کیونکہ مطہرین ہی کے وہ سینے ہیں جن سینوں میں اصلِ قرآن ہے۔ حضرات! قرآن

کی پہلی منزل بلفظِ قرآن سینہ ہی ہے:

"نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ"۔

جب پہلی ہی منزل سینہ ہے تو اُس کے بعد ایسا ہی کوئی سینہ ہو جو اُس کی منزل بنے اور وہ سینہ بھی اگر جائے تو پھر ایسا ہی کوئی سینہ ہو۔ میں یہاں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب نقلِ قرآن، سامنے ہمارے یہ نقل ہی تو ہے، آج ہی لکھا گیا ہے، کون عقلمند یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ اصل قرآن ہے، یہ اُترا تھا، یہ قرآن اُترا تھا جو آپ کے گھر میں ہے۔ نقل ہی تو ہے۔ جب نقلِ قرآن کی عظمت کا یہ عالم ہو کہ وضو کے بغیر چھونا حرام ہو تو ذرا سوچئے کہ اصلِ قرآن کیسے سینوں میں ہو اور جن سینوں میں ہو، وہ کیسے پاک و پاکیزہ ہوں۔ تو آیت پھر یہی کہے گی کہ ایسے پاک و پاکیزہ ہوں کہ:

"يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا"

اب میں یہاں نکتہ رس حضرات سے بات کہنا چاہتا ہوں کہ نبی کی ہر بات اہم ہے اور پھر آخری نبی کی آخری بات!

"دو بھاری اور گرانقدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں، ایک خدا کی کتاب اور ایک میری ذریت، یعنی میرے اہلِ بیتؑ ہیں، دونوں سے متصل جب تک رہو گے (میں ضامن ہوں کہ) میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوں گے"۔

تو حضرات! جدائی کیسی؟ نہ ان سینوں سے قرآن نکل سکتا ہے، نہ وہ سینے قرآن سے خالی ہو سکتے ہیں!

"اور (وضاحت فرماتے ہیں سرکارؐ) یہاں تک کہ دونوں وارد ہوں گے مجھ پر، میرے پاس حوضِ کوثر پر"۔

دونوں ساتھ ساتھ وارد ہوں گے، کبھی سوچا بھی ہے کسی نے کہ یہ دونوں جو ساتھ ساتھ حوضِ کوثر پر پہنچیں گے نبیؐ کے پاس، ان دونوں کے ساتھ ساتھ پہنچنے کا عنوان کیا ہوگا؟ کیا یہ عنوان ہوگا کہ اہلِ بیتؑ پہنچ رہے ہیں اور ان کے ہاتھ یا ان کی بغل میں قرآن بھی ہے تو وہ قرآن ان کے

ہاتھ میں ہے یا سر پر ہے، اُن کے جیب و گریباں میں ہے وہ قرآن؟

قیامت ہے کہ اس پر قیامت نہیں آئی۔ ظاہر ہے کہ اگر اس قرآن سے مراد ہم کتابی شکل سمجھیں تو یہ سب مسائل بھی ہوں گے کہ وہ مجلد ہے یا غیر مجلد؟ چمڑے پر ہے یا کاغذ پر؟ زبرجد کی تختیوں پر ہے۔ اُن چیزوں پر قیامت کا اثر نہیں پڑا تو واقعی وہ کارخانہ کیسا خوش نصیب کارخانہ ہوگا جس کا بنایا ہوا وہ کاغذ ہوگا۔ اور وہ کاتب اُس کے ہاتھ چوم لیں، وہ کیسا خوش نصیب کاتب ہوگا جس کا وہ لکھا ہوا ہے۔ جس کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآنِ مجید قیامت میں اہلِ بیتؑ کے ساتھ ساتھ جائیگا، اور وہ روشنائی بنانے والا جس سے وہ لکھا گیا ہے، وہ بھی کیسی مقدس روشنائی، کیسی پائیدار روشنائی کہ صورِ اسرافیل کا جس پر اثر نہ ہوا، دونوں ساتھ ساتھ پہنچیں گے تو طے کیجئے کس طرح پہنچیں گے؟

کیا وہ مکتوب قرآن ہوگا؟ مادّی شکل میں ہوگا جسے ہاتھ میں لیا جا سکے، جسے حمائل کر کے لٹکایا جا سکے۔ ارے قرآن مجید کی آیت صاف کہہ رہی ہے:

"اصل قرآن تو اُن کے سینوں میں ہے جن کو علم دیا گیا ہے"

ان حضراتؑ کے سینوں میں اصل قرآن موجود ہے، دونوں ساتھ ساتھ پہنچے، نہ یہ اس سے جدا ہوں، نہ وہ اس سے جدا ہے۔

پھر حضرات! قیامت کے بارے میں ایک اور خبر بھی قرآنِ مجید نے دی ہے، شفاعت تو کریں گے ہی پیغمبرؐ انشاء اللہ، خدا کرے کہ ہم بھی اُن لوگوں میں ہوں، اگرچہ اس لائق نہیں ہیں، آپ تو فرمائیں گے ہی، لیکن قرآنِ مجید میں بتایا ہے کہ جہاں شفاعت فرمائیں گے، وہاں شکایت بھی کریں گے بلکہ میں کہہ سکتا ہوں اپنی نظر کی بناء پر کہ قرآنِ مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے کہ جس سے یہ پتہ چلے کہ حضورؐ جب شفاعت کریں گے تو اُس شفاعت کے الفاظ کیا ہوں گے۔ الفاظ بیان نہیں کیے گئے۔ یہ ہے کہ سفارش ہوگی۔ مقامِ محمود اس مقام کا نام ہے جس مقام پر آپ کھڑے ہو کر شفاعت فرمائیں گے۔

مگر یہ نہیں بتایا کہ شفاعت کیا کہہ کر کریں گے، الفاظ کیا ہوں گے، انداز شفاعت کیا ہوگا؟ مگر قرآنِ مجید میں یہ ضرور بتایا ہے کہ شکایت جن کی کریں گے، کن لفظوں میں کریں گے۔ اس شکایت کے الفاظ قرآنِ مجید میں موجود ہیں اور وہ شکایت پوری آیت ہے کہ آپؐ خدا کی بارگاہ میں عرض کریں گے:

''اے میرے رب! میری ہی قوم نے اس قرآن سے ترکِ تعلق کرلیا تھا''۔

تو معلوم ہوتا ہے کہ جس قرآن کا ذکر ہو رہا ہے، وہ وہیں قریب موجود ہے آپؐ کے، وہ آپؐ کے پہلو میں موجود ہے۔ لفظِ مہجور پر ایک نظر ڈالئے۔ سفر کرنا کسی مقام سے؟ اپنے گھر سے، اپنے وطن سے مسافرت اور چیز ہے، مہاجرت اور چیز ہے۔ مسافرت اس وقت کہیں گے جب مسافر پلٹنے کا ارادہ رکھتا ہو (لیکن ہم تو اپنے اپنے وطنوں کو ایسا خیرباد کہہ کر آئے ہیں کہ ہمارا ادھر رخ بھی نہیں)۔

بالکل کسی چیز سے قطع تعلق کر کے اسے چھوڑ دینا مسافرت نہیں ہے، مہاجرت ہے۔ یہ ہے مہاجرت اور پھر وہاں پلٹنے کا ارادہ بھی نہ ہو، یہ ہے مہاجرت۔ میری قوم نے قرآن کو مہجور کر دیا تھا۔ یعنی ایسا چھوڑا کہ پیچھے مڑ کر اسے دیکھا تک نہیں۔ بالکل ترکِ تعلق کرلیا۔

جنابِ والا! کون سا مسلمان ہوگا اور کون سا اسلامی فرقہ ہوگا جس نے قرآن کو ایسا چھوڑ دیا ہو کہ پھر اس کی طرف پلٹنے کا خیال بھی نہ کیا ہو۔ یہ لفظِ مہجور خود بتا رہا ہے کہ ایسا چھوڑا کہ پھر اس کی طرف پلٹنے کا خیال ہی نہ رہا۔

''میری قوم نے''، اب شکایت کفار کی نہیں ہو رہی، ''میری قوم نے''، کفار کی شکایت لفظِ قرآن سے ہو بھی کیسے سکتی ہے؟ جنھوں نے نبی کو نبیؐ نہ مانا ہو، اسلام کو دین نہ مانا ہو، جنھوں نے اسلام کے بتائے ہوئے خدا کو خدا نہ مانا ہو، اُن کی شکایت یہ کیسے ہو سکتی ہے کہ انھوں نے قرآن کو چھوڑ دیا۔ چھوڑے گا تو وہ جس نے کبھی لیا بھی ہو۔ کبھی رخ بھی ہو ادھر۔ مگر اُس کے بعد ایسی بے رخی برت لی ہو کہ اُس کی طرف رخ ہی نہ کیا ہو۔ اس سے بالکل ترکِ تعلق کرلیا ہو۔

"ھٰذَا الْقُرْآن"، "اس قرآن کو"۔ صاف بتا رہا ہے یہ لفظ جس قرآن کا ذکر کر رہے ہیں پیغمبرؐ، وہ آپؐ کے پہلو میں موجود ہے۔

اشارہ بعید کا نہیں، قریب کا ہے۔ تو حضرات! وہ کون سا قرآن ہے جو پیغمبرؐ کے وہاں قریب ہوگا، پھر وہی آیات پر کھنے کو جی چاہتا ہے کہ:

"اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْم"۔

یہ حضرات چونکہ مخزنِ اصلِ قرآن ہیں، اس لئے قرآنِ ناطق ہیں اور حقیقتاً قرآن ہیں۔ یہ ہیں وہ قرآن، یہ ہیں نبیؐ کے وہ اہلِ بیتؑ اطہار جن کو جفا کارانِ امت نے ایسا چھوڑا کہ ادھر رخ نہ کیا اور کہاں چھوڑا؟ دامن تھامنے کے اعتبار سے چھوڑا، امامت ماننے کے اعتبار سے چھوڑا، طیب و طاہر ماننے کے اعتبار سے چھوڑا، مگر ظلم سے نہیں چھوڑا۔ ظلم کرنے سے انہیں نہیں چھوڑا، ستانے سے انہیں نہیں چھوڑا۔ کیا کیا ظلم و ستم اُن پر ڈھائے۔ ترکِ تعلق ہی کر لیا ہوتا۔ نہ مانا ہوتا مگر اللہ، اللہ، نہ ماننے پر ہی اکتفاء نہیں ہے:

سنتے ہیں کہ کربلا میں گھر زہراؑ کا
ایسا اُجڑا کہ پھر نہ آباد ہوا

شہید کرنے کے بعد بھی ان شہیدوں کی لاشوں کو نہ چھوڑا۔ چھوڑ دیتے، دفن نہ کرتے، کوئی نہ کوئی ترس کھا کر، رحم کھا کر آ کر دفن کر دیتا۔ مگر شہادت کے بعد گلوئے بریدہ سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے۔ خدا جانے کیا ظلم ہو رہا ہے لاش پر کہ ایک آواز پیدا ہوتی ہے گلوئے بریدہ سے:

"میں وہ سبطِ رسولؐ ہوں جسے بغیر جرم و خطا کے قتل کیا گیا اور قتل کے بعد بھی قاتلوں کو صبر نہ آیا (ان کا دل ٹھنڈا نہ ہوا)، گھوڑوں کی ٹاپوں سے قتل کے بعد"،

اور امام علیہ السلام کا یہ جملہ بھی کتنا دردناک جملہ ہے، (انجان بن کر نہیں، بھولے سے نہیں کہ چلتے ہوئے لاش گھوڑوں کی ٹاپوں میں آ گئی):

"مجھے جان کر پامال کر ڈالا"۔

اور اس کے بعد امام علیہ السلام عزاداروں کو پکارتے ہوئے کہتے ہیں:

''عزادارو! جب خوشگوار پانی پینا، مجھے بھی یاد کرلینا، جب کسی مسافر کا، مقتول کا، دردناک واقعہ سنو تو مجھے بھی رو لینا۔

''یہ حسرت میں دل میں لے کر جا رہا ہوں کہ کاش تم روزِ عاشورہ ہوتے اور سب کے سب ہوتے، میری پوری قوم آج ہوتی اور یہ حسرت اس لئے نہیں کہ میرے کام آتے یا میرا ہاتھ بٹاتے یا میرے پیاسوں کیلئے پانی لاتے یا میرے شہیدوں کیلئے قبریں بناتے۔ یہ نہیں۔ اس لئے تمنا رہ گئی، یہ حسرت اس لئے ہے کہ کاش تم ہوتے اور مجھے ایک نظر دیکھ لیتے۔'' تنظرونی'' کہا،'' تنصرونی ''نہیں کہا کہ میری نصرت کرتے، مجھے ایک نظر دیکھ لیتے (اور وہ ایک نظر اس وقت دیکھتے):

''جب میرے ہاتھوں پر میرا بچہ تھا، جب میں اصغر بے آب کیلئے پانی کے ایک گھونٹ کا سوال کر رہا تھا، میرا سوال کرنا دیکھتے، اور جس بے رحمی سے جواب دیا گیا ہے، اُس بے رحمی کو دیکھتے''۔

الا لعنة الله علی القوم الظالمین

نویں

مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَ زَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ. وَ کَرَّهَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ''۔

''لوگو! ہم نے ایمان کی محبت تم کو عطا کر دی اور تمہارے دلوں کو اُن کی محبت سے ہم نے سجا دیا اور نفرت پیدا کر دی ہے ہم نے تمہارے دلوں میں کفر و فسوق و عصیان کی''۔

ارشادِ ربانی ہے کہ ہم نے ایمان کی محبت تم کو عطا کر دی اور جہاں ہم نے تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت کا بیج بو دیا اور ایمان کی محبت کا خزانہ تمہارے دلوں میں رکھ دیا؛ ''وَکَرَّهَ''، اسی طرح ہم نے تمہارے دلوں میں نفرت بھی رکھی۔ تو بہر حال مکروہ بنا دیا ہے ہم نے کفر و فسوق اور عصیان کو۔ اب حضرات شاید میں اپنی ناتوانی کی وجہ سے پوری بات نہ کہہ سکوں مگر سننا اور سمجھنا میرے بافہم مجمع کے ہاتھ میں ہے کہ نفرت پیدا کر دی ہے ہم نے تمہارے دلوں میں کفر و فسوق و عصیان کی۔ دنیا راشدین کہتی ہے مگر ہمارے نزدیک تو راشدین وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں ایک ایمان کی محبت ہو اور کفر و فسوق و عصیان کی نفرت اور حقیقت میں امر یہ ہے کہ ہم نہ سمجھ پاتے قرآنی آیت کو۔ ہم یہی سمجھتے کہ یہاں ایمان کے معنی ماننے کے ہیں، کفر کے معنی نہ ماننے کے ہیں، عصیان کے معنی گنہگاری کے ہیں، فسوق کے معنی بدکاری کے ہیں۔ مگر حضرات ایک معرکہ میں زبانِ رسولؐ سے یہ انکشاف کر دیا جب سرکارِ دو عالم نے فرمایا اپنے برادر کیلئے:

''بَرَزَ الْاِیْمَانُ کُلُّهٗ اِلَی الْکُفْرِ کُلِّهٖ''۔

یہاں سرکارِ دو عالم نے ایمان ماننے کیلئے نہیں اور کفر نہ ماننے کیلئے نہیں کہا۔ علیؑ کو کُلِّ ایمان کہا اور عمرو ابن عبدود کو کُلِّ کفر کہا۔ یہ ایمان ہیں اور وہ کفر ہیں۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ کوئی انسان ایسا بھی ہوسکتا ہے جسے خداوند عالم ایمان کہے اور کوئی صورت نما انسان ایسا بھی ہوسکتا ہے

کہ جس کو خداوند عالم کفر کہے اور یہیں سے اربابِ یقین کیلئے موجبِ یقین ہو رہی ہے یہ بات کہ ہے کوئی صاحبِ ایمان ایسا کہ جسے "حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ" کہہ کر قدرت نے عین ایمان کہا اور ہے کوئی کافر ایسا کہ جس کے بڑھتے ہوئے کفر کی بناء پر قدرت نے اُسے عین کفر کہا اور ہے کوئی ایسا جس کو فسق و فجور کی بناء پر قدرت نے بجائے فاسق کہنے کے عین فسوق کہا اور حضرات! یقیناً ہے کوئی ایسا کہ عاصی کہنے کی بجائے اُسے عصیان کہا۔ (صلوٰۃ)۔

امام شافعی کا کہنا ہے کہ:

"یَا اَھلَ بَیتِ رسولِ اللّٰہِ حُبُّکم فرضٌ مِن اللّٰہ"

"اہلِ بیتؑ آپ حضرات کی محبت فرض ہے اللہ کی طرف سے"۔

میرا عقیدہ یہ ہے کہ امام شافعی نے جو فرمایا ہے میں اُن کی دلداری کرتے ہوئے کہوں گا کہ آپ کا فرمان ہمارے سر آنکھوں پر۔ آپ کا اتنا بھی کہہ دینا بڑی بات ہے اور بہت کچھ غنیمت ہے۔ مگر ساتھ یہ جملہ کہنا چاہتا ہوں میرے حضرات سامعین جہاں جہاں ہیں میری محنت کو ضائع نہ کر دیں۔

امام صاحب فرض تو وہ ہوتا ہے جو کسی وقت فرض ہو، کسی وقت نہ ہو۔ نماز و روزہ فرض، مگر کیا ہر وقت فرض ہیں۔ حج وقت مقررہ پر ہوگا، ہر مہینہ اور ہر وقت تو نہ فرض ہوگا۔

تو جناب والا فرض وہ ہوتا ہے جو کسی وقت فرض ہو، کسی وقت فرض نہ ہو۔ دوسری بات یہ کہ فرض تو وہ ہے جس کا بدل بھی ممکن ہو۔ ایک ضعیف و ناتواں اگر روزہ نہ بھی رکھ سکے تو ایک کفارہ ہر روزے کے بدلے میں دیدے تو بدل ہو گیا۔

تیسری بات یہ کہ فرض وہ ہے جس میں تخفیف بھی ہو۔ چار رکعتی نماز سفر میں دو رکعتی ہو گئی۔ چوتھی بات کہ ایک فرض وہ ہے جس میں استطاعت کی شرط ہو۔ حج اُس پر واجب ہے جس میں استطاعت ہو۔ زکوٰۃ اُس پر فرض ہے جس میں استطاعت ہو اور جس میں نہیں ہے، اُس پر ساقط ہے تو امام شافعی کا یہ فرمانا کہ اے آلِ محمدؐ آپ کی محبت فرض ہے، یہ کیسے ہوا؟ کیا حبِ آل

محمد کسی وقت فرض ہے، کسی وقت نہیں ہے۔ کوئی وقت حب آلِ محمدؐ سے خالی رہ سکتا ہے؟ یا پھر بتایئے کیا حب آلِ محمد کا کوئی بدل ہے جیسے فرض میں بدل موجود ہے۔ اُس کا بے بدل ہونا تو آیت نے بتادیا:

"لَا اَسْئَلُکُمْ" "ہم اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے"۔

حب آلِ محمدؐ کا کوئی بدل نہیں ہے۔ ہاں کوئی اور موقع نہیں دیا گیا کہ اگر آلِ محمدؐ سے محبت نہ کرسکو اپنی کم ظرفی کی وجہ سے تو اور کسی سے کرلو۔ اس حب آلِ محمد کی کوئی قصر ہے کہ اگر پوری محبت نہ کرسکو تو آدھی کرلو۔ تو جناب والا حب آلِ محمد تو نادار پر بھی ہے، مسافر پر بھی ہے، بیمار پر بھی ہے، یہاں تک کہ سوتو رہا ہے مگر حب آلِ محمدؐ دل میں لئے ہوئے ہے، راستہ چل رہا ہے اس محبت کو ساتھ لیکر جانا ہی تو رنگ لائے۔

جناب والا! یہ خصوصیت کہ جس سے نہ کوئی وقت خالی ہو، نہ کوئی تخفیف ہو، نہ کوئی جس سے مستثنیٰ ہو، نہ جس میں کوئی بدل ہو، اس کا نام فرض نہ رکھئے، اُس کی توہین ہے یہ۔ فرض اُسے کہتے ہیں جس کے چھوڑ دینے سے انسان گنہگار ضرور ہوتا ہے مگر بے دین نہیں ہوتا۔ مگر حب آلِ محمدؐ وہ ہے جسے چھوڑ دینا گنہگاری نہیں ہے، کفر ہے۔ اس پر حضرات سب سے بہتر رسولؐ کا فرمان ہے:

"حُبُّھُمْ اِیْمَانٌ وَبُغْضُھُمْ کُفْرٌ"

"میرے اہلِ بیتؑ کی محبت ایمان ہے اور اُن کی عداوت کفر ہے"۔

جناب فرزدق نے امام زین العابدین علیہ السلام اور ہشام ابن عبدالملک علیہ ما علیہ دونوں کے سامنے بشانِ سید سجاد علیہ السلام جو قصیدہ پڑھا اور جس کی داد امامؑ نے دی ہے اور جس کی تصدیق کی ہے، میرا ایمان ہے کہ قصیدہ فرزدق کا تھا، امام نے پسند کرلیا، اب وہ کلام امام ہے اور یہ میں اس عنوان کی بناء پر کہہ رہا ہوں کہ یہ طے شدہ ہے کہ رسولؐ یا امامؑ کے سامنے کوئی شخص دینی بات بیان کرے اور رسولؐ نہ ٹوکیں تو وہ حدیث ہوگئی۔ تو فرزدق فرماتے ہیں اور کتنا نفیس فرماتے ہیں امامؑ کے سامنے، امامؑ کے بارے میں:

"حُبُّهُمْ دِيْنٌ وَ بُغْضُهُمْ كُفْرٌ"

"اُس گھرانے کے فرد ہیں یہ کہ جس گھرانے کی محبت دین ہے اور جس گھرانے سے بغض رکھنا کفر ہے۔ جس گھرانے کا قرب حاصل کرلینا نجات ہے اور بخشش کا سہارا ہے"۔

حضرات! ایمان وہ شے ہے جو چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، تندرستی میں، بیماری میں، حضر میں، سفر میں، تونگری میں، ناداری میں، غرضیکہ ہر حالت میں ساتھ رہتا ہے۔ جو ہر وقت ساتھ رہے وہ اصول ہے جو کسی کسی وقت ہو، وہ فروع ہے۔ یہیں سے ثابت ہوتا ہے کہ حب آلِ محمدؑ اصولِ دین میں سے ایک اصل ہے، فروعِ دین میں لاکر اس کو فرض کرنا سر آنکھوں پر تو ہے ہمارے، آپ کا اتنا بھی کہہ دینا ہمارے لئے بہت غنیمت ہے، مگر حب آلِ محمدؑ کو فرض کہنا فرضی بات ہے، حب آلِ محمدؑ ایمان ہے، دین ہے۔ بغضِ آلِ محمدؑ کفر ہے اور اب میں یہ کہوں گا کہ اللہ اللہ کتنا اہتمام ہے قدرت کی طرف سے اس محبت کیلئے کہ سرکارِ دوعالمؐ منبر نشین ہیں، دونوں زانوں پر حسنؑ و حسینؑ، جو وہ افراد ہیں کہ جن کی محبت دین ہے، تشریف فرما ہیں۔ سرکار فرماتے ہیں:

"الحسن والحسین سیدا شباب اهل الجنة"

"حسنؑ و حسینؑ جوانانِ جنت کے سردار ہیں"۔

غور کیجئے خود جوان ابھی نہیں ہیں مگر جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ یہ حدیث مسلم بین المسلمین اور بین الفریقین ہے۔ پھر سرکارِ دوعالمؐ فرماتے ہیں:

"اِنَّهُمَا اِمَامَانِ" "یہ دونوں امام ہیں"۔

اور یہاں سے آپ گھبرا نہ جائیں میرے جملے پر۔ میرا ایک خاص مفہوم ہے اور وہ یہ کہ امام تو سب سے پہلے علی مرتضیٰؑ ہیں۔

اوّل امام شیعوں کے ہیں مرتضیٰ علیؑ
جن کو پکارتے ہیں مصیبت میں یا علیؑ

مگر کچھ عجیب سی بات ہے کہ علیؑ کیلئے جو مخصوص لفظ ہے وہ ہے امیر المومنینؑ، کسی تقریر میں اور کوئی کہہ دے تو کہہ دے مگر ہمارا کوئی مقرر اپنی تقریر میں جب علیؑ کا نام لیتا ہے تو کبھی یہ نہیں کہتا کہ امام علیؑ نے یہ فرمایا۔ امام کا استعمال جزو نام علی نہیں قرار دیا گیا، حالانکہ ایمان ہے اس پر کہ وہ پہلے امامؑ ہیں۔ مگر چونکہ سرکارؐ نے خاص طور پر علیؑ کو امیر المومنین کہا ہے تو یہ ہے بات پیغمبر کی کہ ہم بھی وہی کہیں جو رسولؐ نے کہا ہے۔ امیر المومنینؑ کہا ہے امام المتقین کہا ہے تو حضرات میں یہاں کہوں:

"علی امیر المؤمنین و امام المتقین"

''علیؑ مومنین کے امیر ہیں اور امام ہیں متقین کے''۔

یہاں ایک بات کہوں گا اور ہے بڑی پُر لطف یہ بات۔ کیا کہنا سرکارؐ کے ارشاد کا کہ اپنے ہر جملے میں آپؐ نے علیؑ کی بھی پہچان کروادی کہ وہ کیا ہیں اور مومنین کی بھی پہچان کروادی کہ وہ کون ہیں۔ اس لئے کہ خدا کا بنایا ہوا امیر تو ہر ایک کا امیر ہو گیا ہے یہاں تک کہ شمس و قمر کا بھی، ملائکہ کا بھی امیر، وہ انس و جن سب کا امیر ہے، ماننے والے کا بھی امیر، نہ ماننے والے کا بھی امیر، تو سرکارؐ نے کیوں مخصوص کر دیا یہ کہہ کر کہ علی امیر المؤمنین۔ علیؑ مومنین کے امیر ہیں۔ یہ تخصیص کیوں کی؟ اور جو امام ہو گا ہر ایک کا امام ہوگا۔ ماننے والے کا بھی اور نہ ماننے والے کا بھی۔ جیسے خدا ہے، ماننے والے کا بھی خدا ہے اور نہ ماننے والے کا بھی خدا ہے۔ حقیقت تو نہیں بدل سکتی انکار کرنے سے تو یہ امام کی تخصیص میں کیوں کہا کہ یہ متقین کے امام ہیں؟

میں اپنے مجمع سے یہ کہوں گا کہ تخصیص اصل میں اس بناء پر ہے کہ امیر سب کے ہیں لیکن امیر مانا ہے مومنین نے، اور امام سب کے ہیں، لیکن مانا ہے ان کو امام متقین نے۔ اسی لئے فرمادیا اور بتادیا کہ اگر یہ دیکھنا چاہیں کہ مومنین کون ہیں، مومنین وہ ہیں جنہوں نے علیؑ کو امیر مانا ہو اور متقین کون ہیں؟ وہ ہیں جنہوں نے علیؑ کو امام مانا ہے۔

چہ خوش بود کہ برآید گرشمہ دو کار

ایک پنتھ دو کاج اس کو کہتے ہیں کہ علیؑ کی بھی پہچان کروادی مومنین کی بھی پہچان کروادی اور ساتھ میں منافقین کی بھی پہچان کروادی۔

اور جنابِ والا! سرکارؐ نے خاص طور پر علیؑ کیلئے جو لفظ کہا ہے خم غدیر میں، غدیر کا مشہور عالم جلسہ اعلانِ ولایت کے بعد، اعلانِ مولائیت کے بعد اور اس آیت قرآنی کے نزول کے بعد کہ:

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ"

سرکارؐ نے ایک خیمہ نصب کروایا ہے اور اس خیمہ میں علیؑ مرتضیٰ کو بحیثیت امیر و امام بٹھایا ہے اور تمام حجاج کو حکم دیا ہے کہ ہر ایک اس خیمہ میں جائے اور علیؑ کو سلام کرے یا امیر المومنین کہہ کر۔ یہاں تک کہ یہ حکمِ عام تھا کہ ازواجِ نبی بھی جو ساتھ ہیں، وہ بھی تعمیل کریں۔ اس لئے خاص طور پر علیؑ مرتضیٰ کے بارے میں لفظ امیر المومنین مخصوص ہے۔ لفظِ امام کا آغاز حسنؑ و حسینؑ سے ہوتا ہے۔ ان دونوں کو حضورؐ زانوں پر بٹھا کر یہ اعلان فرما رہے ہیں:

"اِنَّھُمَا اِمَامَان" "یہ دونوں کے دونوں امام ہیں"۔

اب حضرات! متفق علیہ ہے یہ حدیث۔ حضورؐ ارشاد فرما رہے ہیں کہ لوگو تم ہی کو اللہ نے ان سے محبت کرنے کا حکم نہیں دیا۔

"اَمَرَنِیَ اللّٰہُ اَنْ اُحِبَّھُمَا"

"اللہ نے مجھے بھی حکم دیا ہے کہ میں بھی اللہ کی طرف سے دونوں کی محبت پر مامور ہوں"۔

اس کے بعد ایک اور جملہ آتا ہے:

"وَاُحِبُّ مَنْ یُحِبُّھُمَا"

"اور خدا کا حکم جو مجھے آیا ہے ان دونوں سے محبت رکھنے کا تو وہ اپنی جگہ ہے۔ خدا کا حکم مجھے یہاں تک ہے کہ میں اُس سے بھی محبت رکھوں جو ان سے محبت رکھے۔ میں اُن کی محبت پر مامور ہوں جو ان حضراتؑ کے محب ہیں"۔

اب ذرا محبانِ اہلِ بیتؑ اپنی معراج پر نظر ڈالیں ۔ جو حسینؑ کا محب ہے تو حضورؐ خود اُس کے محب ہیں اور بہ امرِ خدا ۔ چنانچہ آپ حضرات نے صدہا دفعہ سنا ہوگا کہ حضورؐ تشریف لے جا رہے ہیں کہ راہ میں کچھ بچوں کو دیکھا، ایک بچے کی طرف ملتفت ہو گئے ۔ اُس کو گود میں لیا، اُس کے سر پر دستِ شفقت پھیرا ۔ مجمع حیران کہ غیر بچہ جو سرکار کے خاندان کا نہیں، وطن کا نہیں، اس سے اتنے مانوس کیوں ہیں ۔ لوگوں نے پوچھا کہ سرکارؐ اس بچے سے جو آپؐ کے گھرانے کا نہیں ہے، آپ کا یہ اندازِ محبت کیوں؟ تو سرکارِؐ دو عالم ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے اس بچے کو ایک کام یہ کرتے دیکھا کہ جہاں سے میرے حسینؑ کا قدم اٹھتا ہے، یہ وہاں کی خاک اٹھا کر اپنی پیشانی پر مل لیتا تھا ۔ اسے اتنی محبت ہے میرے حسینؑ سے کہ یہ خاکِ قدمِ حسینؑ اٹھا اٹھا کر اپنی پیشانی پر ملتا ہے اور گریاں ہو گئے ۔ پیغمبرِ مصطفیٰؐ نے فرمایا کہ:

"اخبرنی جبرائیل اللہ یکون من انصارہٖ فی وقعۃِ کربلا"

"جبرائیل نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ یہ بچہ میرے حسینؑ کے انصار میں سے ہوگا واقعۂ کربلا کے وقت" ۔

آپ سمجھ گئے ہوں گے حضرات کہ اُس کا ذکر ہے، اُس مردِ فقیہہ کا ذکر ہے کہ جس کی طلب میں سلطانِ کربلا نے قاصد بھیجا ۔ رسالے نہیں طلب کئے، لشکر نہیں بلائے، فوجیں نہیں اکٹھا کیں ۔ امامؑ کا قاصد جا رہا ہے حبیب ابن مظاہر اسدی کیلئے ۔ امامؑ نے جناب حبیب ابن مظاہر کو اپنے اس فرمان میں اَعْرَف لکھا ہے جو عارف سے بھی بلند تر لفظ ہے ۔ امامؑ نے فرمایا ہے:

"من الحسین ابن علی ابن ابی طالب اِلی الرَّجلِ الفقیہ حبیب ابن مظاھر" ۔

"یہ خط حسینؑ کا ایک مردِ فقیہہ کے نام" ۔

کیا حقیقت ہے کسی مجتہدِ اعظم کی امامؑ کے اس لفظ کے بعد کہ سرکار امام حسینؑ حبیب ابن مظاہر کو فقیہہ کہہ رہے ہیں ۔ طولانی خط کی ضرورت نہیں تھی، عارف کیلئے اشارہ ہی کافی ہے،

فرماتے ہیں کہ:

"حبیب انت اعرف بحقنا من غیرک"

''حبیب! ہمارے حق کو تم ہر شخص سے کہیں زیادہ پہچاننے والے ہو''

"فلا تبخل بنفسِکَ الْیَوم" ''آج اپنی جان سے بخل نہ کرنا''۔

قاصد روانہ ہوا۔ کوفہ پہنچا۔ حبیب کے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے، شہر چونکہ پُر آشوب تھا، حبیب نے پوچھا، کون؟ قاصد نے کہا کہ:

"انا برید الحسین ابن علی ابن ابیطالب"

''میں حسینؑ کا قاصد ہوں''۔

بیقرار ہو کر حبیب نے دروازہ کھولا اور امامؑ کے قاصد کے ہاتھ کو چوما، پیشانی کو بوسہ دیا۔ اُس نے امامؑ کا خط پیش کیا۔ حبیب نے نہیں پڑھا۔ حالت یہ ہے کہ کبھی امامؑ کے خط کو اپنے سر پر رکھتے ہیں، کبھی اپنے سینے پر لگاتے ہیں۔ کھول کر پڑھا تو زار و قطار رونے لگے۔ کہنے لگے کہ مجھے اس دن کا انتظار تھا۔ غلام کو حکم دیا کہ میرا گھوڑا تیار کرو اور فلاں مقام پر جا کر میرا انتظار کرو۔ غلام اُن کے راہوار کو تیار کر کے لے گیا اور جو مقام فرمایا تھا وہاں انتظار کرنے لگا۔ جنابِ حبیب بھی ایسے راستوں سے گزرے کہ ان کو گزرتا دیکھ کر کوئی یہ نہ سمجھے کہ کوفہ سے باہر جا رہے ہیں۔ اُن راستوں سے گئے جو اُن کی زراعت کی طرف جاتے تھے تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ وہ اپنی کھیتی دیکھنے جا رہے ہیں۔

ان کے وہاں تک پہنچنے میں دیر لگ گئی۔ غلام منتظر تھا۔ مگر غلام بھی حسینؑ کے غلام کا غلام تھا۔ اعرف کا غلام تھا تو اُسے عارف ہونا ہی چاہئے تھا۔ جب اپنے آقا کی آمد میں دیر دیکھی تو زبانِ ظاہر سے یہ کہا:

''دیر لگ گئی ہے میرے آقا کو آنے میں، خدا جانے کہیں ارادۂ نصرتِ امامؑ بدل تو نہیں گیا۔ تو خیر میں کچھ دیر اور انتظار کرتا ہوں، اگر وہ نہ آئے (تو گھوڑے سے کہا کہ) میں تجھ پر سوار

ہو کر نصرتِ امامؑ کیلئے خود چلا جاؤں گا"۔

غلام کا یہ کہنا تھا کہ گھوڑے کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اُس نے سبزے پر سے اپنا منہ اٹھا لیا۔ اس حالت کو جناب حبیب نے جو آ کر دیکھا ہے تو غلام سے پوچھا کہ کیا واقعہ ہوا ہے؟ یہ گھوڑے کی آنکھوں سے آنسو کیسے بہہ رہے ہیں؟ غلام نے کہا کہ بات تو کچھ نہیں، میں نے یہ کہا تھا۔ بس یہ سننا تھا کہ جناب حبیب کا دل تڑپ گیا اور آپ نے چشمِ تصور سے امامؑ کو دیکھ کر یہ جملہ کہا:

"میری جان قربان ہو فرزندِ رسولؐ آپ پر، جانوروں پر آپ کی مظلومیت کا یہ اثر ہے تو مجھ پر کیوں نہ ہو اور غلام تک آپؑ کی نصرت کے آرزومند ہیں تو میرے آقا میں آزاد ہوتے ہوئے کیوں نہ پہنچوں؟"

گھوڑے پر سوار ہوئے اور غلام سے فرمایا کہ جا میں نے خدا کی رہ میں تجھے آزاد کر دیا۔ اب غلام یہ سن کر رونے لگا اور اُس نے کہا کہ اب تک آپ نے مجھے اپنی خدمت میں رکھا اور آج جب مجھے بھی سعادت پانے کا موقع مل رہا ہے تو مجھے آپ اپنے آپ سے جدا کر رہے ہیں۔ خدا کیلئے مجھے بھی ساتھ لے لیں، میں بھی اپنی جان کا گوہر فرزندِ رسولؐ پر نچھاور کروں گا۔

جناب حبیب اپنے غلام کو ساتھ لئے ہوئے چلے۔ فرق اتنا تھا کہ جناب حبیب راہوار پر تھے، غلام پاپیادہ تھا۔ چلتے چلتے گھوڑے کی بلندی سے جناب حبیب کو خدا جانے کیا نظر آ گیا کہ آپ نے فوراً لگام سے پیر کھینچے اور اترنے کا ارادہ کیا۔ غلام نے کہا کہ ابھی تو بارگاہِ امامؑ دور ہے۔ آپ ابھی سے پاپیادہ ہوئے جاتے ہیں۔ تو جناب حبیب نے کہا کہ تو پیادہ ہے اور میں گھوڑے کی اونچائی پر ہوں۔ جو میں نے دیکھا ہے، وہ تو نے نہیں دیکھا۔ بلندیٔ چوبِ خیمۂ امامؑ مجھے نظر آ گئی ہے۔ اب بے ادبی ہے کہ میں گھوڑے پر سوار رہ سکوں۔

بے ادب پا منہ اینجا کہ عجب درگاہ است
سجدہ گاہِ ملک، روضۂ شہنشاہ است

امامؑ کی تو طلب تھی ہی، امامؑ منتظر تھے۔ یہ حبیب کا مقام ہے کہ امامؑ منتظر ہیں۔ امامؑ حبیب سے ملے اور کربلا کے خارزار میں کوئی محل تو تھا نہیں مگر حبیب کو جو دیکھا تو امامؑ کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ امامؑ کا مسکرانا تھا کہ جتنے بھی انصار امامؑ تھے، سب کے خوشی کے قہقہے بلند ہو گئے۔ سب ہشاش بشاش ہو گئے یہاں تک کہ وہ خوشی کی آوازیں رسولؐ کی نواسی کے کانوں تک بھی پہنچ گئیں۔ ثانیِ زہراؑ نے فرمایا جناب فضہؓ سے کہ ذرا باہر نکل کر دیکھو میرے بھائی کے انصار بہت خوش ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ میرے بھائی کی مدد کیلئے کوئی فوج آگئی ہے۔ جناب فضہؓ نے پلٹ کر عرض کیا کہ شہزادیؑ کوئی فوج یا رسالہ تو کوئی نہیں ہے۔ آپ کے بھائی کے بچپن کے رفیق حبیب ابن مظاہر آئے ہیں۔ جن کی آمد سے امامؑ بھی خوش ہیں اور انصار امامؑ بھی خوش ہیں۔

بس یہ سننا تھا کہ ثانیِ زہراؑ نے فرمایا: "میرے بھائی کے حبیب کو جا کر میرا سلام کہہ دو"۔

جناب فضہؓ خیمہ سے نکلتی ہیں اور پکار کر کہتی ہیں کہ اے حبیب! خوشا نصیب تمہارے کہ دخترِ علیؑ و فاطمہؑ، رسولؐ کی نواسی ثانیِ زہراؑ تمہیں سلام کہہ رہی ہیں۔ اس سلام کی آواز کو سننا تھا کہ جناب حبیب نے اپنا منہ پیٹ لیا۔ اپنے منہ پر طمانچے مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ کہاں میں گنہگار، کہاں رسولؐ زادی کا سلام، بھلا میں اس لائق کہاں کہ رسولؐ زادی مجھے سلام فرمائیں۔

میں کہوں گا کہ حبیب تم قدر دان تھے، زینبؑ کے سلام کا بوجھ نہ اٹھا سکے مگر کہاں تھے تم، کہاں سو گئے تھے، زینبؑ وہیں تھیں کہ اب نوبت یہ آگئی کہ یا تو تم اپنا منہ خود پیٹ رہے تھے، یا زینبؑ اپنے منہ پر طمانچے مار رہی تھیں۔

شامیاں بستند بازوئے زینبؑ و کلثوم را
اے فلک آں ابتداء این انتہائے اہلِ بیتؑ

الا لعنة الله علی القوم الظالمین۔

دسویں

مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَاءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ"۔ (احزاب: ۲۳)

"ہم نے ایمان والوں میں سے جن افراد کو چن لیا ہے، اُن کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ رجال ہیں (مرد ہیں)۔ دوسری صفت یہ ہے کہ انہوں نے اللہ سے جو عہد کیا، سچا عہد کیا۔ ان میں کچھ اپنی سچائی کا امتحان دے چکے اور کچھ منتظرِ امتحان ہیں اور انہوں نے اس عہد میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ یہ اس لئے ہے کہ اللہ صادقین کو ان کی سچائی کی جزا دے اور منافقوں کو سزا دے اور اگر چاہے تو ان کی توبہ قبول کرے"۔

یقیناً آپ حضرات کو بجائے خود یہ اندازہ ہے کہ یہ شب کون سی شب ہے۔ یہ رات وہ رات ہے کہ جس کو کربلا والوں نے جاگ کر گزارا ہے اور اس طرح سے جاگے ہیں کہ ذوقِ عبادت ایک طرف ہے اور شوقِ شہادت ایک طرف ہے۔ اسی بناء پر کسی حقیقت نگار نے خوب کہا ہے کہ:

لذتِ ذوقِ عبادت یک طرف

جذبۂ شوقِ شہادت یک طرف

موجبِ ثوابِ بے حساب ہے آج کی رات کو جاگ کر بسر کرنا۔ ذکرِ خدا میں، ذکرِ اہلِ بیتؑ میں اس رات کو گزارنا، نمازِ سیدؑ الشہداء کو بجالانا، زیارتِ سید الشہداء علیہ السلام کی تلاوت کرنا، لعن اور سلام کی تسبیحات کو پورا کرنا۔

حضرات! میں چاہتا ہوں کہ آج کا بیان مختصر رکھوں لیکن آیت جو میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہے، وہ مختصر نہیں ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ خداوند عالم کی زبانِ بے زبانی

پر جب ان حضرات کا ذکر آتا ہے تو پروردگار عالم اس ذکر کو مختصر رکھنا گوارا نہیں کرتا۔ اہم عبادات کو مختصر الفاظ میں بیان کر کے ختم کر دیتا ہے مگر خداوند عالم کے نزدیک ذکرِ اہلِ بیتؑ وہ ذکر ہے جس کا تعلق اصولِ دین سے ہے۔ اصولِ دین کے بیان میں اختصار قدرت کو ناگوار ہے۔ جب ان حضراتؑ کا ذکر آتا ہے تو یہ لطیف حکایت طویل تر بیان کی جاتی ہے۔ آیت کو سن کر، آیت کے ترجمے کو سن کر ہر شخص یہ فیصلہ آسانی سے کر سکے گا کہ ذکر کن حضرات کا ہو رہا ہے۔ فرمایا جاتا ہے:

"مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا"

"ہم نے ایمان والوں میں سے جن افراد کو چن لیا ہے، اُن کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ رجال (مرد) ہیں"۔

یہ سمجھنا میرے مجمع کیلئے یقیناً دشوار نہ ہوگا کہ یہاں لفظِ رجال یعنی یہ کہا جانا کہ وہ مرد ہیں، اس معنی سے نہیں ہیں کہ وہ عورتوں کے مقابلے میں جو صنف ہے مردوں کی، اس صنف کو بیان کیا جا رہا ہو۔ اس لئے کہ خداوند عالم نے "من المومنین" کہہ کر یہ معین کر دیا کہ ذکر مردوں ہی کا ہو رہا ہے۔ مستورات کو عربی میں مومنات کہا جاتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ جو مومنین میں سے چنے جائیں گے، وہ مرد ہی تو ہوں گے۔ یہاں مرد کہنے سے مراد حقیقتاً یہ ہے کہ وہ مردانِ وفا ہیں، مردانِ شجاعت ہیں، مردانِ استقامت ہیں اور اسی بناء پر اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے کسی نے کہا ہے:

شاہِ مرداں شیرِ یزداں قوتِ پروردگار
لافتیٰ الا علیؑ لا سیف الا ذوالفقار

میرا مجمع متوجہ ہو کر سنے کہ جو پہلا لفظ آیت نے استعمال کیا کہ اُن کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ مرد ہیں، زبانِ خدا اور زبانِ رسولؐ ایک نظر آ رہی ہے۔ آیت میں بھی، زبانِ پیغمبرؐ پر بھی جب ثناء وصفت آتی ہے تو فرماتے ہیں:

"لاعطین الرّایة غدا رجلا"۔

"کل میں پرچمِ اسلام دوں گا مرد کو"

لہجہ آیت اور لہجہ رسالتؐ ایک نظر آرہا ہے، ترتیب ایک ہے۔ سرکارؐ نے لفظِ رجُل کی تشریح میں فرمایا کہ مرد وہی ہوتا ہے رجُل، جو کرار ہوتا ہے، غیر فرار ہوتا ہے اور کون غیر فرار ہوتا ہے؟ اُس کے فرار نہ کرنے کا سبب کیا ہے؟ حضرات! نہ ثباتِ قدم کسی کا بے وجہ ہے اور نہ عملِ فرار کسی کا بے وجہ ہے۔ جو ٹھہرتا ہے، کسی وجہ سے ٹھہرتا ہے، جو فرار ہوتا ہے، کسی وجہ سے فرار ہوتا ہے۔ ثباتِ قدم کی وجہ سرکار بیان کرتے ہیں کہ کس وجہ سے غیر فرار ہیں، اس لئے کہ:

"یُحِبُّ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ"

''محب ہے خدا کا بھی اور خدا کے رسولؐ کا بھی''۔

اصل میں وہ محبت ہے کہ جو میدان سے ہٹنے نہیں دیتی۔ جہاں محبت ہوگی، وہیں قرار ہوگا۔ محبِ خدا کیلئے قرار اور محبِ دنیا کیلئے فرار ہے۔ یہی چیز آیت نے صاف لفظوں میں بیان کی ہے۔ جو حلقہ بگوشِ اسلام ہیں، انہیں پکارتے ہوئے قرآنی آیت کہہ رہی ہے:

"مِنکُمْ مَنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَمِنکُمْ مَنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَہ"

''تم میں سے کچھ ایسے لوگ ہیں جو طالبِ دنیا ہیں، کچھ ایسے لوگ ہیں جو طالبِ آخرت ہیں''۔

نہ سب طالبِ دنیا ہیں اور نہ سب طالبِ آخرت ہیں۔ یقیناً یہ آیت اُسی مقام کی ہے کہ جہاں چلے جانے والوں کی خداوندِ عالم شکایت کر رہا ہے۔ یہ آیت جنگِ اُحد کے بعد کی ہے۔ ظاہر ہے کہ طالبِ دنیا کا پیر جمے کیسے اور طالبِ آخرت کا پیر اکھڑے کیسے؟ جو آخرت کے طلبگار ہیں، وہ ثابت قدم ہیں، جو دنیا کے طلبگار ہیں، اُن کے پیروں میں ثبات ہو ہی نہیں سکتا، وہ دنیا کی طرف بھاگتے ہیں۔

غرضیکہ رجُل کی تشریح حدیث نے اس انداز میں کی ہے کہ رجُل کہتے کسے ہیں؟ کرار کو، غیر فرار کو، اب وہ غیر فرار اس لئے ہے کہ وہ محبت رکھتا ہے اللہ سے، اور اُس کے رسولؐ سے۔ اور فرمایا جاتا ہے کہ یہ محبت یک طرفہ نہیں ہے۔ حقیقتاً اگر یکطرفہ ہے تو وہ محبت محبت نہیں ہے۔

محبت کے جواب میں محبت نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ محبت کمزور ہے۔ ہر عمل کا ردِ عمل ہوا کرتا ہے۔ محبت کا جواب محبت ہے۔ اگر کمال محبت ہے تو یہ محبت واپس آئے گی بلکہ اگر میں یہ کہہ دوں تو بجا ہوگا کہ کمال شکر ہے تو یہ شکر بھی واپس آئیگا۔ وہ محب کیا جو نتیجے میں محبوب نہ ہو جائے۔ وہ شاکر کیا جو نتیجے میں مشکور نہ ہو جائے اور وہ ذاکر کیا جو نتیجے میں مذکور نہ ہو جائے۔ پھر یہ کہئے کہ وہ حامد کیا جو نتیجے میں محمدؐ نہ ہو جائے۔ (صلوٰۃ)۔

اگر اُدھر حمد کی انتہا ہے تو پھر اِدھر سے بھی حمد کا سلسلہ جاری ہوگا۔ اگر اِدھر سے محبت کی ابتداء ہے تو اُدھر سے بھی محبت پلٹ کر آئے گی۔ اگر اُدھر سے شکر کی انتہا ہے تو حضرات پھر یہ مقام نظر آئیگا کہ یہ خدا کے شاکر، خدا ان کا شاکر، یہ خدا کے ذاکر، خدا ان کا ذاکر۔ اگر یہ کسی حال میں ذکرِ خدا سے خالی نہ رہیں تو ردِ عمل یہ ہونا چاہئے کہ خدا کی بھی کوئی کتاب ان کے ذکر سے خالی نہ ہو۔ اس لئے اعلان کیا جاتا ہے کہ ان کا ذکر توراۃ میں بھی ہے اور انجیل میں بھی ہے۔

ارشادِ پیغمبرؐ اور ارشادِ خدا کتنا متفق ہے۔ سرکارِ دو عالم کی زبان پر بھی پہلا کلمہ "رجلاً" اور آیت کی زبان پر بھی "من المومنین رجال"۔ (صلوٰۃ)۔

اس کے بعد بیان کو آگے بڑھایا جا رہا ہے:

"صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ"

"یہ وہ ہیں جو معاہدے کو سچ کر دکھاتے ہیں، جو اُن کے اور خدا کے درمیان ہوا ہے"۔

"فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ"

"جن میں سے کوئی اپنے وعدے کو وفا کر چکا ہے اور کوئی وعدہ کے وفا کرنے کا انتظار کر رہا ہے"۔

کوئی انتظار میں ہے کہ کب مجھے وقت ملے اپنے وعدے کے وفا کرنے کا اور میں وفائے عہد کر کے سبکدوشی حاصل کر سکوں۔ کوئی جا رہا ہے، کوئی جانے کا مشتاق ہے۔ کوئی عہد کو پورا کر رہا ہے اور کوئی عہد پورا کرنے کیلئے بے چین و مضطرب ہے۔

"وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا"

''انہوں نے اپنے عہد اور ایفائے عہد میں ذرہ برابر رد و بدل نہیں کیا''۔

یعنی مطلقاً کوئی تبدیلی نہیں کی۔ میں درمیانِ کلام میں یہ لفظ کہنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ خداوند عالم نے اس وعدہ کو لفظِ عہد سے تعبیر نہیں کیا۔ عربی ذوق رکھنے والے میرے اس بیان کی تائید کریں گے۔ آیت میں لفظِ معاہدہ ہے۔ عہد میں اور معاہدہ میں فرق ہے۔ قتل میں اور مقاتلہ میں فرق ہے۔ بحث میں اور مباحثہ میں فرق ہے۔ اس لئے کہ یہ مصدر ہمیشہ وہیں استعمال ہوگا جہاں عمل یک طرفہ نہ ہو بلکہ جانبین سے ہو رہا ہو۔ ایک شخص نے ایک شخص کو قتل کر دیا، یک طرفہ عمل ہے لیکن جب مقاتلہ کہا جائے گا تو یہ ذکر اُس عمل کا ہوگا جو جانبین سے ہو رہا ہو۔ مکالمہ ہمیشہ اُس کلام کو کہا جائے گا جو دونوں جانب سے ہو۔ کچھ میں آپ سے کہہ رہا ہوں، کچھ آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ یہاں خداوند عالم نے لفظِ عہد نہیں استعمال کیا، معاہدہ کہا جا رہا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عہد ایک ہی جانب سے نہیں ہوا، جانبین سے عہد ہوا۔ خدا کے ان برگزیدہ بندوں نے عہد کیا خدا سے، مگر یک طرفہ نہیں ہے، خدا نے بھی کوئی عہد کیا ہے ان سے۔ ان کا عہد حقِ خدا میں، خدا کا عہد اِن کے حق میں۔ خداوند عالم اپنے عہد پر قائم، یہ حضرات اپنے عہد پر قائم۔

"وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ"

''اللہ سے زیادہ اپنے عہد کا پورا کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے''

یہیں سے معلوم ہو رہا ہے کہ خدا نے عہد لیا بھی ہے اور کیا بھی ہے۔ خدا اپنے ایفائے عہد کی تعریف کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ خدا سے بہتر اپنے عہد کا پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ جب یہ بندے ہو کر اپنے عہد سے نہ ہٹیں، کتنے ہی برگزیدہ سہی، بلند مرتبہ سہی، میری تو مخلوق ہی ہیں۔ جب یہ بندۂ خدا ہو کر اپنے عہد سے نہ ہٹیں، تو میں تو اِن کا خدا ہوں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں خدا ہو کر اپنا عہد پورا نہ کروں۔ اِن حضرات کا عہد ہے کہ بار الہا! تیری راہ

میں ہم ہر ظلم کو برداشت کریں گے، ہر مصیبت کو سہیں گے۔ مگر ہم تیری راہ میں رہیں گے۔ کتنا ہی ہم پر تشدد ہو، ہم اطاعتِ غیر کرنے والے نہیں ہیں۔ ہم غیر کی بیعت کرنے والے نہیں ہیں۔ کچھ ہو جائے ہمارا، ہماری اطاعتیں تیرے لئے ہیں۔ ہمارا خم ہونا تیرے لئے ہے۔ ہمارے سجود محض تیرے لئے ہیں۔ ہم کسی اور کیلئے جھک نہیں سکتے، بیعت کا ہاتھ کسی اور کیلئے نہیں بڑھا سکتے، چاہے اس سلسلۂ استقامت میں مصائب کے طوفان ہم پر آ جائیں، ہم اُن مصیبتوں کے جھیلنے کیلئے تیار ہیں۔ ان حضراتؑ کا عہد تو اس امر کا ہے۔ اب اگر یہ پوچھنا ہو خدا سے کہ بارالٰہا جو عہد تو نے کیا ہے ان حضرات سے، وہ کیا ہے؟ تو یہ آیت قرآن تشریح کر رہی ہے:

"اِذِابْتَلٰی اِبْرَاهِیْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ"

فرمایا جاتا ہے: "ہم نے ابراہیمؑ کا امتحان بار بار لیا، وہ ہر امتحان میں مکمل کامیاب ہوتے رہے تو پھر ہم نے چاہا کہ امتحان کی کامیابی کی سند دی جائے، سند دیتے ہوئے ہم نے کہا:

"اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا"

ابراہیمؑ! میں تم کو نوعِ انسانی کی ہدایت کیلئے امام قرار دے رہا ہوں"۔

یہ امامت سند ہے تمہارے امتحانات میں کامیابی کی۔ جناب ابراہیمؑ فوراً عرض کرتے ہیں جس کو آیت بیان کر رہی ہے اور خدا جانے ہمیں کیوں سنا رہی ہے؟ ہم کہاں اور منصبِ امامت کہاں؟

"قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ"

"کہا یہ منصب میری اولاد کیلئے (میری ذریت کیلئے)"۔

کسی نے بہت خوب کہا ہے کہ جناب خلیل نے امامت کی استدعا مِن اُمَّتِی، کہہ کر اپنی امت کیلئے نہیں کی۔ آپ حضرات خوب سمجھ سکتے ہیں کہ جناب خلیل اپنی اولاد کیلئے وہی چیز تو چاہ رہے ہیں جو آپ نے ابھی پائی ہے۔ امامت آپ نے پائی ہے، اسی امامت کی تمنا اپنی اولاد کیلئے کرتے ہیں۔ جواب ربانی سنئے:

"قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِيْنَ"

''ابراہیمؑ !میرا عہد ظالم نہیں پا سکتے''۔

اب خداوند عالم نے اپنا عہد کس چیز کو کہا، اُسی کو کہا جس کی تمنا ابراہیمؑ نے کی۔ خداوند عالم نے اس آیت میں واضح کردیا کہ میرا عہد جب کہا جائیگا تو مراد امامت ہوگی۔ (صلوٰۃ)۔

اب خدا کا عہد ان حضراتؑ سے اور ان حضراتؑ کا عہد خدا سے۔ انؑ کا عہد ہے مصیبتوں پر صبر، راہِ استقامت میں ثبات۔ یہ انؑ کا عہد ہے۔ ہم تیرے سوا خداوندا! نہ کسی کی اطاعت کر سکتے ہیں اور نہ غیر خدا کی بیعت کر سکتے ہیں۔ خدا کا عہد یہ ہے کہ اگر تم میرے سوا کسی کی بیعت نہیں کر سکتے تو میں بھی تمہارے سوا کسی کو منصب امامت نہیں دے سکتا۔ تمہاری بیعت مجھ سے مخصوص تو میری بھی امامت تم سے مخصوص ہے۔ یہ معاہدہ ہوا ہے۔

فرمایا جاتا ہے کہ میرے ان برگزیدہ بندوں نے اس معاہدہ کو سچ کر دکھایا اور انہوں نے اس عہد کے وفا کرنے میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں کی۔ جس جس طرح عہد کیا تھا، بہ احسن وجوہ اُس کو پورا کیا۔ اس کے بعد سننے کے لائق یہ چیز ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ"

''اللہ ان صادقین کو ضرور ان کی صداقت کی جزا دیگا''۔

"وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ"

''اور منافقین کو ضرور مبتلائے عذاب کرے گا''۔

"اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ"

''ہاں اُن منافقین میں سے اگر کوئی توبہ کرتا ہوا نکل آئیگا تو اُس کی توبہ ضرور قبول کرے گا''۔

سب سے پہلا نکتہ آیت میں جو انتہائی توجہ کا مستحق ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے، خداوند عالم ایفائے عہد کرنے والوں کی ثناء کر رہا تھا۔ اُن کی صداقت کا ذکر کر رہا تھا۔ انہیں صادقین کہہ رہا

تھا۔اُن کی بہترین جزا کا تذکرہ تھا۔ یہ ایک دم منافقین کا ذکر؟ چہ معنی؟ اس بیان کا محل کیا ہے؟ اُن صادقین کو جزائے خیر دوں گا۔ اُن منافقین کو مبتلائے عذاب کروں گا۔ یہ مقابلے پر لفظِ منافقین آیا کیوں؟ اگر آنا ہی تھا تو لفظِ کافرین، مشرکین بھی تو ہو سکتا تھا۔ مگر سب کو ایک طرف کیا، ادھر صادقین کہا، اُدھر منافقین کہا۔ ان کے جزا بیان کی، اُن کیلئے سزا بتائی۔ عقلمند صاف طور پر یہ سمجھ سکتا ہے کہ جن مصائب و آلام کے صبر کیساتھ جھیلنے کا صادقین نے وعدہ کیا ہے، اگر یہ مصائب و آلام اُن پر کفار کے ہاتھوں ہونے والے ہوتے تو مقابلے پر کافرین کا نام آتا۔ یہ مصیبتوں کے پہاڑ ان صابرین پر اگر مشرکین ڈھانے والے ہوتے تو مشرکین کا نام آتا۔ لفظِ منافقین صاف بتا رہا ہے کہ ان صابرین پر یہ مصیبتیں، یہ ظلم و ستم، یہ جور و جفا کفار و مشرکین کے ہاتھوں نہیں ہوگا، یہ ساری داستانِ ظلم منافقین کے ہاتھوں لکھی جائے گی۔

منافق اس کو کہتے ہیں جو لا الٰہ الا اللہ بھی کہتا ہو، محمد الرسول اللہ بھی کہتا ہو، کلمۂ توحید و رسالت اُس کی زبان پر ہو مگر دل میں کچھ نہ ہو۔ ظاہر میں سب کچھ ہو، باطن میں کچھ نہ ہو۔ ظاہراً اسلام میں داخل ہیں مگر باطناً خارج ہیں۔

اس لئے خداوند عالم نے اس واقعہ کے بیان میں پورا نقشہ کھینچنے کیلئے صابرین کو صادقین کہا اور ظالموں کو منافقین کہا اور منافقین کہہ کر ایک اور پہچان بتلا دی:

"اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْهِمْ"

''ان منافقین میں سے جو توبہ کرتا ہوا نکل آئے گا، اُسکی توبہ قبول کرے گا''۔

حاضرین! اتنے پتے دیئے ہیں ان آیات نے ایک مخصوص میدان کے تعین کیلئے، اتنے گوشے دکھا دیئے ہیں کہ اب جو نہ سمجھے گا، وہی ہو سکتا ہے کہ جو بیہوش ہو۔

ڈھونڈیئے ایسا میدان جس جگہ ایک طرف عہد کے پورا کرنے والے ہوں، صادقین ہوں، مقابلے پر کفار نہ ہوں، منافقین ہوں، کلمہ گو ہوں اور اُن منافقین میں سے وقت پر کوئی توبہ کرتا ہوا بھی نکلا ہو۔ عالم کی تاریخ میں ایسا میدان میدانِ کربلا کے سوا کہیں نہیں ملے گا۔ صادق

ہے اُس کے ساتھ، وہی ہیں جو صداقت پسند ہیں۔ مقابلے پر جو لوگ ہیں، اگر واقعاً آپ انہیں مسلمان سمجھیں تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام یہ ہے، مسلمان ایسے ہوتے ہیں۔ تو آیت کا کہنا یہ ہے کہ وہ منافقین ہیں۔ پھر توبہ کا واقعہ حُر نے الم نشرح کر دیا۔ جو لفظ زبانِ آیت پر آیا تھا، وہی لفظ زبانِ حُر پر آتا ہے۔ کانپتے ہوئے فرما رہے ہیں، لرزہ براندام ہیں، شرمسار ہیں اور بارگاہِ امامت میں پہنچتے ہی پہلا جملہ استفہامیہ:

"هَلْ لِيْ مِنْ تَوْبَة"

اے فرزندِ رسولؐ! کسی طریقے سے میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ سخت ترین مجرم ہوں، بڑا سنگین جرم میں نے کیا۔ جناب حُر نے امام حسین علیہ السلام کے گھوڑے کی باگ پر ہاتھ ڈالا تھا۔ یہ بے ادبی کی انتہا تھی۔ یہ وہ عمل تھا کہ امامؑ کے انصار و اقرباء کا تو کیا ذکر ہے، خود امامؑ بھی غیظ و جلال میں آ گئے اور امامِ عالی مقام نے پُر جلال ہو کر فرمایا:

"حُر! تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے"۔

عربی میں انتہائی تذلیل کیلئے یہ جملہ بولا جاتا ہے۔ یہ ایسا تذلیل کرنے والا جملہ تھا کہ کہنے والا اگرچہ امامؑ ہے لیکن جناب حُر کو اس کے جواب میں یہ کہنا پڑا کہ فرزندِ رسولؐ! اگر ایسا کوئی جملہ آپؑ کے سوا کوئی اور کہتا تو میں اُسی طرح اُسے جواب دیتا۔ مگر میں مجبور اس لئے ہو رہا ہوں کہ آپؑ کی مادرِ گرامی پر درود و سلام کے سوا میں کچھ اور اُن کے بارے میں نہیں کہہ سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس گمراہی کے زمانے میں بھی ایمان کی کوئی شعاع دل میں موجود تھی۔

جنابِ حُر دریا چھوڑ کر پیاسوں میں آ رہے ہیں۔ دولت چھوڑ کر بے آب و دانہ لوگوں میں مظلوم بننے کیلئے آ رہے ہیں۔ مصیبت زدہ ہونے کیلئے آ رہے ہیں۔ شوقِ شہادت لئے ہوئے آ رہے ہیں۔ نصیب ایک دم پھر گیا، مقدر بدل گیا۔ کہاں تھے اور کہاں پہنچ گئے اور دم کے دم میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

فرماتے ہیں کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ مجھے اس مقام پر یہ کہنا ہے کہ حُر کو کیا خبر تھی

کہ تیرا ذکر قرآن آج سے بہت پہلے کر چکا ہے۔ یہ تیرے ہی بھروسے پر تو کہا تھا:

"اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ"

حُر کو کیا خبر تھی کہ مجھے خدا یاد کر چکا ہے۔ حُر بے خبر تھے مگر امامؑ تو باخبر تھے۔ امامؑ کو علم تھا کہ عہد پورا کرنے والا اس آیت میں کون ہے، منافقین کون ہیں، توبہ کرنیوالا کون ہے۔ یہ کس کی توبہ کی قبولیت کا ذکر ہو رہا ہے۔ امامِ عالی مقام جانتے تھے، اسی لئے فوراً فرمادیا:

"اَنْتَ حُرٌّ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ"

امامؑ نے فیصلہ کن جواب دیا ہے کہ حُر تو یہاں بھی حُر ہے اور عذابِ آخرت سے بھی تو حُر آزاد ہے۔

مزید تطبیق

آیت کے ہر بیان کی تکمیل ہو رہی ہے۔ مستقیم ہیں یہ حضرات اپنی راہ پر۔ ظلم و ستم کی طغیانی اور فراوانی کے باوجود ممکن ہی نہیں کہ راہِ حق سے ان کا قدم ہل جائے۔ آخر وقت تک جب بھی بیعت کا لفظ آپؑ کے سامنے آیا ہے تو آپؑ نے یہی جواب فرمایا کہ "لاحول ولا قوۃ الا باللہ"۔ کوئی سوال ہی نہیں! ممکن ہی نہیں! میں چاہتا ہوں اس میدان میں اس وقت آپ مکمل طور پر تصور کی حیثیت سے پہنچے ہوئے ہوں۔ کس شان سے ایفائے عہد ہو رہا ہے اور لطف یہ ہے کہ امامؑ وہ ہیں جنہوں نے خدا سے عہد کیا اور امامؑ کے ماموم وہ ہیں جنہوں نے امامؑ سے عہد کیا۔ وہ اپنے عہد پر قائم، جس نے خدا سے عہد کیا وہ امامؑ اپنے عہد پر قائم۔ دانے کے برابر تبدیلی نہیں۔

شبِ عاشور بہن کے خیمے میں امامؑ کسی وقت میں تشریف لائے ہیں۔ باہر کی مہم کو سرانجام دے کر، اور اپنے انصار و اقرباء کی آزمائش کر کے، یہاں تک کہ جنگل میں جا کر اپنا مقتل اپنی آنکھوں سے دیکھ کر، وہاں کے سنگریزوں کو اپنی عبا کے دامن سے صاف کر کے۔ ان تمام مہمات کو سر کر کے امامؑ خیمۂ زینبؑ کی طرف آتے ہیں۔ آپ کے ساتھ ساتھ فدائیوں میں سے ایک فدائی بھی ہے۔ جب دروازۂ خیمہ پر پہنچے تو فدائی تو ٹھہر گیا۔ امامِ عالی مقام داخلِ خیمہ ہوئے۔ بہنؑ کا عالم یہ ہے کہ بھائی کے انتظار میں بار بار درِ خیمہ تک آتی ہیں، راستہ دیکھتی ہیں،

پلٹ جاتی ہیں۔اس طرح سے بہن اس مہم کو سر کر رہی ہے۔ بھائی کو آتے دیکھا تو لپٹ گئیں، درد دل سنانے لگیں۔امام امر بہ صبر فرمارہے ہیں۔ بیٹی کو کبھی ماں کا صبر یاد دلاتے ہیں، کبھی باپ کا صبر یاد دلاتے ہیں، کبھی جد نامدار کا صبر یاد دلا کر تلقینِ صبر کرتے ہیں۔کبھی فرماتے ہیں کہ بہن دنیا فانی ہے، جو آیا ہے وہ جانے کیلئے آیا ہے۔موت ہر ذی حیات پر مسلط ہے۔بہن میرا دنیا سے اٹھنا ایک بہترین شان سے ہے۔میں یہ شانِ روانگی کیوں ہاتھ سے کھودوں۔

جناب زینبؑ کی زبان پر ایک لفظ یہ آیا اضطراب میں کہ بھیا دشمن کی فوجیں تو شام تک آتی رہی ہیں۔آپؑ کے یہ مددگار مٹھی بھر ہیں۔دشمنوں کی یہ کثرت آپ کے انصار و اقرباء کی یہ قلت۔اور یہ کہتے کہتے شہزادی کی زبان پر یہ الفاظ آگئے کہ یہ تھوڑے سے بھی جو ہیں، ان کا بھی کیا اعتبار کہ وقت پر یہ ساتھ دیں یا نہ دیں۔دروازے پر امام کا جو فدائی کھڑا تھا، اُس نے یہ سن لیا اور وہیں سے کھڑے کھڑے اُس فدائی نے انصارِ امامؑ کو نام بنام آواز دی۔حبیب، مسلم بن عوسجہ، زہیر قین! یہ آدھی رات کا واقعہ ہے۔جب اُن کی آواز انصار امام تک پہنچی تو آواز نے یہ بتادیا کہ آواز کا رخ کس طرف کا ہے۔نبیؐ زادیوں کے خیموں کی طرف سے آواز آرہی ہے۔سب گھبرا گئے اور ہر شخص نے یہ سمجھا کہ خیام اہلِ حرم پر حملہ ہوگیا، نرغۂ اعدا میں تو تھے ہی۔جو بیقراری سے پکارنے والا نام بنام پکار رہا ہے۔

حضرات! انصارانِ حسینی کے خیمے اہلِ حرم کے خیموں سے دور تھے۔قریب اقربائے امامؑ کے خیمے تھے۔آواز پر سب سے پہلے جو لوگ خیمۂ زینبؑ پر پہنچے، وہ اقربائے امامؑ تھے۔علی اکبرؑ تھے، قاسمؑ و عباسؑ تھے۔پوچھا کہ تم کیوں پکار رہے ہو؟ واقعہ کیا ہے؟ امامؑ کے اس فدائی نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ میں نے آپ حضرات کو نہیں بلایا۔میں تو انصار کو پکار رہا ہوں۔انہوں نے حیران ہوکر کہا کہ کیا بات ہے؟ رو کر کہتے ہیں کہ آپ حضرات تو اقرباء ہیں۔آپ حضرات پر تو نبیؐ زادیوں کو یقیناً اطمینان ہے۔ہم لوگ غیر ہیں، ہماری شہزادی کو ہم پر اعتماد نہیں ہے۔میں نے انصار کو اس لئے پکارا ہے کہ آؤ! اپنی شہزادی کو مطمئن کرو۔اب انصار آگئے ہیں۔خیمے کے سامنے کھڑے

ہوئے۔ حقیقتِ حال کا علم ہوا۔ سمجھ گئے کہ نبیؐ زادی کو ہم پر اطمینان نہیں ہے۔ تلواریں نیاموں سے نکال کر دھاریں اپنی گردنوں پر رکھیں اور عرض کیا کہ اجازت ہو تو اپنی گردنیں اپنے ہاتھوں سے کاٹ لیں۔ شہزادی ہمیں رات کا گزارنا دشوار ہو رہا ہے۔ ہم نصرتِ امامؑ سے منہ موڑنے والے نہیں۔

جنابِ زینبؑ کبریٰ نے سنا اور خدا جانے کیسا وقت پڑ گیا تھا کہ شہزادی نے یہ سن کر ارشاد فرمایا:

''میرے بھائی کے مددگارو! دیکھنا اپنی اس بات کو یاد رکھنا، تم عہد کر رہے ہو میرے سامنے''۔

ابھی انصار بولنے نہ پائے تھے کہ میرا امامؑ گوہر بار ہوتا ہے کہ:

''اے بہن! میں ضامن ہوں ان کے ایفائے عہد کا۔ میرے انصار منحرف ہونے والے نہیں''۔

حضرات! رات کی بات تھی، دن میں پورا کر کے دکھا دیا۔ کس طرح جانیں دی ہیں، خبر ہی نہیں رہی اپنے تن کی، بدن کی، جان کی۔ طے کر لیا تھا انصارانِ امامؑ نے کہ ہم نے اپنے بدن کا خون دشمنوں کی تلواروں کو دیدیا اور شہادت کے بعد نہ ہو کوئی ہمارا دفن کرنے والا! ہم نے اپنے بدن ان پرندوں کے حوالے کر دیئے۔ کچھ ہو جائے ہم راہِ نصرت سے ہٹنے والے نہیں۔

امامؑ تو وہ ہیں جن کی مدح جا بجا انصار نے کی اور امامؑ کے انصار وہ ہیں کہ جن کی مدح امامؑ نے کی اور مدح کرتے ہوئے فرمایا کہ جیسے رفقاء میں نے پائے، عالمِ کائنات میں ایسے رفقاء کسی کو نصیب نہیں۔

''لَا اَعْلَمُ اَصْحَاباً خیراً مِن اَصْحَابِیْ''

''جیسے اصحابِ وفادار مجھ کو ملے ہیں، کسی کو ملے ہیں؟''

حضرات! آخری وقت آ گیا کہ اب ان میں سے کوئی نہیں، نہ انصار میں سے، نہ اقرباء

میں ہے۔

نہ لشکرے نہ سپاہے نہ کثرت الناسے
نہ قاسمؑ نہ علی اکبرؑ نہ عباسؑ

سینہ پر تھے، رہے نہیں ہیں۔ وفادار تھے، اب پڑے ہوئے سو رہے ہیں۔ تنہائی کا عالم ہے، تیروں کا مینہ برس رہا ہے، برستے ہوئے تیروں کا نشانہ ایک ذات ہے، خدا جانے کتنے تیر لگے، جسمِ اقدس میں کتنے زخم آ گئے۔ حضرات! تیروں کی اس بارش میں اتنی فرصت نہیں ہے کہ امامؑ ان کو نکال کر پھینکتے رہیں۔ تین تیر ایسے تھے جن کو امامؑ نے اپنے ہاتھ سے کھینچا۔ ایک تیر وہ ہے جو امامِ عالی مقام کے دہنِ اقدس میں لگا۔ تقریر فرما رہے ہیں، فرزندِ رسولؐ ہونے کا، اپنی مظلومیت کا اظہار فرما رہے ہیں۔

تیر آیا، تالو پر لگا، امامؑ نے اس تیر کو نکال کر پھینکا۔ دوسرا تیر جبینِ مبارک پر لگا۔ امامؑ نے اس تیر کو بھی نکالا ہے اور واقعاً اس تیر کے نکالنے کی ایک وجہ تو یہی سامنے کی ہے کہ ابھی امامِ عالی مقام کو یہ پیشانی سجدۂ معبود میں خم کرنا تھی۔ آخری سجدے کی مہم کو سر کرنا تھا۔

خون بہا، چہرۂ اقدس پر جاری ہوا، بہتے ہوئے خون کو پونچھنے کیلئے امامؑ نے عبا کے دامن کو اٹھایا، دامن اٹھا ہوا ہی تھا کہ عین اس وقت سینۂ مبارک پر تیر آ کر لگا۔ یہ تیر اتنا بھاری تھا، امامؑ نے اسے نکالا ضرور مگر سامنے کی طرف سے نہیں، پشت کی طرف سے خون جاری ہوا۔

یہ خونِ دل ہے۔ امامؑ زخم پر چلّو لگائے ہوئے ہیں۔ چلّو بھر گیا۔ اس خون کے قطروں کو امامؑ نے آخری نذرِ خدا قرار دے کر یہ کہتے ہوئے:

"بِسْمِ اللّٰهِ وَ بِاللّٰهِ وَ عَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ"

جانبِ فلک پھینکا، نذر مقبول ہو گئی اور اس خون کا کوئی قطرہ زمین پر پھر واپس نہیں آیا۔ خونِ دل بہہ گیا۔ جسم زخموں سے چور ہو گیا ہے۔ اب راکبِ دوشِ رسولؐ سے ذوالجناح پر سنبھلا نہیں جاتا۔ ڈگمگانے لگے، پائے اقدس رکاب سے نکلنے لگے۔

بلند مرتبہ شاہ زصدر زیں افتاد
اگر غلط نہ کنم عرش بر زمیں افتاد

زمین پر بھی تو نہ تھے۔ بقول صادقؑ آلِ محمدؐ تین ساعتیں ایسی گزر گئیں کہ نہ پشتِ زین پر تھے، نہ خاکِ زمین پر تھے۔ ہر امامؑ نے یہ بیان کیا ہے زیارت میں کہ:

''میرا سلام ہو اُس پر کہ جس کا جنازہ تیر اٹھائے ہوئے ہیں''۔

الا لعنة اللّٰہ علی القوم الظالمین

گیارہویں

مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا. (نساء: ۱۷۴)

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنا اتصال قرآن کو اہلِ بیتؑ سے اور اہلِ بیتِ اطہار کو قرآنِ مجید سے ہے کہ خداوند عالم نے بہت سی آیات میں ان دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ فرمایا ہے۔ کبھی ارشاد ہوا کہ:

"قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ"

"لوگو آیا ہے تمہاری جانب اللہ کی طرف سے ایک نور ہے، ایک کتاب مبین ہے"۔

دونوں کا ذکر یکجا کیا جارہا ہے۔ دونوں کی آمد کی حیثیت یکساں بیان کی جارہی ہے۔

جس آیت کو میں نے آج پیش کیا ہے، فرمایا جاتا ہے:

"لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ایک برہان آیا اور "انزلنا الیکم نوراً مبیناً"۔

"اور ہم نے تمہاری طرف ایک نور مبین نازل کیا"۔ کتاب کیلئے برہان کہہ کر الگ جملہ کہا۔ یہاں بھی دو چیزوں کا ذکر ہے، ایک کو برہان کہا جارہا ہے اور ایک کو نور مبین کہا جارہا ہے۔

کسی آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

"اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ"

"میرا رسول اپنے رب کی طرف سے ایک بینہ لئے ہوئے ہے، ایک دلیل روشن لئے ہوئے ہے اور اُس کے پیچھے پیچھے گواہ آتا ہے اور وہ شاہد بھی من اللہ ہے"۔

جس طرح وہ بینہ اللہ کی طرف سے ہے، اُسی طرح وہ گواہ جو پیچھے پیچھے آتا ہے، وہ بھی اللہ ہی کی جانب سے ہے۔ کیا شک ہے اس میں کہ وہ بینہ قرآن ہے اور وہ شاہد جو پیچھے پیچھے

آتا ہے، علی ابن ابیطالب علیہ السلام ہیں۔ کسی آیت میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ:

"لَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ"

"اے انسان! تیری ہدایت کیلئے دیئے ہیں ہم نے تجھے وہ سات جن میں سے کچھ مکرر بھی ہیں، بار بار بھی آئے ہیں اور دیا ہے ہم نے تجھے تیری ہدایت کیلئے قرآنِ عظیم"۔

"سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ"

مفسرین نے عام طور پر اس کی تفسیر میں سورۂ الحمد کو بتایا اور بنیاد قرار دی ہے یہ کہ اس میں سات آیات ہیں۔ من المثانی کی بھی توجیہات بہت سی کی گئی ہیں۔ کسی نے کہا کہ سورۂ الحمد کا نزول دو مرتبہ ہوا، ایک دفعہ مکہ میں اور دوسری مرتبہ مدینہ میں۔ کسی نے کہا کہ من المثانی اس لئے کہا گیا ہے کہ سورۂ الحمد میں بعض الفاظ بار بار آئے ہیں۔ رحمٰن بھی دو جگہ آیا، رحیم بھی دو دو جگہ آیا، اِیَّاکَ بھی دو جگہ آیا، عَلَیْھِمْ بھی، اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ بھی دو جگہ آیا، اس مناسبت سے اسے من المثانی کہا جا رہا ہے۔ لیکن حضرات بات کھل کر جب سامنے آتی ہے تو پھر کہنا پڑتا ہے کہ خداوند عالم نے سبعا من المثانی سے قرآنِ عظیم کو الگ بیان کیا ہے اور قرآنِ عظیم سے سبعا من المثانی کو الگ بیان کیا ہے۔ سبعا من المثانی والقرآن العظیم تو صاف پتہ چلتا ہے کہ سبعا من المثانی سے قرآنِ عظیم کے علاوہ کوئی شے ہے۔ یہاں دو چیزوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ سورۂ الحمد تو لامحالہ قرآنِ کریم کا جزو ہے۔ قرآنِ عظیم میں داخل ہے اور یہاں تک ہے کہ سورۂ الحمد کا پڑھنے والا قرآن کا پڑھنے والا ہے ابر اس کی تلاوت سے تلاوتِ قرآنِ پاک کا مفہوم صادق آتا ہے۔ نماز کو جو قرآن کہا گیا ہے، قرآن الفجر (مثلاً) وہ سورۂ الحمد کے بھروسے ہی پر تو کہا گیا ہے۔ سورۂ الحمد کو بہر صورت قرآن کا جزو اور جب قرآن کا جزو ہے تو کسی جزو کو اُس کے کل سے الگ کر دینا بالکل بے محل اور بالکل بے موقعہ ہے۔ الفاظ کی ترتیب بتا رہی ہے کہ سبعا من المثانی کچھ اور ہے اور قرآنِ عظیم جس میں ہر ایک ہی سورۃ ہے، وہ کچھ اور ہے۔ تفسیر اہلبیتؑ میں کتنی لطیف چیز بیان کی گئی ہے کہ سبعاً من المثانی، وہ سات مکررات میں سے جو ہیں، اس سے مراد

چہاردہ معصومین ہیں اور خداوند عالم ناطق قرآن کا ذکر کر رہا ہے کہ یہ بولتے ہوئے ہادی ہیں اور قرآنِ عظیم خاموش رہنے والا ہادی ہے۔ یہ وہی سبعا من المثانی ہیں جس کو نور و کتاب مبین میں نور کہا ہے۔ یہ وہی قرآن ہے کہ جس کو آیہ نور میں کتاب مبین کہا ہے۔ جس آیت میں قرآن کو برہان کہا ہے، اُس آیت میں آلِ محمد کو نور کہا ہے۔ جس آیت میں قرآن کو بینہ کہا ہے، اُسی آیت میں آلِ محمد کو شاہدِ رسول قرار دیا گیا ہے۔ ذکر ساتھ ساتھ ہو رہا ہے، جہاں قرآن کا ذکر ہے، وہیں اہلِ بیتؑ کا ذکر ہے اور جہاں اہلِ بیتؑ کا ذکر ہے، وہیں قرآن کا ذکر ہے۔ اسی لئے متفق اور مسلّم پیغمبرِ اسلام کا ارشاد ہے کہ:

"علیؑ مع القرآن و القرآن مع علی"

"علیؑ قرآن کے ساتھ اور قرآن علیؑ کے ساتھ"۔

حضرات! میں سوچتا ہوں کہ تھوڑے سے وقت میں میں کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ مگر کوشش کرتا ہوں کہ کسی چیز کو بیان کرتے وقت میں اُس کی گہرائی تک اپنی طاقت کے بقدر پہنچنے کی کوشش کروں۔ صاحبانِ ادب نے، ذوقِ کلام رکھنے والوں نے کبھی اس پر غور کیا کہ سرکارِ دو عالم نے یہ جملہ دہرایا کیوں ہے؟ علی مع القرآن۔ جب علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں تو اُس کے معنی خود بخود یہ ہیں کہ قرآن علیؑ کے ساتھ ہے۔ جب ایک کے ساتھ دوسرا ہوگا تو دوسرا لامحالہ پہلے کے ساتھ ہوگا۔ علی مع القرآن کے معنی ہی یہ ہیں کہ قرآن علیؑ کے ساتھ ہے۔ مگر آپؐ نے پہلے جملے پر اکتفا نہ کیا بلکہ اس کو پلٹ کر بھی دکھایا "والقرآن مع علیؑ"۔ علیؑ ہی قرآن کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ قرآن بھی تو علیؑ کے ساتھ ہے۔ اگر معنویتِ کلام دوسرے جملے سے آگے نہیں بڑھتی تو یہ کلام کا عیب ہے۔ لفظ تو آگے بڑھیں اور معنی اور مفہوم میں ارتقاء نہ پیدا ہو، یہ کلام کا عیب ہے۔ علی مع القرآن کے اگر بالکل وہی معنی ہوں جو والقرآن مع علیؑ کے ہیں تو بات کیا بنی۔ پھر اسے دہرایا کیوں گیا ہے۔ یقیناً کلامِ رسولؐ عبث نہیں ہو سکتا اور آپؐ کے کلام کا کوئی جزو تحصیلِ حاصل قرار نہیں پا سکتا۔ اگر بات آگے بڑھائی ہے تو صرف بات ہی نہیں بڑھائی ہے بلکہ کوئی بات ہے جو

آپؐ نے جملے کو بہ تکرار بیان کیا ہے۔ (صلوٰۃ)۔

میں اس مقام پر جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ لفظ مع (م - ع) بعض موقعوں پر اتباع کیلئے آتا ہے، پیروی کرنے کیلئے آتا ہے۔ چنانچہ "وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ" میں لفظ مع یقیناً پیروی کرنے کیلئے آیا ہے اور اسی لئے نماز جماعت میں ماموین پر امامِ جماعت کا اتباع فرضِ عین ہے۔ انبیاء کے ناموں کے ساتھ اُن کی امت کا ذکر بھی اکثر لفظِ مع کے ساتھ کیا گیا ہے۔ فَمَا آمَنَ مَعَهٗ اِلَّا قَلِيْلٌ ۔ حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہے کہ اُن کے اتباع نے ایمان نہیں قبول کیا مگر تھوڑوں نے۔ یہاں بھی لفظِ مع اتباع کیلئے ہے۔ تو لفظِ مع اکثر اتباع کیلئے آتا ہے۔ یہاں بھی اُسی معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔ علی مع القرآن۔ علی قرآن کا اتباع کرنے والا اور حضرات مجھے کہنے دیجئے کہ سرکارِ دوعالم نے علیؑ کا اتباعِ قرآن کسی دن سے مخصوص نہیں کیا، کسی زمانے سے مخصوص نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ جملے میں کوئی فعل نہیں ہے۔ کوئی دن یا زمانہ معین نہیں کیا کہ اُس دن علی قرآن کے ساتھ یا اُس رات علیؑ قرآن کے ساتھ۔ جب کسی زمانے کا تعین نہ ہو تو یہ کہلاتا ہے فیصلہ علی الاطلاق۔ قیدِ زمان و مکان سے بالاتر ہے یہ جملہ۔ جہاں بھی علیؑ ہیں، قرآن کا اتباع کرتے ہیں۔ بس علیؑ ہونا ہی اس کی دلیل ہے کہ وہ اتباعِ قرآن میں ہیں۔ جملہ اسمیہ ہے، فعلیہ نہیں ہے کہ جہاں زمانے کا کوئی بھی ذکر ہو۔ علیؑ ہونا ہی اس کی ضمانت ہے کہ وہ قرآن کا اتباع کرنے والے ہیں، قرآن کے ساتھ ہیں۔

اور مجھے حاضرینِ مجلس سینوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے دلوں کو ٹٹول کر بتائیں کہ جس کی حیات کا ہر لمحہ قرآن کے ساتھ ہو، اُس سے ارتکابِ گناہ ہوگا؟ کیا گنہگار جس وقت گناہ کرتا ہے، وہ اُس وقت قرآن کے ساتھ ہوتا ہے؟ قرآن کا ساتھ چھوڑنے ہی سے تو کوئی گناہ ہوگا۔ قرآن کا ساتھ چھوڑ کر ہی تو کوئی گناہ کریگا۔ آپ کا یہ حتمی فیصلہ علیؑ مع القرآن صاف بتا رہا ہے کہ علیؑ معصوم ہیں۔ علیؑ بے گناہ ہیں۔

اسی وجہ سے کسی نے بالکل صحیح کہا ہے کہ:

نشنید از ابتدائے مہد تا پایان عمر
بے رضائے حق ز تو حرفی کراماً کاتبین

یا علیؑ! آپ کی ذات وہ ذاتِ عصمت وطہارت ہے کہ کراماً کاتبین آپؑ کے گہوارے سے لے کر آپؑ کی عمر کے اختتام تک فعل تو فعل، کوئی قول بھی ایسا نہیں سنتا جس میں رضائے خدا شامل نہ ہو۔

پہلا جملہ سرکارِ دو عالم کا دربارۂ علیؑ مرتضیٰ شاہدِ عصمتِ علیؑ مرتضیٰ ہے۔ علی مع القرآن، علیؑ ہونا ہی اس کی ضمانت ہے کہ آپؑ قرآن کے ساتھ ہیں او جو کسی وقت بھی قرآن کے ساتھ نہ ہو، وہ کوئی بھی ہوسکتا ہے علیؑ نہیں ہوسکتا۔ دوسرا جملہ والقرآن مع علی، علیؑ تابع قرآن اور پھر قرآن بھی تو تابع علیؑ۔ اس کا جلوہ آپ کی نظر میں اس وقت آئیگا جب آپ اس پر نظر فرمائیں گے کہ کتنی آیاتِ قرآنیہ ہیں شانِ علیؑ مرتضیٰ میں کہ جب علیؑ کوئی عمل کر چکے ہیں تو ان کے ختمِ عمل کے بعد آیت مطابقِ عمل کی حیثیت سے آرہی ہے۔ اگر قرآن کی وہ آیت پہلے آئی ہوتی:

"یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ"

آیت کے آنے کے بعد علیؑ نے رکوع میں زکوٰۃ دی ہوتی، تب بھی علیؑ کا یہ اتباعِ قرآن قرار پاتا۔ قرآن کے مطابق آپؑ نے عمل کیا۔ اگر آیت پہلے سے آچکی ہوتی:

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ"

اور اس آیت کے نازل ہونے کے بعد فرشِ رسولؐ پر جانفروش ہونے کی حیثیت سے علیؑ سوئے ہوتے تو ہم کہہ سکتے تھے کہ علیؑ مرتضیٰ کا یہ عمل مطابقِ قرآن ہے اور اس کی تمام تر مثالیں ہیں اگر:

"یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا"

یہ پہلے آیا ہوتا اور ان حضراتؑ نے مسکین و یتیم و اسیر کو کھانا اتباعِ قرآن میں، بیانِ قرآن کی مطابقت میں، بعد میں کھلایا ہوتا تو ہم کہتے کہ انہوںؑ نے قرآن کے مطابق عمل کیا۔ مگر

اب کیا کہیں جب یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا عمل پہلے ہوتا ہے اور قرآن ان کے عمل کے مطابق آرہا ہے۔ کہیں ان کا عمل مطابقِ قرآن اور کہیں قرآن کا قول ان کے مطابقِ عمل۔ علی مع القرآن والقرآن مع علی ۔علیؑ اگر قرآن کیساتھ ہیں تو قرآن بھی تو علیؑ کا ساتھ دے رہا ہے۔ پہلا جملہ یہ بتا رہا ہے کہ علیؑ بے گناہ ہیں، معصوم ہیں۔ ہمہ وقت قرآن کے ساتھ ہیں اور پہلا جملہ یہ فیصلہ کر رہا ہے کہ جو کسی ایک وقت بھی قرآن کے ساتھ نہ ہو، وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے، علیؑ نہیں ہو سکتا اور جو قرآن کسی ایک وقت بھی علیؑ کے ساتھ نہ ہو، وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر قرآن نہیں ہو سکتا۔ علیؑ ہی وہ ہیں کہ جو قرآن کے ساتھ ہیں، قرآن ہی وہ ہے کہ جو علیؑ کے ساتھ ہے۔

میں نے اکثر و بیشتر اپنے مجمع سے کہا ہے۔ قدر شناس تو کچھ مخصوص ہی ہو سکتے ہیں کہ یہ بات عجیب ہے کہ احادیث نبویہ اُن حضراتؑ کے بارے میں کچھ اس طرز کی آتی ہیں کہ اُن میں زمانے کی اور مکان کی قید نہیں ہوتی۔ یعنی پورے پورے اور بھرپور جملے آجاتے ہیں۔ مشکل نہیں ہے حضرات کہ پورا جملہ آئے اور کوئی فعل ہی نہ ہو؟ جملے اکثر و بیشتر افعال سے بنا کرتے ہیں۔ چاہے ماضی ہو، حال ہو یا مستقبل ہو۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ جب ان حضراتؑ کی شان بارگاہِ رسالتؐ سے بیان میں آتی ہے، جملے کے جملے آجاتے ہیں مگر فعل کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ انا مدینة العلم وعلی بابها۔ یہ دو جملے ہیں مکمل، کہ میں علم کا شہر ہوں، جملہ مکمل ہو گیا اور یہ ہوں کا لفظ بھی ہمیں ترجمے میں کہنا ہی پڑتا ہے، یہاں ہوں بھی کہاں ہے۔ اصل ترجمہ یوں ہے کہ میں علم کا شہر، علیؑ اُس کا دروازہ۔ کوئی فعل نہیں۔ یہ دروازہ اگر کسی وقت نئے سرے سے لگا ہوتا، پہلے نہ لگا ہوتا، آج لگا ہوتا، کسی گھڑی لگا ہوتا تو کسی فعل کا گزر بھی ہو سکتا تھا۔ مگر جب سے پیغمبرؐ علم کا شہر ہیں، علیؑ اُس کا دروازہ ہیں:

" الحسنؑ والحسینؑ سیدا شباب اهل الجنة"

اس حدیث میں ڈھونڈیئے، کوئی فعل ہے۔ سیادت ان حضراتؑ کی اگر عارضی ہوتی، ناپائیدار ہوتی، زمانی ہوتی تو کسی فعل کا گزر ہوتا۔

"الحسینؑ منی وانا من الحسینؑ"

ہے کوئی لفظ اس میں جسے فعل آپ کہہ سکتے ہیں۔

"علیؑ مع الحق والحق مع علیؑ"

"علیؑ حق کے ساتھ اور حق علیؑ کے ساتھ"۔

کسی فعل کا ذکر نہیں، اس لئے کہ علیؑ کی ابتداء بھی یہی ہے کہ مع الحق اور انتہا بھی یہی ہے کہ مع الحق۔ فعل اُس کے بیان کیلئے آئے کہ جو کبھی ناحق کے ساتھ رہا ہو اور پھر کچھ بعد میں حق کے ساتھ ہو گیا ہو تو جہاں مدت ہے وہاں فعل کا گزر ہو سکتا ہے مگر جس کی ابتداء ہی مع الحق اور انتہا ہی مع الحق ہو، اُس کے لئے کسی فعل کا ذکر کیسا!

"علیؑ مع الحق والحق مع علیؑ"

ان تمام احادیث کے دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سرکارؐ اُن حضراتؑ کے اوصاف بادوام بیان کر رہے ہیں جو قیدِ زمان و مکان سے بری ہیں۔

میں نے اکثر آپ حضرات سے بھی کہا ہے کہ سرکارِؐ دو عالم کا یہ جملہ غور نہیں کیا جاتا۔ حضرات! تقابل سے کچھ پتے مل جاتے ہیں۔ سرکارِؐ دو عالم نے ارشاد فرمایا ہے اور آپ کی ایک حدیث ہے کہ:

"اُذْکُرُوْا مَوْتَاکُمْ بِالْخَیْر"

"اپنے مرنے والوں کا ذکر کرو مگر نیکیوں کے ساتھ"۔ جس کا منشا بالکل کھلا ہوا یہ ہے کہ مرنے والے کا ذکر اگر کرو تو اُن میں جو بھلائیاں تھیں، خوبیاں تھیں، اُن کا ذکر کرو، جو اُن میں کمزوریاں تھیں، وہ اب لائقِ ذکر نہیں ہیں۔ بالخیر کی قید لگا دی تاکہ مُردے کا ہر ذکر قابلِ ذکر نہ ہو۔ مطلب صاف یہ ہے کہ اگر کوئی شر اُن میں تھا، کوئی معصیت تھی، کوئی برائی تھی، وہ زبان پر مت لاؤ۔ جب ہمارے مُردوں کے ذکر کے لئے ارشاد فرماتے ہیں نبیؐ تو بالخیر کی قید لگا کر۔ مگر جب علیؑ کے ذکر کیلئے حکم دیتے ہیں تو:

"زَيِّنُوا مَجَالِسَكُمْ بِذِكْرِ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْطَالِب"

یہاں بالخیر کی کوئی قید نہیں، "اپنی مجلسوں کو علیؑ کے ذکر سے سجاؤ"۔ کب یہاں کہا ہے کہ علیؑ کے ذکرِ خیر سے سجاؤ؟ یہاں لفظِ خیر کی قید ہے؟ لفظِ خیر کی قید وہاں ہے جہاں خیر بھی ہے اور شر بھی ہے۔ ہمارے مُردے معصوم نہیں ہیں۔ اُن میں نیکیاں بھی تھیں، کچھ برائیاں بھی تھیں، کچھ گناہ بھی تھے۔ وہ گناہ لائق ذکر نہیں ہیں۔ وہ خوبیاں لائق ذکر ہیں۔ مگر علیؑ کے بارے میں پیغمبرؐ کا یقین کیسا مطمئن ہے، یہاں بالخیر کی قید نہیں ہے۔ علیؑ کا ذکر کرو، مجالس سجیں گی۔ کیا ذکر کریں سرکارؐ (معاذ اللہ) خیر کا ذکر کریں؟ جوابِ رسالتؐ ہوگا اس حدیث میں کہ بالخیر کی قید وہاں لگائی جائے گی جہاں شر کا بھی گزر ہو۔ علیؑ کا جو بھی ذکر ہوگا، بالخیر ہی ہوگا۔ اور اگر اُس ذکر میں خیر نہیں تو یقین جانو وہ علیؑ کا ذکر نہیں۔ علیؑ کا جو ذکر بھی ہوگا، وہ خیر ہی کا ذکر ہوگا۔ اس لئے کہ علیؑ کے دامن میں، علیؑ کے سوانح اعمال میں، خیر کے سوا کہیں شائبہ کسی دوسری چیز کا نہیں۔ واقعاً حضرات میں یہ لفظ کہنے پر مطمئن ہوں کہ یہ وہ حضرات ہیں، صفاتِ خداوندی تو، اس میں کوئی شک نہیں، کہ اُس کی ذات کیلئے ہیں اور اُسی کی ذات ہے جو عینِ صفات ہے، اُسی کی صفات ہیں جو کسی سے حاصل شدہ نہیں ہیں، اُس کے سوا جس میں بھی جو صفت ہوگی، اُسی کی دی ہوئی ہوگی۔ بے نیاز اُس کی ذات ہے، اُس کے سوا جو بھی ہے، وہ نیاز مند ہے۔ جسے علم ملا، اُسی سے ملا، جسے قوت ملی، اُسی سے ملی، جسے گویائی ملی، اُسی سے ملی وجود ہی جب اُس سے ملا ہو تو ہر صفت جس نے پائی ہے، اُسی ذات سے پائی ہے۔ مگر مجھے اتنا ضرور کہہ لینے دیجئے کہ خداوند عالم نے اپنے صفات کی جھلک پیدا کی ہے ان حضرات میں۔ اور ان ہی کی وہ صفات ہیں جو حقیقتاً ابدیت کی ہوتی ہیں۔ ان صفات کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ جب بندے اتنی صفات کے اور ایسی صفات کے مالک ہوں تو ان کا خدا کیسی جامع صفات کا حامل ہوگا۔ یہ انہیؑ کی صفات ہیں جو خدا کی صفات کا پتہ دیتی ہیں۔

خداوند عالم نے جب اپنا جانشین قرار دیا ہے ان کو، حقیقتاً خلیفہ کے معنی بدل کے ہیں اور جانشین کے ہیں۔ یہ خلیفۃ اللہ ہیں، خدا کے جانشین ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا اگر خود آ کر

کچھ کہتا، جو کہتا وہ یہ کہیں اور جس طرح وہ ہدایت کرتا، وہ یہ کریں۔ لہٰذا قدرت نے اپنی صفات کا ان حضراتؑ کو آئینہ دار قرار دیا ہے۔ انؑ کا حکم دیکھ کر خدا کے حکم کا یقین کیجئے۔ انؑ کے عفو کو دیکھ کر اُس کے دامنِ عفو کی وسعت کا یقین کیجئے۔ انؑ کے علم کو دیکھ کر اندازہ کیجئے کہ جن کے پاس خدا کا دیا ہوا علم ہو، جب ان کا علم اس درجہ وسیع ہو تو جس نے دیا ہے، اُس کا علم، جو عین ذات ہے، وہ کتنا بسیط ہوگا اور بسیط کا لفظ بھی حقیقتاً اُس کے علم کیلئے ناکافی ہے۔ یہ آئینہ دار صفاتِ الٰہیہ ہیں۔

یہ لفظ مجھے دراصل اس پر یاد آیا کہ علیؑ کا جو بھی ذکر ہوگا، خیر ہی خیر ہوگا۔ علیؑ کے پاس خیر کے سوا دوسری کوئی شے ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ خداوند عالم نے (بلا تشبیہ کہتا ہوں) اپنی ذات کیلئے ارشاد فرمایا ہے ''بِيَدِكَ الْخَيْر''۔ لوگو! اقرار کرو اس کا۔ پکار کر کہو، اپنے معبود کو کہ پروردگار تیرے ہاتھ میں بس خیر ہی خیر ہے۔ کسی عالمِ نکتہ رس نے بڑا اچھا یہ جملہ کہا ہے۔ جو لوگ مُصر ہیں اس پر کہ خیر بھی خدا کی طرف سے ہے اور پھر کچھ اور بھی خدا کی طرف سے ہے۔ سنیں ذرا۔ خیرہٖ وشرّہٖ من اللہِ تعالیٰ۔ خیر بھی اُسی کی طرف سے ہے اور شر بھی اُسی کی طرف سے ہے۔ اس کی رد میں ایک بہترین بات کہی گئی ہے۔ یوں تو اس کی رد ہر صورت سے ہے، اس میں کوئی ایک چیز تو نہیں ہے مگر ایک سامنے کی بات یہ ہے کہ آیہ ''قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ''۔ اس آیت میں اللہ نے صفتِ تقابل کا مکمل استعمال کیا ہے یعنی دو چیزیں مقابلے کی ہر جگہ بیان کی جارہی ہیں۔

''تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ''

''جسے چاہتا ہے ملک دیدیتا ہے (پھر مقابلے میں) جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے''۔

''وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ''

''جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے''۔

یہاں عزت کا مقابلہ ذلت سے۔

''تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ''

"تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ"

جہاں ہر صفت کا مقابلہ، مقابلے کی صفت سے کیا کہ خیر کا ذکر کرتا ہے جب بیدک الخیر اور کسی نے بڑی اچھلتی ہوئی بات کہی ہے۔ جب صنعتِ تقابل کا پورا استعمال ہو رہا ہو، جہاں اور شر موجود تھا تو صنعتِ تقابل کیلئے بہترین موقع تھا۔ جب رات کے مقابلے میں دن کہا اور دن کے مقابلے میں رات کہا، زندہ کے مقابلے میں مُردہ کہا اور مُردہ کے مقابلے میں زندہ کہا، عزت کے مقابلے میں ذلت کہا اور دینے کے مقابلے میں چھین لینا کہا۔ ہر چیز کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ خیر کا مقابلہ کیوں نہیں کرتا۔ جہاں خیر کا نام لے رہا ہے، وہاں شر کا نام بھی مقابلے پر لیتا، کسی نے بہت آگے بڑھ کر یہ بات کہی ہے اور خدا جانے کس بنیاد پر کہی ہے کہ یہاں تو مقابلہ ایک خیر ہی کے لفظ کا نہیں بلکہ ہاتھ کا مقابلہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ اگر یہ کہا تھا کہ بیدک الخیر تو یہ بھی تو کہہ سکتا ہے کہ ہاتھ کا مقابلہ بھی ہو جائے، خیر کا مقابلہ بھی ہو جائے۔ یہ کہہ سکتا تھا "وبرجلک الشر"۔ ہاتھ میں تیرے خیر ہے اور پیر میں تیرے شر ہے۔ غالباً یہ اس مناسبت سے کہا ہے کہ وہ پیر ڈالنے والی جو بات ہے جہنم میں، اُس کی بھی کھپت ہو جاتی۔ آخر جہنم میں کوئی شر کی چیز جائے گی، خیر کی چیز تو نہیں جا سکتی۔ ہاتھ کا مقابلہ پیر سے بہترین مقابلہ تھا۔ خیر کا مقابلہ شر سے مگر خداوند عالم نے ہاتھ ہی کہا ہے، پیر نہیں کہا۔ خیر ہی کہا ہے، شر نہیں کہا۔ شر نہ کہنا اس موقع پر خاص طور پر اس کی دلیل ہے کہ اُس (خداوند عالم) کی ذات شر سے بری ہے۔ جب شر ہی نہ ہو تو محض الفاظ کو سجانے کیلئے اور صنعتِ تقابل محض دکھانے کیلئے وہ غلط بات کیسے کہہ سکتا تھا۔ جہاں تک تقابل صحیح بات کے صحیح رہنے تک ہو سکتا تھا، وہاں تک اُس ذاتِ باری نے صنعتِ تقابل برتی۔ اُس کا استعمال کیا مگر جہاں واقعیت ہی نہ تھی، وہاں وہ صنعت کا استعمال کیسے کرتا۔ (صلوٰۃ)۔

حضرات والا! خداوند عالم اور اُس کا ارشاد اور اُس کے ارشاد کی ایک ایک آیت بتا رہی ہے کہ ہیں کچھ ایسی ہستیاں جن کو خداوند عالم بار بار نور کہہ رہا ہے اور جس طرح قرآن ایک ہونے کے باوجود، کتاب ایک ہونے کے باوجود متعدد سورتیں رکھتا ہے، اُسی طرح نور بھی ایک ہونے

کے باوجود متعدد صورتیں رکھتا ہے۔ مگر قرآن کی ہر سورت کی بات ایک ہے۔ اسی طرح سے نور کی بھی ہر صورت کی بات ایک ہے۔

ذکر ہو رہا تھا چند روز پہلے ہی، سرکارؐ دو عالم نے فرمایا: "جس نے مجھے دیکھا خواب میں، حقیقتاً اُس نے مجھ ہی کو دیکھا"۔ لیکن حضرات یہ چیز بھی سمجھنے کے لائق ہے۔ جب یہ مسلّم ہے کہ اس نور میں وحدت ہے، ایک ہے، یہ نور اجزاء ہیں اس کے اور اجزاء بھی ایسے کہ قدرت نے تقسیمِ کار کر دی۔ یہ کام اس حصۂ نور کے سپرد ہیں، وہ کام اُس حصۂ نور سے لینا ہیں، تیسرا کام اُس حصۂ نور سے لینا ہے۔ حقیقتاً یہی معنی ہیں اس آیت کے: "اے رسولؐ! ہم نے تمہارا بوجھ بٹا دیا ہے"۔ یعنی ہر امر کی ذمہ داری ہم نے اکیلی تمہاری ذات ہی پر نہیں رکھی بلکہ ہم نے کاموں کی تقسیم کر دی ہے۔ کچھ تمہیں کرنا ہے، کچھ علیؑ کو کرنا ہے، کچھ فاطمہؑ زہرا کو کرنا ہے، کچھ حسنؑ کو کرنا ہے، کچھ حسینؑ کا حصہ ہے۔ ہر ایک کا حصہ، ہر ایک کی ذمہ داری، ہر ایک کے کرنے کا کام الگ الگ ہے۔ ہم نے اس نور کے اجزاء پر کاموں کو بانٹ دیا اور ہم نے تمہارا بوجھ بانٹ دیا اور اسی کے ساتھ فرمایا گیا: "اَلَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَھْرَکَ"۔ "اے رسولؐ! اگر ہم تمہارا بوجھ بٹا نہ دیتے اور کام تقسیم نہ کر دیتے تو بوجھ اتنا زبردست تھا کہ تمہاری کمر توڑ دیتا"۔ یہی ترجمہ ہے لفظ کا۔ اتنا بڑا بوجھ تھا یہ کہ اگر تم پر اکیلے پر سب کا بار رکھا جاتا تو تمہاری کمر توڑ دیتا۔ تم نہیں اٹھا سکتے تھے یہ۔ میں حضرات بڑی روا روی میں چند جملے کہنا چاہتا ہوں۔ ذرا درود بھیج کر سنیں۔ (صلوٰۃ)۔

انبیاءِ خدا شہید ہوئے۔ اُن کے سر تن سے جدا ہوئے، جناب زکریا بھی ہیں، جناب عیسیٰ بھی ہیں۔ کتنے انبیاء ہیں، بقول قرآن کے:

"فَرِیْقًا کَذَّبْتُمْ وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ"

"ایک پوری جماعت ہے انبیاء کی جنہیں تم نے جھٹلایا اور ایک پوری جماعت ہے انبیاء کی جو قتل ہوئی"۔

"لِمَ قَتَلْتُمْ اَنْبِیَاءَ اللّٰهِ بِغَیْرِ حَقٍّ"

''بنی اسرائیل تم نے ناحق انبیائے خدا کو کیوں قتل کیا؟''

تو قتل ہوتے رہے ہیں انبیاء، کُل نہ سہی بعض سہی، وہ بعض بھی جو قتل ہوئے ہیں، وہ دو چار نہیں ہیں بلکہ ایک کثیر جماعت ہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبرانِ خدا میں سے ہمیں واقفیت ہی کتنوں سے ہے۔ سو تک تو نام ہمیں یاد نہیں اور وہ ایک لاکھ چوبیس ہزار، خدا جانے کتنے قتل ہوئے، کتنے قید کئے گئے، کتنے انبیاء ہیں کہ جو مظلومیت کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ لیکن ذرا غور طلب ہے یہ مسئلہ خاص طور پر صاحبانِ ذوق کیلئے۔ بہت سے انبیاء قتل ہوئے، بہت سے انبیاء اسیر ہوئے۔ لیکن ایک نبی کے بعد نبی اور بھی آنے والا ہے۔ جو قتل ہو رہے ہیں، اُن کے بعد سلسلۂ انبیاء برقرار ہے۔

ذرا غور کیجئے اس پر کہ اگر یہ تمام چیزیں آخری نبی کیلئے ہو جائیں کہ وہ بھی قتل ہو، اُس کی زندگی بھی اسیری میں گزرے، جس کے بعد کسی نبی کو آنا نہیں ہے، اگر آخری نبی کی زندگی مظلومیت میں گزر جائے، وہ مقتول ہو کر رہ جائے۔ وہ اسیر ہو کر دنیا سے رخصت ہو تو کیا نظامِ نبوت رہا؟ نظامِ شریعت رہے گا؟ پھر ایسا نبی آخری نبی قرار پا سکتا ہے جس کے بعد کوئی اُس کے کام کے سنبھالنے والا اور نبی کہلانے والا نہ ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ آخری نبی جو ہو اُس کی ابتدائی زندگی چاہے مظلومیت میں گزری ہو، مگر آخری زندگی اُس کی غالبانہ زندگی ہو، وہ مغلوب ہو کر نہ رہ جائے، وہ مغلوب ہو کر رہ جائے گا تو حکومت مغلوب ہوئی، شریعت مغلوب ہو گئی، نظام مغلوب ہو گیا۔ کون اٹھائے گا اب اُسے۔ اُس گری ہوئی چیز کو اٹھائے گا کون؟ جس کے بعد کوئی نبی ہی نہ ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ یہ نبی فاتح ہو کر جائے، غالب ہو کر جائے۔ یہ ضروری ہے کہ وہ قتل نہ ہو، اُس کیلئے اسیری نہ ہو، اور جب یہ ضروری قرار پایا ختم نبوت کی بناء پر، نبوت کی بناء پر نہیں بلکہ ختم نبوت کی بناء پر۔ یہ ضروری قرار پایا کہ وہ فاتحانہ شان سے جائے، غالبانہ شان سے جائے تا کہ اُس کا دین غالب رہے، تا کہ اُس کی شریعت برقرار رہے، اُس کی نبوت کے اثرات باقی رہیں۔ قتل جب نبی ہو گیا، مظلوم ہو کر جب دنیا سے رخصت ہوا، شریعت کہاں رہے گی اُس

کی، بات اُس کی کہاں رہے گی۔ یہ آخری نبی ہے، اس کیلئے زیبا نہیں، مناسب نہیں، اس کے حسب حال نہیں کہ یہ شہید ہو، یہ قتل ہو، یہ مظلوم ہو، یہ مغلوب ہو، یہ اسیر ہو اور جب اس کیلئے یہ مناسب نہیں،

ذرا سا سماں کھینچنا چاہتا ہوں آپ کے سامنے۔

قیامت کا دن ہے۔ کیوں جناب! ان کا سیدالانبیاء ہونا یہ محض نام کی بات ہے کیا؟ یہ نبیوں کے سردار ہیں۔ نبیوں کا سردار ہونا نام کی بات نہیں ہے۔ سیدالانبیاء ہونے کیلئے ضروری ہے کہ تمام انبیاء کا شرف ان میں موجود ہو۔ اگر کوئی شرف ایسا ہو کہ زکریا کو ملا، ان کو نہ ملا تو پھر یہ سید الانبیاء نہیں۔ کوئی شرف ایسا ہو کہ یحییٰ کو ملا اور ان کو نہ ملا تو پھر سیادت کہاں رہے گی۔ جوانانِ اہلِ جنت کی سرداری ہو اور انبیائے کرام کی سرداری ہو، تو یہ سرداری پگڑی بندھوانے کی وجہ سے نہیں ہے، محض دستار بندی کی سیادت نہیں ہے یہ۔ یہ سیادت اوصاف کی سیادت ہے، کمالات کی سیادت ہے، مراتب کی سیادت ہے، شرف کی سیادت ہے۔ جب تک کہ شرف ہر نبی کا ان میں نہ ہو، یہ سیدالانبیاء نہیں۔ جب تک کہ شرف تمام جوانانِ اہلِ جنت کا حسنؑ و حسینؑ میں نہ ہو، وہ جوانانِ اہلِ جنت کے سردار۔ اب جب آپ یہ چیز سمجھ چکے تو یہ منظر سامنے لایئے کہ قیامت کا روز ہوگا۔ جناب یحییٰ خدا کی راہ میں مارے گئے ہیں، سر کٹا ہے، سر قلم ہوا ہے۔ شراب خوار کی مجلس میں آپ کا سر رکھا گیا ہے۔ سربلند ہو کر آئے ہیں خدا کی بارگاہ میں۔ زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ پروردگار میں تیری راہ میں مارا گیا ہوں، میرا سر تن سے قلم ہوا ہے۔ میرا سر شراب خوار کی مجلس میں پہنچا ہے۔ اُس کے مقابلے میں ہمارا پیغمبر سر جھکا لے اور تسلیم کر لے کہ یحییٰ جو شرف تیرا ہے، میرا نہیں ہے۔ تم قتل ہوئے، میں قتل نہیں ہوا۔ جناب یوسف علیہ السلام پہنچتے ہیں، زبانِ حال سے کہتے ہیں کہ بارالٰہا! تیری رضا کو برقرار رکھنے کیلئے، عصمت و طہارت کی حفاظت کیلئے میں برسوں قید میں رہا۔ قید میں مَیں نے زندگی گزاری، ہمارے پیغمبر قید نہیں ہوئے، تو کیا ہمارے نبی کا سر جھک جائے گا؟ انبیاء پر پتھروں کا مینہ برسا ہے، جناب نوح کے بارے میں آپ سنتے رہتے ہیں۔

ان پر یہ بات نہیں ہوئی تو کیا جناب نوح کا سر اونچا ہوگا۔ وہاں ان کا (معاذ اللہ) نیچا ہو جائے گا۔ یہ تمام چیزیں آپ کو اسوقت نظر آئیں گی کہ جب آپ پیغمبرؐ آخر کو تنہا دیکھیں گے۔ لیکن اگر جلوہ یہ نظر میں ہے کہ سرکارؐ اس میدان میں تنہا نہیں ہوں گے۔ آپؐ کے ساتھ فاطمہ زہراؑ بھی ہوں گی، علی مرتضیٰؑ بھی ہوں گے، حسنؑ بھی ہوں گے، حسینؑ بھی ہوں گے، اس نور کے تمام اجزاء ہوں گے جن اجزاء پر قدرت نے اس نبیؐ کے کاموں کو بانٹا ہے اور نبیؐ کے کاموں کی تقسیم کی ہے۔

اب مجھے انصاف سے بتایئے کہ یحییٰ سرفراز ہوں گے یا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰؐ کہ جن کا نورِ نظر، لختِ جگر، سید الشہداء حسین علیہ السلام ہے۔ وہ نورِ نظر کہ جس نے خاتم الانبیاء کے بارِ رسالت کو ایسا بانٹا کہ اُس کی سربلندی پر شہادت کو ناز ہے۔ جناب یحییٰ شہیدِ راہِ خدا ضرور ہیں مگر مظلوم نہیں۔ بعد از شہادت آپؑ کا لاشہ پامالی کے عمل سے نہیں گزرا۔

فیصلہ کیجئے کہ روزِ قیامت خلیلؑ اللہ سرفراز ہوں گے یا حبیبؐ خدا۔ بے شک حضرت ابراہیمؑ امتحانِ رسالت پر پورے اُترے مگر وہ امتحان پلک جھپکنے کا تھا۔ آنکھ کھول کر جو دیکھا تو فرزند کو بخیر و عافیت، تندرست و توانا پایا۔ جیتے جاگتے نورِ نظر کے ہمراہ گھر میں داخل ہوئے۔

تصور کیجئے کہ ہمارے اور آپ کے آقائے دو جہاں روزِ عاشور طلوعِ سحر سے تا وقتِ عصر جامِ شہادت نوش کرتے ہوئے خاک و خوں میں غلطاں دیکھتے رہے۔

جنابِ اُمِ سلمیٰ سے روایت ہے، جو وقتِ شہادت امام حسین علیہ السلام مدینہ میں مقیم تھیں، بی بی فرماتی ہیں کہ روزِ عاشور وقتِ عصر آپ کی آنکھ لگ گئی۔ خواب میں سرکارِ رسالت کو اس حال میں دیکھا کہ سرکارِ دو عالم سر و پا برہنہ، خاک بہ سر اور روئے اقدس خون سے تر ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرا فرزند حسینؑ انصار و اقرباء کے ساتھ کربلا میں شہید ہو گیا۔ میں صبح تا عصر میدانِ کربلا میں موجود تھا۔

❁❁❁

بارہویں

مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"وَلَوْ اَنَّ قُرْآناً سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى". (رعد: ۳۱).

اس رخ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ حقیقتِ قرآن کیا ہے اور وہ حقیقتِ قرآن کہاں ہے؟ اصل قرآن کیا ہے، وہ کس کے پاس ہے اور اُس کا وارث کون ہے؟ خداوند عالم قرآنِ مجید کی اس آیت میں ارشاد فرما رہا ہے:

"اگر کوئی قرآن ہے ایسا کہ جس کی بدولت پہاڑوں کو، ساکن پہاڑوں کو چلایا جاسکے یا زمین کی بُعدِ مسافت کو طے کیا جاسکے، یا جس کے ذریعے سے مُردوں سے ہم کلام ہو سکے تو وہ یہی قرآن ہے اور ان تین ہی باتوں پر منحصر نہیں ہے بلکہ اللہ کے حکم سے اور اُس کی قرارداد سے ہر امر ممکن ہے۔

اس آیت کی روشنی میں اندازہ لگائیے کہ ہے کوئی قاریٔ قرآن ایسا، حافظِ قرآن ایسا، رات دن قرآن کی ورق گردانی کرنے والا ہے کوئی ایسا کہ جو ساکن پہاڑ کو رواں کردے۔ جو بُعدِ مسافتِ زمین کو فی الفور قرب سے بدل دے۔ جس کے ذریعے سے اموات سے، مُردوں سے بات کی جاسکے۔ ہے کوئی اس پر قادر؟ سورتیں پڑھے جائیں، پورے قرآن کی تلاوت کئے جائیں، مگر ہم نہیں دیکھتے کہ کسی کیلئے بھی ان میں سے کوئی بات ممکن ہے۔ لیکن حضرات اگر ممکن نہ ہوتی تو خداوند عالم غلط بات تو نہ کہتا۔ ماننا پڑے گا کہ یہ ذکر الفاظ کا نہیں ہو رہا، یہ ذکر ہے حقیقتِ قرآن کا۔ اور یہ شان اُنہی حضرات کی ہے کہ جن کے پاس حقیقتِ قرآن ہے۔ یہ وہی حضرات ہیں کہ:

"آیَاتٌ بَیِّنَاتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ"

"وہ آیاتِ بینات اُن کے سینوں میں ہیں جن کو علم دیا جاچکا ہے"۔

میں یہاں سرِ راہ ایک لفظ کہنا چاہوں گا کہ اگر آیاتِ قرآن پر نظر ہو کسی شخص کی تو یقیناً وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اولیائے خدا، انبیائے خدا، خدا کے بھیجے ہوئے، اُس کے ارسال کیے ہوئے جاہل ہو کر نہیں آتے۔ آنے کے بعد عالم نہیں ہوتے۔ عالم ہو کر آتے ہیں۔ علم لے کر آتے ہیں۔ خداوند عالم انہیں یہاں بھیجنے سے پہلے صاحبِ علم قرار دیتا ہے۔ آ کر عالم نہیں ہوتے، عالم ہو کر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنابِ عیسیٰ علیہ السلام روزِ پیدائش کہہ رہے ہیں کہ "آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا"۔ "اللہ مجھے کتاب دے چکا ہے اور اللہ نے مجھ کو نبی قرار دیا"۔ صیغہ ماضی کا ہے، یہ نہیں کہہ رہے کہ اللہ مجھے کتاب دے گا۔ گہوارے میں کہہ رہے ہیں کہ اللہ مجھے کتاب دے چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں کتاب سے مراد وہ انجیل نہیں ہے جو ہماری زبان پر آیا کرتی ہے۔ یہ کتاب وہی کتاب ہے جس کو لانے والے اپنے سینوں میں لاتے ہیں۔ جنابِ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں خاص طور پر بالکل نمایاں حیثیت میں یہ لفظ آتا ہے کہ جب دریا میں بہتے ہوئے صندوق کو بلندی سے فرعون اور اُس کی زوجہ نے دیکھا تو حکم دیا گیا کہ نکالا جائے اس صندوق کو، دیکھیں کیا ہے اس صندوق میں۔ نکالا گیا، کھولا گیا تو اُس میں سے ایک نہایت حسین بچہ نکلا۔ پیاری صورت والا، دلکش انداز والا۔ جسے دیکھ کر زوجۂ فرعون نے کہا کہ "اس بچے کو قتل مت کرو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ہمارے لئے سببِ مغفرت اور سببِ راحت ہو۔ ایسا پیارا ہے کہ ہمارا جی چاہتا ہے کہ اسے ہم اپنا بیٹا بنا لیں۔"

اب طے ہو گیا کہ اس کی پرورش ہونا چاہئے۔ خداوند عالم کا انتظام دیکھئے کہ جس موسیٰ کے تصور میں فرعون نے ہزاروں بچوں کو تہ تیغ کر دیا تھا، یہی وہ تھا جس کی خبریں دی گئی ہیں کہ وہ زوالِ سلطنت کا موجب ہوگا، تجھے تباہ کر دیگا، جس کے خطرے میں ہزاروں کو تہ تیغ کیا۔ اب خداوند عالم چاہتا ہے کہ اُسی بچے کو اس سے (فرعون) پرورش کروائے۔ پرورش اُس کی اُسی کے گھر میں ہو۔ حضرات! کیا کہوں، لفظ زبان تک آ گئے ہیں کہ قدرت نے اپنے انبیاء کو بدترین ماحول میں رکھا۔ جنابِ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے گھر میں، جنابِ ابراہیم علیہ السلام کو آذر کے

گھر میں، جناب یوسف علیہ السلام کو کسی کے گھر میں بدترین ماحول میں پلوایا اور دنیا کو دکھا دیا کہ تم جو صحبت صحبت کا سبق پڑھتے ہو، ذرا میرے مخصوص بندوں کو دیکھو کہ بدترین صحبت میں پلے، بدترین ماحول میں پلے مگر کیا اُس ماحول کا رنگ آیا اُن پر۔ کہاں پلے موسیٰ علیہ السلام، مگر جہاں پلے وہاں کا رنگ کیا چڑھا ہے اُن پر؟ کہاں پرورش پائی حضرت ابراہیمؑ نے، بت تراش کے گھر میں مگر بت شکن نکلے۔ کیسے ماحول میں رہے یوسف مگر پاک دامن نکلے۔ قدرت دکھانا چاہتی ہے اور بتانا چاہتی ہے کہ یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ چونکہ انبیاء بہترین صحبتوں میں رہتے تھے، اس لئے بہترین نکلتے تھے۔ میں بدترین مقام پر رکھ کر دکھائے دیتا ہوں کہ جو میرے ہوتے ہیں، وہ کہیں بھی رہیں اور کسی بھی ماحول میں رہیں، رنگ اُن پر میرا ہی رہے گا، دوسرا رنگ اُن پر نہیں آ سکتا۔ یہ تین مثالیں نظر کے سامنے ہیں جناب ابراہیمؑ کی، جناب موسیٰؑ کی اور جناب یوسفؑ کی۔ یہ اللہ کے مخصوص بندے ہیں۔ بدترین ماحول میں رہے مگر بہترین رہے۔ دشمنانِ خدا کے گھروں میں رہے مگر خدا کے دوست ہی رہے۔ کیا عجب ہے کہ اسی کے مقابلے میں شیطان نے بھی اپنا زور دکھانے کیلئے یہ بتایا ہو کہ بارِ الٰہا اگر تیرے یگانے اور تیرے اپنے بُری اور بدترین صحبتوں میں رہ کر بھی بہترین رہے ہیں تو ہیں کچھ ایسے کہ جن پر مجھے بھی ناز ہے، کچھ میرے بھی اپنے خاص ہیں۔ تو اگر اپنوں کو بدترین مقامات پر رکھ کر یہ دکھاتا ہے کہ اُن پر دوسرا رنگ نہیں آ سکا۔ پھر جو خاص میرے ہیں، میں بھی انہیں بہترین مقام پر بٹھا کر دکھانا چاہتا ہوں کہ اُن پر دوسرا رنگ چڑھ نہیں سکا اور جتنے بھی رہیں گے، جب تک رہیں گے، میرے ہی رہیں گے۔

اب یہ طے ہو گیا جناب موسیٰ علیہ السلام کیلئے کہ پرورش کرنا فرعون کے سپرد ہے۔ کیوں نہ طے ہوتا کہ قدرت نے قرارداد ہی یہ رکھی کہ فرعون تیرے ہی ہاتھوں پلواؤں گا اُسے جو تجھے برباد کرے گا۔ اب تربیت کی فکر ہے اور ظاہر ہے کہ ایک بچے کی پرورش کیلئے سب سے پہلے دودھ کی ضرورت ہے، روایات میں دنوں کا تعین آیا ہے اور وہ اچھے خاصے دن لکھے ہیں کہ جن دنوں میں جناب موسیٰ علیہ السلام بغیر دودھ کے رہے اور بھوکے رہے۔ میں اُن کا تعین نہیں بیان

کرنا چاہتا۔ اس لئے کہ روایات میں بعض اوقات کچھ مبالغے سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ میں ہر روایت کا پابند نہیں ہوں۔ بہر حال بہتے بہتے وہ صندوق نہ جانے کتنی دیر میں قصرِ فرعون کے نیچے تک پہنچا، اُس کے نکالنے میں کتنی دیر لگی۔ پھر جب وہ صندوق نکل آیا اور موسیٰ جیسا بچہ ظاہر ہوا تو کتنی دیر یہ مسئلہ زیرِ بحث رہا ہوگا کہ اسے قتل کرنا چاہئے یا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ جس کیلئے ہم سب کو قتل کرتے چلے آرہے ہیں، وہ یہی ہو، اگر یہ مسئلہ زیرِ بحث نہ آیا ہوتا تو زوجہ فرعون کا یہ جملہ جو قرآن مجید میں ہے کہ ''اسے قتل نہ کرو''، ہی بتا رہا ہے کہ قتل کی بات ہو رہی تھی۔ کتنی دیر میں یہ مسئلہ طے پایا ہوگا کہ قتل نہیں کرنا چاہئے، پالنا چاہئے۔ اب جتنی دیر لگتی ہے، اُتنی ہی دیر ان کے بے شیر رہنے کی بڑھتی جارہی ہے اور جب آخر یہ طے پا گیا کہ یہ پالنا ہے تو اب تلاش ہے دودھ پلانے والیوں کی۔ چنانچہ دودھ پلانے والیاں باری باری بلائی جارہی ہیں اور کوشش کی جارہی ہے کہ یہ بھوکا بچہ کسی کا دودھ قبول کرے۔ خداوند عالم نے مادرِ موسیٰ سے وعدہ کرلیا تھا اُس وقت جب وہ دریا میں ڈال رہی تھیں بحکمِ خدا اور گھبرا رہی تھیں اور اپنے فرزند کی مفارقت سے بیتاب ہو رہی تھیں تو خداوند عالم نے اُن کا حوصلہ قائم رکھنے کیلئے اور اُن کی ڈھارس بندھانے کیلئے وعدہ کرلیا کہ مادرِ موسیٰ گھبراؤ نہیں، تمہارا بچہ زندہ بھی رہے گا اور تمہارے پاس واپس بھی آئے گا۔ ہمیں تو اسے اپنا رسول بنانا ہے۔

''اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ''

''ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارا بچہ پھر تمہاری گود میں آئے گا اور ہم اس کو اپنا رسول بنائیں گے''۔

اے مادرِ موسیٰ! یہ زندہ رہے گا، دودھ پئے گا اور یہ ہمارا تم سے وعدہ ہے کہ تمہارے سوا کسی کا دودھ نہیں پئے گا۔ خداوند عالم نے موسیٰ کے دودھ نہ پینے کا وعدہ مادرِ موسیٰ سے کیا۔ پینا نہ پینا موسیٰ کا کام تھا۔ مگر نہ پینے کا وعدہ خداوند عالم نے اپنے اطمینان کی بناء پر کیا۔ جیسے کسی مطمئن نے کسی روز یہ بھی وعدہ کیا تھا، کل کا علمدار فتح کئے بغیر نہ آئے گا۔ آنا نہ آنا تو علمدار کا کام ہے، مگر

وعدہ رسولؐ کا ہے اور کسی اطمینان ہی کی بناء پر ہے۔

خدا نے وعدہ کیا کہ تمہارے سوائے مادرِ موسیٰؑ! یہ کسی کا دودھ نہ پئے گا۔ نتیجہ یہ قرار پایا کہ دودھ پلانے والیاں آتی ہیں، دودھ پلانا چاہتی ہیں، یہ بچہ ہزار بھوکا ہو مگر کسی کی طرف رخ نہیں کرتا، کسی کا دودھ پینا گوارہ نہیں کرتا۔ خداوند عالم نے یہاں کچھ ناز کے انداز سے یہ جملہ کہا ہے کہ موسیٰؑ کسی کا دودھ کیسے پی لیتے:

"حَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ"

"ہم نے تو اس کے پہلے ہی سے تمام دودھ پلانے والیوں کا دودھ موسیٰؑ پر حرام کر دیا تھا"۔

بارالٰہا! کمال ہے تیرا بھی اور اُس کا بھی جس پر تو نے ہر ایک کا دودھ حرام کر دیا۔ تو نے دودھ حرام کر دیا اور اُس نے حرام سمجھ لیا اور حرام سمجھ کر منہ پھیر لیا ہر طرف سے کہ یہ تو حرام ہے۔

جنابِ والا! یہ تو آیاتِ قرآنی ہیں، روایات تو نہیں ہیں۔ یہاں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جو انبیائے خدا ہوتے ہیں، خاصانِ خدا ہوتے ہیں۔ وہ روزِ پیدائش حرام و حلال کو جانتے ہیں۔ وہ علم کے حامل ہو کر آتے ہیں۔ خدا کی امانت کے امین ہو کر آتے ہیں۔

"عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ"

"آدم کو ہم نے زمین پر بھیج کر نہیں پڑھایا تھا بلکہ پڑھا کر زمین پر بھیجا تھا۔ آدم عالم ہو کر آئے تھے، آ کر عالم نہیں ہوئے"۔

اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی معیارِ حق و باطل کو پرکھنے کیلئے کافی ہے کہ جو پڑھ کر آئے، وہ من جانب اللہ ہے، اور جو آ کر پڑھے، وہ منجانب اللہ نہیں ہے۔ غرضیکہ آیاتِ قرآنی واضح طور پر بتا رہی ہیں کہ انبیاء کو اگر کتابیں دی بھی گئی ہیں، کسی کو توریت، کسی کو انجیل، کسی کو زبور، کسی کو قرآن دیا ہے مگر یہ طے شدہ ہے کہ ایسی کتاب خداوند عالم نے ہر نبی کو نہیں دی۔ کتاب کوئی نبی کے بغیر نہیں

آئی مگر نبی ہزاروں کتاب کے بغیر آئے ہیں۔ یہاں میری مراد کتاب سے وہی انجیل، زبور، توریت ہیں۔ یہ کتابیں کسی کسی پر اتری ہیں۔ ہر کسی پر نہیں اتریں مگر آیات قرآنی پر پھر ایک مرتبہ نظر ڈالیے گا، خداوند عالم فرماتا ہے کہ:

"لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَان"

"ہم نے جتنے بھی انبیاء و مرسلین بھیجے، ہم نے اُن کو معجزات کے ساتھ بھیجا اور ہم نے اُن کے ساتھ ساتھ کتاب اور میزان نازل کی"۔

کتاب کا نبی پر اترنا اور چیز ہے اور کتاب کا نبی کے ساتھ آنا اور چیز ہے۔ نبی کے ساتھ کتاب آئے گی تو نبی آتے ہی کہہ سکے گا کہ اللہ نے مجھے کتاب دی۔ قرآن تو وہ ہے جو نبی پر اترا، توریت وہ ہے جو نبی پر اتری، انجیل نبی پر اتری، یہاں تو ذکر یہ ہے کہ "اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَان"۔ ہر نبی کتاب اور میزان لے کر آیا ہے۔ اس سے مراد وہی کتاب صدری ہے جسے وہ سینے میں لے کر آتا ہے۔ یہ ہے وہ کتاب:

"آیٰتٌ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ"

یہ صدری کتاب جن کے پاس ہو اور خاص طور پر ذکر تو قرآنِ مجید کا ہے کہ:

"لَوْ اَنَّ قُرْآنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ"

"یہ وہ قرآن ہے کہ جس کے ذریعے سے پہاڑوں کو چلایا (ہلایا نہیں) جا سکے"۔

"قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ"

"زمین کو قطع کیا جا سکے"۔

کُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰی"

"جس کے ذریعے سے مُردوں سے بات کی جا سکے"۔

اس پر انحصار نہیں ہے۔ وہ قرآن جس کی یہ صفات ہوں اور جس کے یہ اثرات ہوں، کس کے پاس ہے؟ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ قرآن جس کے یہ صفات

بیان کئے گئے ہیں کہ زمینوں کو قطع کیا جاسکے، مُردوں سے بات کی جاسکے، پہاڑوں کو رواں دواں کیا جاسکے، وہ قرآن جس کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں، اُس کے وارث ہم ہیں اور اسی وراثت کا ذکر آیتِ قرآنی میں کیا گیا ہے کہ:

''ہم نے اپنی کتاب کا وارث اُن کو قرار دیا ہے جن کا اصطفیٰ ہم نے کیا۔ جن کو برگزیدہ ہم نے قرار دیا اور وہ ہمارے خاص بندوں میں سے ہیں۔ (صلوٰۃ)۔

یہ ہیں وارثانِ کتاب، انہیں وارثوں کا ذکر حدیثِ ثقلین میں مل رہا ہے۔ غرضیکہ اگر کسی میں دم ہو قرآن کی وراثت کے دعویٰ کا اور وارثِ قرآن ہونے کا تو ایک مثال دکھادے قطعِ زمین کی، ایک مثال دکھادے مُردوں سے بات کرنے کی، ایک مثال دکھادے کسی پہاڑ کو، کسی پتھر کو ہٹادینے کی، ہلادینے کی، لیکن بحمد للہ ''بَلْ لِلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِیْعًا'' میں تو یہ کہوں گا کہ پہاڑ کا چلانا کیا مشکل ہوگا اُسے جو اشارے سے ڈوبے ہوئے آفتاب کو پلٹادے۔ حدیثِ ردِّ شمس متفق علیہ حدیث ہے۔ یہ نہیں کہ اپنے مذہب کے غلو میں ایسا کہا جارہا ہے۔ وہ کون ہے جس نے اسی معجزے کو بیان نہیں کیا۔ ایک عالمِ اہلِ سنت کا ایک شعر سنا، وہ قصیدہ جو میں کبھی کبھی پڑھا کرتا ہوں کہ:

منم سنی ولیکن از تعصب الاماں گویم
پسند خاطرم انصاف از دنیا و مافیہا
سخن سنجیدہ می گویم، مضامین چیدہ می گویم
کتب را دیدہ می گویم چہ باک از طعنۂ بیجا
اگر از رجعتِ خورشید می پُرسی مکرر شد
یکے در عہدِ پیغمبر دوم در عہدِ این آقا

''میں سنی ہوں مگر میں تعصب نہیں رکھتا، دیئے جاؤ تم مجھے طعنے، مجھے ڈر نہیں، میں کتابیں دیکھ کر کہہ رہا ہوں علیؑ کے لئے دو مرتبہ آفتاب پلٹا ہے۔ ایک عہدِ پیغمبر میں اور ایک خود آپ (علیؑ مرتضیٰ) ہی کے عہد میں''۔

کیا کہنا اب پہاڑوں کے چلانے کا ذکر آپ ڈھونڈیں گے۔ خدا جانے کہ اُن کے مطلع انوار سے نصاریٰ نے کیا کیا نور دیکھ لئے تھے مباہلہ میں جواُن کی زبان پر آپس میں یہ جملے آئے ہیں کہ ہمارے سامنے وہ انوار ہیں کہ اگر یہ پہاڑ کو اشارہ کردیں تو وہ سرک جائے اور ہٹ جائے۔ قرآن کی کہی ہوئی بات نصاریٰ کی زبان پر آرہی ہے۔ کتنے واقعات ہیں حضرات ایسے کہ ہمارے آئمہ علیہم السلام ایک ایک لمحے میں قطع زمین پر قادر ہیں۔ کہیں سے کہیں پہنچے۔ کبھی اُن کیلئے زمین پھیل جاتی ہے اور کبھی اُن کیلئے زمین سمٹ جاتی ہے۔ وسعتِ ارض بھی ہوتی ہے تو کیا کہنا اور زمین سمٹ بھی جاتی ہے تو کیا کہنا۔

مباہلہ

جناب سلمان مدائن میں ہیں، بیمار ہیں اور مرض الموت ہونے کا اندازہ کر چکے ہیں۔ جناب اصبغ ابن نباتہ اُن کی تیمارداری کر رہے ہیں۔ ایک مرحلہ پر انہوں نے یہ سوال کرلیا کہ اچھا ہو آپ بتادیں کہ آپ کے آخری مراحل کون انجام دیگا؟ مطلب تجہیز و تکفین سے ہے۔ جناب سلمان نے جواب دیا۔ اصبغ! تمہیں کیا فکر ہے، مجھے وہی نہلائے گا جس نے رسولؐ کو نہلایا، مجھے وہی کفنائے گا جس نے رسولؐ کو کفنایا۔ اصبغ نے جواب دیا مگر وہ تو مدینے میں ہیں۔ کہاں مدینہ، کہاں مدائن۔ جناب سلمان نے کہا کہ مطمئن رہو۔ طائرِ روح سلمان نے پرواز کی، دنیا سے رخصت ہوئے، کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، اس اصبغ نے دوروازہ کھولا تو امیرؑ المومنین تشریف فرما ہیں۔ تشریف لائے، غسل دیا، کفن پہنایا، کفن پر کچھ اشعار بھی عقیدت کے سلمان کی طرف سے لکھے اور اسی بناء پر شمس تبریز نے ایک شعر کہا ہے اپنے قصیدہ میں، بڑا پُر لطف قصیدہ ہے۔ جناب امیر علیہ السلام کو پکار کر کہہ رہے ہیں، شمس خدا اُن کے درجات بلند کرے (آمین)۔ فرماتے ہیں:

وفاتِ سلمان

قطعت به الارض

مرگ سلمان بہ مدائن بہ نمازش رفتی

پئے عثمان نہ ہادی نہ چراگامے چند

"سلمان مدائن میں مرتے ہیں اور یا علیؑ آپ ان کی نماز کیلئے پہنچ جاتے ہیں مگر کسی اور کے جنازے کیلئے چار قدم کی بات تھی مگر آپ نے اٹھائے نہیں"۔

توجواب یہی ہوگا:

"مِنَّا اَھْلَ الْبَیْت"

"وہ ہمارا اپنا تھا"۔(صلوٰۃ)۔

طیِ ارض کے معجزات کتنے کچھ ہیں آئمہ اثناعشر کے۔ وسعتِ ارض کے معجزات کتنے کچھ ہیں اور مُردوں سے بات کرنا یہ اُن کیلئے کیا بیان کیا جائے۔ جنابِ سلمان دربان ہیں، اُس گھر کے فدائی اور شیدائی ہیں۔ خود ان کا ہی واقعہ مشہورِ عالم ہے کہ سرکارؐ نے خبر دی تھی کہ سلمان تمہاری آخری بیماری میں مُردے تم سے ہمکلام ہوں گے۔ یہ قبرستان میں آئے ہیں اور مُردے ان (سلمان) سے ہم کلام ہوئے ہیں۔ جن غلاموں کی یہ شان ہو، اُن غلاموں کے آقاؤں کی شان؟

"مُکَلِّمِ بِہِ الْمَوْتیٰ"

امام باقر علیہ السلام کا یہ معجزہ خاص طور پر آیا ہے کہ ایک شخص نے آپؑ کی خدمت میں یہ شکایت کی جو آپ کے چاہنے والوں میں سے تھا اور آپؑ کے ماننے والوں میں سے تھا۔ عرض کیا کہ سرکارؑ بات یہ تھی کہ میں آپؑ حضراتؑ سے اور آپؑ کے گھر سے محبت رکھتا تھا۔ میرا باپ آپ حضراتؑ سے دشمنی رکھتا تھا۔ وہ آپؑ کے اعداء میں سے تھا اور میں آپؑ کے دوستوں میں تھا، نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ میرا باپ صاحبِ زرِ کثیر ہوتے ہوئے یہ گوارہ نہیں کرتا تھا کہ اُس کا ورثہ مجھ تک پہنچے، اُس کا خزانہ میرے تصرف میں آسکے۔ وہ مر گیا ہے اور خدا جانے اُس نے اپنا زرِ کثیر کہاں چھپا ڈالا، میں محروم ہو گیا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا کہ تو اس جگہ کو معلوم کرنا چاہتا ہے جہاں وہ اپنا سرمایہ دفن کر گیا ہے۔ ہم نہیں بتاتے، سب سے اچھا یہ ہو کہ تیرا باپ تجھے بتائے۔ اللہ اکبر۔ جس میں یہ طاقت ہو کہ وہ مُردے سے پوچھ لے، وہ خود کیا نہیں بتا سکتا کہ خزانہ کس جگہ ہے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم نہیں بتاتے، زیادہ اچھا ہو کہ وہی بتائے۔ آپؑ نے کچھ لکھ دیا ایک رقعے پر اور فرمایا کہ رات کے وقت جانا قبرستان میں اور یہ لفظ (کوئی لفظ تعلیم کر دیا) کہہ کر پکارنا کسی کو۔

ایک شخص تیرے سامنے آئیگا، یہ پرچا اُس کو دیدینا اور وہ تیرے باپ کو تیرے سامنے حاضر کردیگا۔ چنانچہ امام کا رقعہ لے کر گورستان میں پہنچا اور وہ ہی لفظ کہہ کر آواز دی۔ فوراً ایک شخص سامنے آیا اور اس نے امام کا وہ چھوٹا سا رقعہ اُس کے حوالے کیا۔ خدا جانے امام علیہ السلام نے کس خط میں، کس زبان میں، کیا لکھا تھا۔ اُس شخص نے کہا کہ اچھا تو اپنے باپ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں لاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ ایک شخص کو پکڑے ہوئے لایا جس کا حلیہ عجیب تھا۔ حلیہ تو عجیب ہونا ہی تھا، دشمن اہلِ بیت تھا۔

سیاہ بحال تباہ سامنے لایا تو اس نے اپنے باپ سے کہا کہ وہ خزانہ تو بتادے اور یہ حال کیا ہو گیا ہے تیرا؟ اُس نے کہا کہ خوشا بحال تیرا کہ تو محب اہلِ بیت ہے اور بدنصیبی میری کہ میں دشمن اہلِ بیت تھا، اُس کی سزا بھگت رہا ہوں اور یہ صحیح ہے کہ یہ دیکھ کر میں نے کہ تو محب اہلِ بیت ہے، دوستِ اہلِ بیت ہے، یہ گوارہ نہ کیا کہ تو اس کثیر رقم کا مالک ہو۔ میں نے فلاں درخت کے نیچے (اتا پتہ دیا)، کثیر سرمایہ گاڑ رکھا ہے، جا کر نکال لے۔ اُس میں لفظ یہ بھی ہے کہ اس میں سے کچھ امام کیلئے میری طرف سے بطور تحفہ۔

میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ مرنے کے بعد ہر منکر مُقر ہوگا۔ ہر نہ ماننے والا ماننے لگے گا۔ اس لئے کہ مرنے کے بعد تو انکارِ خدا کرنے کی، انکارِ رسولؐ کرنے کی، انکارِ امام کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہو سکتی۔ اب تو حقائق سامنے آگئے۔ مرنے کے بعد تو نہ ماننے والا بھی مانے گا۔ مگر وائے ہے ایسے ماننے پر۔ خداوند عالم یہ نہیں دیکھنا چاہتا کہ مر کر کس نے مانا۔ خدا دیکھنا چاہتا یہ ہے کہ مان کر کون مرا۔ مانا وہ ہے جو مرنے سے پہلے ہے۔ بہر حال اُس نے وہ خزانہ نکالا اور کچھ رقم امام علیہ السلام کی خدمت میں پیش کی۔ امام علیہ السلام نے فرمایا کہ اُس کے اعمال سے اُس کے عذاب میں تخفیف ضرور ہوگی۔

یہ شان سوائے اُن حضرات کے کس کی ہے کہ مُردوں سے باتیں ہوں۔ زمین کبھی اُن کے لئے پھیل جائے، کبھی اُن کیلئے سمٹ جائے۔ جناب امام زین العابدین علیہ السلام کا وہ معجزہ جو

تاریخ ہے، تاریخ اسلام کا جزو ہے، جو اتنا بلند ہے کہ وہ مذہبی کسی بحث میں لایا جاسکے۔ مشہور عالم معجزہ ہے کہ ہشام ابن عبدالملک ولی عہد سلطنت ہے۔ وہ حج کیلئے آیا ہے۔ کر و فر بھی ہے، احتشام بھی ہے، ارکان بھی ہیں، داعیان بھی ہیں، حکومت کے سامان بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ولی عہد سلطنت کس شان سے آیا ہوگا۔ مگر جب اُس نے احرام باندھ کر خانہ کعبہ کا طواف کیا اور طواف کر کے جب حجرِ اسود کی طرف بڑھنے لگا تو جمِ غفیر تھا۔ وہاں کون کس کو جانے، وہاں کون کسی کو پہچانے کہ اس کیلئے ہم راستہ دیدیں! اس کیلئے ذرا ہم ہٹ جائیں، کوئی وہاں ہٹنے والا، دینے والا ہے کیا؟ یہ اپنے شاہی طنطنہ میں ہے، راستہ دینے والا کوئی ہے ہی نہیں، اس لئے کہ ہے ہی گمراہ۔ گمراہ کو کون راستہ دے! جب اُسے راستہ نہ ملا تو یہ عاجز ہو کر ایک طرف کو آ کر کھڑا ہوگا۔ جہاں یہ آ کر کھڑا ہوا، وہاں اس کے ارکان و اعیان جو ساتھ میں تھے، دائیں بائیں کھڑے ہوگئے۔ اب یہ طواف کرنے والوں کے طواف کو دیکھ رہا ہے۔ یکا یک اس نے دیکھا کہ ایک بزرگ نورانی صورت تشریف لائے، وہ ہیں امام زین العابدین علیہ السلام۔ آپؑ نے طواف کیا اور طواف کے بعد حجرِ اسود کی طرف آپؑ اس طرح بڑھے جیسے آپؑ کے اور حجرِ اسود کے درمیان میں کوئی حائل نہیں۔ رہنما ہیں آپؑ تو۔ راستہ جیسے کہ پہلے ہی سے بنا ہوا ہے۔ آپؑ بے تکان حجرِ اسود تک پہنچے اور آپؑ نے ہاتھ رکھ کر بوسہ دیا۔ دوسرا طواف کیا اور اسی شان سے آپؑ بڑھے، بے تکان آپؑ نے حجرِ اسود تک پہنچ کر بوسہ دیا۔ سات طواف ہیں، ہر طواف میں مستحب ہے بوسہ دینا۔ ہشام کھڑا دیکھ رہا ہے۔ اپنا بھی انجام دیکھ چکا، امامؑ کی شان دیکھی۔ خوب جانتا ہے کہ یہ کون ہیں؟ مگر دائیں بائیں شامی جو اُس کے ساتھ ہیں، وہ نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے اسی سے پوچھ لیا کہ یہ کون ہیں؟ جل تو پہلے ہی سے رہا تھا۔ غرور و تکبر پر ایک اور تازیانہ لگا کہ یہ کون ہیں؟ اس نے بات کو ٹالنے کیلئے کہہ دیا کہ میں نہیں جانتا۔ بات ختم ہوگئی کہ میں نہیں جانتا۔ جیسے ہی اس نے کہا کہ میں نہیں جانتا۔ فرزدق محب اہلِ بیتؑ شاعر مشہور زمانہ نے یہ لفظ سن لیا کہ اس نے کہا ہے کہ میں نہیں جانتا۔ خداوند عالم نے کچھ ایسی تائید کی ہے جناب فرزدق کی، کچھ ایسی تائید کی ہے کہ کھڑے کھڑے اُنؑ کی شان میں وہ

مرصع قصیدہ حسب حال، تازہ تازہ ایسا پڑھ گئے کہ آج تک وہ عربی زبان کا بہترین ادبی سرمایہ ہے۔ وہ قصیدہ مسلمانوں کے ایک فرقے کے امام علیہ السلام کی مدح قرار دے کر نہیں پڑھایا جاتا بلکہ ادبی شاہکار قرار دے کر۔ ہم نے بھی وہ قصیدہ زمانۂ طالب علمی میں عربی کے بی۔اے کورس میں پڑھا تھا۔ اس وقت ہمیں معلوم بھی نہیں تھا کہ یہ کیا ہے۔ ایک ادبی شاہکار ہے اور کھڑے کھڑے کہا ہے۔ اس کے کچھ اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

(۱)

هذا الذی تعرف البطحاءُ وطأتَهٗ
والبیت یعرفه والحلُّ والحرمُ

"یہ وہ ہیں کہ حرم کے سنگریزے جس کے پیروں کے تلووں کو پہچانتے ہیں
کعبہ انہیں پہچانتا ہے، حل انہیں پہچانتا ہے، حرم انہیں پہچانتا ہے

(۲)

ولیس قولُک مَن هذا بضائرہٖ
العرب تعرف من انکرتَ والعجم

تیرا یہ بک دینا کہ میں انہیں نہیں جانتا ان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا
جسے تو نہیں پہچانتا اُسے سارا عرب پہچانتا ہے، تمام عجم پہچانتا ہے

(۳)

هذا ابن خیر عباد اللّٰه کلهم
هذا التقی النقی الطاهر العلم

یہ اُس کا بیٹا ہے جو اللہ کی ساری خدائی میں سب سے افضل ہے
تقی ہیں تو یہ ہیں، نقی ہیں تو یہ ہیں، طاہر ہیں تو یہ ہیں، عَلَم ہیں دین کا"

ایک شعر تو اتنا پسند آیا ہے، میرے جذبات ایمانی کے بالکل مطابق ہے۔ کمال کیا ہے یہ کہہ کر، فرماتے ہیں:

(۴)

یکاد یمسکه عرفان راحته
رکن الحطیم اذا ماجاء یستلم

''لوگو تم تو یہی دیکھ رہے ہو بس کہ یہ حجرِ اسود کو بوسہ دے رہے ہیں۔ میرا ایمان یہ دیکھ رہا ہے کہ جس وقت یہ حجرِ اسود پر ہاتھ رکھتے ہیں، حجرِ اسود انہیں پہچانتا ہے اور ان کے ہاتھ کو چومتا ہے۔ ان کی ہتھیلی کو پہچانتا ہے۔

یُغضی حیاءً و یُغضیٰ من مہابتہ

فما یکلم الا حین یبتسم

''یہ تو حیا کی وجہ سے اپنی آنکھوں کو خم رکھتے ہیں مگر ہر نگاہ ان کے سامنے جھک جاتی ہے، ان کی ہیبت کی وجہ سے، ان کے وقار اور ہیبت سے نگاہیں ان کے سامنے آکر جھک جاتی ہیں۔ کس کی مجال ہے جو ان سے بات کر سکے۔ لوگ ان سے بات کرنے کیلئے ان کی مسکراہٹ کا انتظار کرتے ہیں کہ جب تبسم عارض ہو، مسکرائیں تو ان سے کلام کریں۔''

سخاوت کا عالم بیان کیا ہے اور کس انداز میں بیان کیا ہے۔ امامؑ کے سامنے قصیدہ پڑھا جارہا ہے یہ:

ما قال لا قط الا فی تشہدہ

لولا التشہد کانت لاءہ نعم

''انہوں نے کبھی ''لا'' کہا ہی نہیں مگر تشہد میں، اگر تشہد نہ ہوتا تو یہ تشہد والا ''لا'' ''نعم'' ہو جاتا۔

یعنی ''لا'' کبھی ان کی زبان پر آیا ہی نہیں مگر کیا کروں تشہد میں ''لا'' ہے''۔ اللہ، اللہ۔ یہ اُس کی سخاوت کا ذکر ہے، یہ اُس کے وقار کا ذکر ہے، یہ اُس کی ہیبت کا ذکر ہے کہ جس کی اسیری کے نقشے کے سوا اب ہماری نگاہوں میں کوئی نقشہ آتا ہی نہیں۔ جب جناب سید سجادؑ کا نام آئے گا، ایک ضعف ہے کہ جس کا تصور ہوگا، ایک اضمحلال ہے کہ جس کا تصور ہوگا، ایک طوقِ گلو گیر ہے جس کا تصور ہوگا، کچھ بیڑیاں ہیں۔ اللہ، اللہ۔ جناب سکینہؑ، جناب سید سجادؑ سے پوچھ رہی ہیں۔ بہن بھائی سے پوچھ رہی ہے:

''تم جو پہنے ہو یہ زیور، اسے کیا کہتے ہیں،

بولے سجادؑ کہ زنجیر ہے مشہور مگر......

ہم اسے سلسلۂ صبر و رضا کہتے ہیں"

یہ ہیبت اسیر کیلئے ہے جو پابہ زنجیر بھی ہے، طوق جس کے گلوگیر بھی ہے۔ اپنے قافلے کا ساربان بھی ہے۔ بیبیوں اور لاوارثوں کے ناقوں کی مہار جس کے بندھے ہوئے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ، اللہ۔ یہ شانِ بیکسی کہوں کہ میرے اس امامؑ کے دونوں ہاتھ سامنے رکھ کر نہیں باندھے گئے بلکہ پس گردن ہاتھوں کو باندھا گیا ہے اور اُن بندھے ہوئے ہاتھوں میں ناقوں کی مہار بندھی ہوئی ہے اور سجادؑ اُن ناقوں کی مہار کو کھینچ رہے ہیں۔ آپ نے نقشہ کھینچا ہے اپنی اس روانگی کا ان الفاظ میں:

''دمشق کا بازار تھا اور مجھے ذلیل کر کے کھینچا جا رہا تھا، گویا کہ میں زنجبار کا کوئی غلام ہوں اور غلام بھی وہ جس کا کوئی مددگار نہ ہو"۔

کاش روزِ عاشورہ میں بھی شہید ہو چکا ہوتا، کاش فہرستِ شہداء میں میرا بھی نام ہوتا۔ یہ اسیری نہ دیکھنی پڑتی، یہ ماں بہنوں کی بے ردائی نہ دیکھنی پڑتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی سید الصابرین کہا جائیگا تو آپؑ ہی کی ذات مراد ہوگی۔ کربلا کے شہیدوں نے وہ کچھ نہیں دیکھا جو اس بیمار نے دیکھا ہے، جو اس اسیر نے دیکھا ہے۔ اس کی مہم میں بالیقین کہہ سکتا ہوں کہ علی اکبرؑ کی مہم سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ کربلا کے شہیدوں کی مہم آسان تھی، سیدالصابرین کی مہم حد درجہ کٹھن۔

اللہ اللہ! مخدراتِ عصمت کو سر برہنہ کوچہ و بازار میں دیکھنا......

الا لعنة اللّٰه علی القوم الظالمین

تیرہویں

مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فَالَّذِیْنَ آمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (اعراف: ۱۵۷).

''جولوگ ان پر ایمان لائے اور ان کی توقیر کی اور ان کی نصرت کی اور اس نور کی پیروی کی جو ان پر نازل کیا گیا، تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں''۔

ہمارے اس اجتماع کا مقصد ایصالِ ثواب ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم سے بچھڑ جانے والوں کے ساتھ ہمارا رابطہ برقرار رہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے تعاون کے عنوان الگ ہیں، زندہ کی خدمت کے طریقے دوسرے ہیں، جو چیزیں زندگی میں مفید، مددگار اور پسندیدہ ہوتی ہیں، موت ایک ایسا انقلاب ہے کہ اب اُن میں سے کوئی شے کارگر نہیں، مفید نہیں اور مرنے والے کو پسند نہیں۔ بیمار کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے، اُسے بستر اور آرام کی جگہ چاہئے، اُسے رات کے اندھیرے سے بچنے کیلئے چراغ چاہئے، تنہائی سے بچنے کیلئے مونس و رفیق چاہئے۔ لیکن موت ایک ایسا انقلاب ہے کہ اب اُسے حاجتِ چراغ نہیں، اب اُسے یہاں کے کسی مونس کی ضرورت نہیں، اب اُس کا مقام کسی آبادی میں ہونا مناسب نہیں۔

اب نہ اُسے کسی چارہ ساز کی ضرورت، نہ دوا کی، نہ غذا کی ضرورت ہے۔ اب وہ ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہے۔ ایسے عالم میں ہے کہ یہاں کی کوئی شے اس کیلئے مفید نہیں۔ اگر کوئی چیز اُس کے لئے فائدہ بخش ہے تو وہ چیز جس کا تعلق آخرت سے ہو۔

اسی لئے ہم چاہتے ہیں کہ اپنے بچھڑنے والے عزیز کو جو کچھ کارِ خیر ہو سکے، اُس کا ہدیہ پیش کریں۔ ثواب پہنچانا جب ہی ممکن ہے، جب ہمارے دامن میں ثواب ہو۔ وہی چیز ہم کسی کو دے سکتے ہیں جو ہمارے پاس ہو۔ ثواب پہنچانا منحصر ہوا ثواب پانے پر۔

حضرات! ثواب وہ شے نہیں ہے جو مقدر سے مل جائے۔ مقدر سے دنیا کی چیزیں ملا کرتی ہیں۔ ثواب آخرت کی چیز ہے۔ آخرت کا بننا یا بگڑنا مقدر پر منحصر نہیں ہے۔ جو بنائے گا، بن جائے گا، جو بگاڑے گا، بگڑ جائے گا۔ آخرت کا مقدر وہ مقدر نہیں جو خدا بناتا ہے، یہ وہ مقدر ہے جو بندۂ خدا خود بناتا ہے۔ وہ تو روزِ جزاء ہے، جو کرنے والے نے کیا ہے، شیریں یا تلخ، اُسی کا پھل ملے گا۔ اپنا بویا ہوا وہاں کاٹے گا۔

ثواب کا تعلق آخرت سے ہے اور آخرت کی چیز سعی و عمل سے ملتی ہے۔ یہ چیز ایسی نہیں جو مانگنے سے یا بیٹھے بٹھائے مل جائے۔

اس لئے فوراً ایصالِ ثواب جس کی غرض ہوتی ہے، اُس کی نظر میں فطرتاً یہ غرض آتی ہے کہ میں کوئی ثواب کا کام کروں، اس کا ثواب دنیا سے رخصت ہو جانے والے تک پہنچاؤں۔ لہٰذا کارِ ثواب لازمی ہوا، ایصالِ ثواب کیلئے۔ اب اپنی اپنی نظرِ انتخاب ہے، کوئی ثواب حاصل کرنے کیلئے یہ کام کرتا ہے، ذوقِ نظر ہے، نگاہ کا انتخاب ہے۔ جیسی نظر ہو گی ویسا ہی انتخاب ہو گا۔

کیا کہنا کارِ ثواب کے ان منتخب کرنے والوں کا! جو ثواب کا وہ کام منتخب کرتے ہیں، جو خدا کی نظر میں حقیقتاً منتخب ہے۔ اس کارِ ثواب کا انتخاب خدا کی نظر میں اس درجہ اہم ہے کہ خدا کو اپنا وہ ذکر پسند نہیں، جس میں ان حضراتؑ کا ذکر نہ ہو۔

"وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ"

"اللہ کا ذکر چونکہ سب سے بڑے کا ذکر ہے، اس لئے سب سے بڑا ذکر ہے"۔

ذکر اللہ ہے نماز اور جا بجا نماز کو قرآن مجید میں یاد کیا گیا ہے۔ مگر حضرات جس نماز میں ، جس ذکرِ خدا میں ان حضراتؑ کا ذکر نہ ہو، وہ نماز لائقِ ذکر نہیں ہے۔ آپ کہے جائیں اُسے نماز مگر نہیں۔ اُس میں روحِ نماز نہیں، وہ مُردہ ہے۔ اُس میں جان نہیں۔

میں نے اکثر یہ سنایا ہے توجہ کیلئے، خود پیغمبرِ خدا بھی توجہ دلانے والے ہیں:

"وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ...........وَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ"

میں نے اکثر کہا ہے کہ جملہ تو یہ مشہور ہو گیا ہے:

"لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابْ"

"کوئی نماز الحمد کے بغیر نہیں"۔

اور واقعاً شب و روز جو نمازیں پڑھی جاتی ہیں، وہ فرض ہوں یا نافلہ ہوں، واجب ہوں یا مستحب ہوں، روزانہ کی ہوں، ہفتہ وار، جمعہ کی ہوں، عیدین سالانہ ہوں، کوئی نماز ایسی نہیں نظر آتی جس میں سورۂ الحمد نہ ہو اور میں اپنی جگہ یہ کہوں گا کہ سورۂ الحمد کا نزول ہی حقیقتاً تلاوتِ نماز کیلئے ہوا ہے۔

کہنے والا جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کہنا یہ بھی نہیں بتاتا کہ یہ خدا کا کہنا ہے۔ فوراً یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی بندۂ خدا ہے جو کہہ رہا ہے۔

پہلی آیات "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن" "تمام حمد خدا کیلئے ہے، جو عالمین کا رب ہے۔ جو رحمن ہے، رحیم ہے، روزِ جزاء کا مالک ہے"۔ یہاں تک کی آیات بھی یہی بتاتی ہیں کہ کہنے والا خدا کے سوا کوئی اور ہے۔ اگر یہاں تک بات زیادہ واضح نہیں ہوئی تو پھر:

"ہم محض تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور محض تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ تو ہمیں صراطِ مستقیم پر قائم رکھ۔ اُن کی راہ پر جن پر تو نے انعام کیا ہے۔ اُن کے راستے سے بچا جو مغضوب ہیں، جو ضالین ہیں"۔

کیا یہ خدا کہہ رہا ہے کسی سے؟ کوئی ہے جو خدا کا معبود ہو؟ جس کے سامنے خداوند عالم دست بدعا ہو؟ یہ بات خدا کے کہنے کی نہیں۔ سورۂ الحمد میں جو بھی ذکر ہے، جو بھی بات ہے، وہ بندے کے کہنے کی ہے، بندے کی جانب سے ہے۔

اس سورۂ الحمد کو دیکھ کر بعض نافہم کہنے لگے کہ قرآن کلام اللہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس میں تو عبد کے کلام کی صاف جھلک نمودار ہو رہی ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ خداوند عالم نے ہمارے لئے ہماری عرض کا مضمون خود مرتب کر کے بھیجا ہے۔ اس لئے کہ ہم اتنے نادان ہیں کہ خدا کے حرم میں

داخل ہو کر ہم خدا سے بات کرنے کا شعور نہیں رکھتے۔ اگر ہمیں مطلق العنان چھوڑ دیا جاتا کہ ہمارے حرم میں داخل ہو کر احرام تکبیر کہہ کر جو چاہو مانگو اور ہم (خدا) سے جو چاہو کہو تو اکثر وہ باتیں کہتا نمازی جو بیکار تھیں، عبث تھیں، مہمل تھیں۔

خداوند عالم نے یہ چاہا کہ بے شعور انسان کو دعا کرنے کا شعور سکھا دے۔ میری بارگاہ میں پہنچ کر تمہیں مجھ سے کیا مانگنا چاہئے، مضمون خود مرتب کر کے بھیج دیا۔

سورۂ الحمد کلام اللہ ہے۔ مگر وہ اس لئے ہے کہ ہم اپنی زبان پر، اپنی جانب سے، خدا کی بارگاہ میں اپنے معروضات کو پیش کریں۔ خصوصیت سے سورۂ الحمد نماز کیلئے ہے۔ نماز کا جماعت سے ادا کرنا برتر و افضل ہے اور انتہائی موجب ثواب ہے، بقول معصوم کہ اگر دس آدمی جماعت میں ہوں تو فرشتے اُس کے ثواب کو نہیں لکھ سکتے۔ اُس کا ثواب اعداد و شمار میں محدود نہیں ہو سکتا۔

چونکہ جماعت زیادہ ثواب نماز کا موجب ہے لیکن بعض اوقات جماعت میسر نہیں آتی۔ اس لئے کہ اُس کیلئے کچھ آداب بھی ہیں، کچھ شرائط بھی ہیں۔ ہر ایک کی نماز میں ہم اپنی نماز کا پیوند نہیں لگا سکتے، اس لئے بہر حال تنہا ہے آدمی، جماعت کیسے ہو؟ اگر تنہا نہیں بھی ہے تو میں نماز پڑھتا ہوں، آپ نہیں پڑھتے، جماعت کیسی؟ نماز پڑھانے کے لائق ہی نظر نہیں آتا ہم میں کوئی، تو بعض اوقات ان مجبوریوں کی وجہ سے انسان شرف فضیلت و جماعت حاصل کرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ اب خداوند عالم کا رحم و کرم دیکھئے کہ اُس نے فرادا اور تنہا صورت میں نماز پڑھنے کی حالت میں بھی کیف نماز پیدا کر دیا۔ خدا کے سامنے کھڑا ہو کر نمازی:

"اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ"

''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے مدد چاہتے ہیں''۔

''اعبد'' نہیں کہہ سکتا، ''استعین'' نہیں کہہ سکتا، میں تیری عبادت کرتا ہوں، میں تیری مدد چاہتا ہوں بلکہ ''نَعْبُدُ'' ہم عبادت کرتے ہیں۔

خدا کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر اتنا گستاخ، اتنا جسور، اتنا جری، بڑا ہمہمہ ہے، اپنے

آپ کو ہم کہہ رہا ہے! حقیقتاً انسان تنہا اپنی ذات کو ہم نہیں کہہ سکتا اور تنہا اپنی ذات کیلئے ہم نہیں کہلایا جا سکتا۔ یہ "ہم" کہنا جبکہ کہنے والا یکہ وتنہا اور وحدہٗ لاشریک ہو، یہ اللہ ہی کی شان ہے۔ وہ رب ذوالجلال اپنے کمال وجلال کی بناء پر اپنے آپ کو ہم کہے جبکہ وہ جمع نہیں ہے، واحد ہے۔

"اِنَّا اَنْزَلْنَاہُ"

"نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ"

"اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ"

کبر زیبا ہے فقط خالق یکتا کیلئے۔

خدا کیلئے تو ٹھیک ہے لیکن اپنی ذات کیلئے اگر میں "ہم" کہوں اور کہوں بھی کس کے سامنے کھڑا ہو کر! اظہار عجز کا تو یہ عالم ہے کہ خاک پر سر رکھے ہوئے ہیں۔ اپنے قد وقامت کو توڑ کر جھکا ہوا ہوں۔ انکسار ہے یہ۔ انکسار کے معنی ہی ٹوٹنے کے ہیں۔ جیسے مظلومِ کربلا نے فرمایا:

"اِنْكَسَرَ ظَهْرِیْ"

"میری کمر ٹوٹ گئی"۔

اب کس طرح یہ نمازی ٹوٹ ٹوٹ کر خدا کی عبادت کر رہا ہے۔ اصل میں قیام جھکنے ہی کیلئے ہے اور سجدہ جھکنے کی انتہا۔ نماز جھکنے کی انتہا ہے اور ادھر اکڑنے کا یہ عالم ہے کہ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں"۔ کیا یہ تکبر خدا خود ہی سکھا رہا ہے؟ ایسا نہیں ہے۔

معصومین علیہم السلام کا بیان ہے کہ خداوند عالم چاہتا یہ ہے کہ نمازی تنہا اپنی نماز کو نہ پیش کرے:

"میں تیری عبادت کرتا ہوں، میں تجھ ہی سے مدد چاہتا ہوں، تو مجھے صراط مستقیم پر قائم رکھ"۔

"میں" کہتا ہے تو عبادت بھی اکیلی رہ گئی، استعانت بھی اکیلی رہ گئی۔ دعائے ثبات قدم بھی محض اسی اکیلے کی دعا۔ یہ دعا کمزور رہے گی۔ اس دعا میں اس نے کسی قوت کو شامل نہیں کیا،

اس اپنی عبادت میں کوئی قوی وسیلہ اختیار نہیں کیا۔ محض اپنے آپ کو اور محض اپنی عبادت کو نہ پیش کرے بلکہ اس نیت سے کہ میں اور تیرے تمام ملائکہ، اور تیرے تمام عبادت گزار، ارض وسما کے، برو بحر کے، زیر وزبر کے تمام عبادت گزار، ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

اس طرح سے نمازی نے اپنی عبادت کو کروڑوں عبادتوں میں لپیٹ کر، جوڑ کر خدا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اب ان عبادت گزاروں میں وہ بھی ہیں جن کی عبادت رد نہیں کی جاسکتی، جن کی دعا رد نہیں کی جاسکتی۔

اس طرح سے معصوموں کی عبادتیں بھی ساتھ مل گئیں۔ بے گناہوں کی عبادتیں بھی اس کی عبادت میں شامل کی جارہی ہیں تاکہ اس اجتماع کی بناء پر یہ عبادت، اگر تنہا کی مقبول نہ بھی ہوتی تو اس وسیلے سے مقبول ہوجائے۔

یعنی یہ اکیلا بھی گویا جماعت ہی سے نماز پڑھ رہا ہے۔ عملاً یہ جماعت نہیں ہے مگر قصداً، نیت اور عزم سے جماعت کی صورت پیدا ہو رہی ہے۔

واقعاً سورۂ الحمد کے بعد آپ کو پڑھنا تو ہے کچھ جملۂ قرآن مگر آپ کے انتخاب پر ہے۔ کوئی تعین نہیں ہے۔ سورۂ جمعہ ہو، سورۂ منافقون ہو، سورۂ توحید ہو، کچھ بھی پڑھ لیں۔ لیکن الحمد کے بارے میں تو کچھ سوچئے کہ پڑھ لیں۔

حضرات! بدل تو اُس کا ہوتا ہے جو بے بدل نہ ہو، وہ (سورۂ الحمد) تو بے مثل ہے۔ اس لئے ہر فرض ومستحب نماز میں، رات کی نماز میں، دن کی نماز میں، سورۂ الحمد ہے۔ مگر ان تمام نمازوں میں حضرات والا ایک نماز ایسی بھی نظر آتی ہے کہ اُس میں سورۂ الحمد بھی نہیں اور یہی کیا نہیں، رکوع بھی نہیں، سجدہ بھی نہیں۔ ہمارے یہاں باوضو وہ نماز اگر پڑھی جائے تو افضل تو ضرور ہے مگر وضو کی بھی شرط نہیں۔

خداوند عالم یہ چاہتا ہے کہ مومن کے جنازے میں بے تکلف اور بے تامل جو کوئی بھی، جہاں بھی ہو، شامل ہوجائے۔ جنازہ سامنے سے گزر رہا ہے، نماز ہونے والی ہے، ہم راستہ چلتے

جا رہے ہیں، اگر ہمارے لئے یہ شرط ہوگی کہ جائے غسل بھی ہو، باوضو بھی ہو، مجبور ہو گئے، کھڑے دیکھ رہے ہیں۔

خداوند عالم نے شرکت جنازۂ مومن کو اتنا اہم قرار دیا ہے، جو عام نمازوں کی شرائط ہیں، ساقط کردیا۔ یہ شروط اگر ہوں گے تو اکثر شرکت جنازہ سے مانع ہوں گے۔ مومن کے جنازے پر نماز پڑھنا حضرات رنگ لانے والی چیز ہے۔ ایک حدیث میں ملا ہے:

"مَنْ صَلّٰی عَلٰی مَغْفُوْرٍ غُفِرَتْ لَهٗ ذُنُوْبُهٗ"

"اگر قسمت سے کسی ایسے جنازے پر نماز پڑھنا میسر آجائے جو جنازہ مغفور کا ہو، نمازی کے بھی گناہ بخشے جائیں گے"۔ مغفور کے جنازے پر نماز پڑھنا لائق مغفرت ہے۔

کیا کہنا اُن خوش نصیب انسانوں کا جنہیں معصوموں کے جنازوں میں شرکت نصیب ہوئی۔ اس لئے کہ اُن سے زیادہ مغفور کون ہوسکتا ہے۔ سرکارِ دو عالم کا جنازہ، سیدۂ طاہرہ کا جنازہ، آئمہ ہدیٰ کے جنازے، جو اُن جنازوں میں شریک ہوئے، کیا کہنا اُن خوش نصیبوں کا!

حضرات! نماز جنازہ میں رکوع نہیں اور ہمارے یہاں وضو بھی شرط نہیں۔ بے وضو ہو، شامل ہوسکتا ہے۔ لباس نجس ہو، شامل ہوسکتا ہے۔ یہ سعادت ہاتھ سے نہ چھوٹے اور شریک نہ ہونے والے کو کوئی عذر نہ رہے۔

مگر ایک عجیب بات ہے، کہیں نماز جنازہ چار تکبیر کی ہے، کہیں پانچ تکبیر کی ہے۔ یہ چار اور پانچ کا اختلاف خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی تھا۔ صحابہ کے زمانے میں بھی تھا۔ اسی لئے علامہ شبلی نے الفاروق میں لکھا ہے جناب خلیفۂ ثانی کے بارے میں کہ انہوں نے ایک نظام مقرر و متعین کرنے کیلئے چار تکبیروں کا فیصلہ فرمادیا۔ کہیں یہ نماز چار تکبیر سے، کہیں پانچ سے ہے۔ بہرحال چار تکبیر سے ہے تو نیت نماز کی ہے اور پانچ تکبیر سے ہے تو نیت نماز کی ہے۔ چار ہوں یا پانچ ہوں، جو نہیں اس نماز میں وہ سب ہی کے لئے نہیں ہے۔ کون پڑھتا ہے حمد اس نماز میں، کون کرتا ہے رکوع و سجدہ!

مگر اس سے ذرا اندازہ لگاتے ہوئے آگے بڑھئے کہ حمد نہیں ہے، پھر نماز ہے، رکوع نہیں ہے، پھر نماز ہے، سجود نہیں ہیں، پھر نماز ہے۔

خدا کے بندو! یہ بھی تو کہتے چلو کہ سب کچھ نہیں مگر نماز ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نماز کی روح موجود ہے۔ اگر حمد نماز کی روح ہوتی یہ نماز بے روح ہو جاتی۔ اسی طرح رکوع و سجود کے نہ ہونے سے یہ نماز بے روح ہو جاتی۔ میت کی نماز میں اگر جنازے پر وہ نماز پڑھیں جو خود ہی جنازہ ہو، اُس سے کیا فائدہ۔

واہ

مثال : بہت سی چیزیں ہم مثالوں سے بڑی آسانی سے سمجھ جاتے ہیں۔ مرکبات میں اجزاء تو ہوتے ہیں مگر کوئی جزو اتنا محکم ہوتا ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو وہ چیز بن نہیں سکتی۔ کچھ چیزیں اجزاء تو ہیں مگر وہ اتنے اہم کے مقابلے میں اس حیثیت میں ہیں کہ وہ اگر نہ ملیں تو ان کا بدل کسی شے سے ہو سکتا ہے۔

خمیرہ گاؤزبان میں کتنی چیزیں ہوں گی۔ ایک اکیلی گاؤزبان ہی تو نہیں ہوتی، اور بھی چیزیں ہیں۔ ابریشم بھی ہو سکتا ہے، صندل بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تمام مرکبات ہیں اطباء کے۔ ایک شخص خمیرۂ گاؤزبان بنانا چاہتا ہے، حکیم صاحب سے کہتا ہے کہ سارے اجزاء مل گئے مگر برادۂ صندل سفید نہیں ملتا۔ فوراً کہہ دیا جائیگا کہ برادۂ صندل سفید نہیں ہے، چلو صندل سرخ سہی۔ وضو کا بدل تیمم تو ہے۔ اگر کسی وقت وہ شخص حکیم صاحب سے یہ آکر کہے کہ خمیرۂ گاؤزبان بنانا چاہتا ہوں، گاؤزبان نہیں ہے۔ وہ تو جان ہے اُس کی۔ جب تک جان، تب تک وہ چیز ہے اور جب جان نہیں، سب کچھ ہو، وہ چیز بے جان ہے۔

اسی طرح الحمد، رکوع و سجود کے بغیر وہ نماز ہے اور اس "ہے" کے بغیر وہ چیز بن نہیں سکتی۔ کچھ چیزیں اجزاء تو ہیں مگر وہ اتنے اہم کے مقابلے میں اس حیثیت میں ہیں کہ اگر وہ نہ ملیں تو ان کا بدل کسی شے سے ہو سکتا ہے۔ رکوع و سجدہ کے بناء وہ نماز ہے اور اس "ہے" کے معنی یہ ہیں کہ روح موجود ہے۔ نماز کی جان موجود ہے اور یقیناً اسی بناء پر سنی طریقہ سے نماز ہو یا شیعہ طریقے

سے نماز ہو، یہ نماز ہونے کی چیزیں ہر نماز میں نہیں ہیں۔ مگر خدا جانے کہ محمدؐ و آلِ محمدؐ پر درود اور ان معصوم ہستیوں پر صلوٰۃ، خدا جانے خدا کی نظر میں کتنی اہم ہے کہ اگر یہ صلوٰۃ نہیں تو پھر وہ بھی صلوٰۃ نہیں۔ درود کی عربی بھی "صلوٰۃ" ہے اور نماز کی عربی بھی سوائے "صلوٰۃ" کے کیا ہے؟

یہ اتحادِ لفظ خود اپنی جگہ بتا رہا ہے کہ صلوٰۃ روحِ صلوٰۃ ہے۔ اس لئے میں نے کہا کہ خداوند عالم کو اپنا بھی وہ ذکر پسند نہیں جس میں اُن حضرات کا ذکر نہ ہو۔ اگر ان کا ذکر نہیں تو وہ ذکر لائقِ ذکر نہیں۔ اور یہاں سے اندازہ کیجئے کہ اب خیر الذکر بہترین کار ثواب بغرضِ ایصالِ ثواب حقیقتاً وہ ذکر ہے محمدؐ و آلِ محمدؐ۔ اور یہ نام جو آ گیا ہے ذکرِ آلِ محمدؐ کا، حقیقتاً یہ ہلکا سا پردہ ہے، ان کا ذکر ان کا کب ہے، وہ تو خدا کا ذکر ہے۔ ان کا ذکر جو حقیقتاً خدا کا ذکر ہے، وہ قانون کے اندر خدا کا ذکر ہے۔ ان کی وساطت کے بغیر اگر کوئی خدا کا ذکر کرے تو کیا ثابت ہو سکتا ہے کہ رسولؐ کا ماننے والا بھی یہ ہے یا نہیں۔ مگر ان کے ذکر کی صورت میں جو ذکر کیا جائیگا وہ ذکر اور مستحکم ہوگا کہ فوراً ثابت ہو جائے گا کہ خدا کا ماننے والا ہے تو رسولؐ کا بھی، تو مومن ہے۔ ان حضرات کا ذکر، ذکر اللہ ہے اور حقیقتاً امر یہ ہے کہ ایک ذکر ہی پر کیا منحصر ہے کہ ان کا ذکر خدا کا ذکر ہے۔ ان سے محبت خدا سے محبت ہے، ان سے نفرت معاذ اللہ خدا سے نفرت ہے، ان سے تقرب خدا سے تقرب ہے، ان سے دوری خدا سے دوری ہے، ان کا ماننا خدا کا ماننا ہے، ان کا نہ ماننا خدا کا نہ ماننا ہے۔ جو برتاؤ کرنے والا ان کے ساتھ کریگا، وہ برتاؤ ان کے ساتھ نہیں ہوگا، وہ خدا کے ساتھ ہوگا۔ اب انصاف کیجئے کہ ان کا ماننا کیوں نہ ہو خدا کا ماننا، ہم نے انہیں ان کی وجہ سے نہیں مانا، خدا نے منوایا تو مانا اور جنہیں ہم نہیں مانتے اپنی کسی دشمنی کی بناء پر نہیں ہے نہ ماننا، اس بناء پر ہے کہ خدا نے منوایا نہیں۔ حجاج سے پوچھئے وہ حجرِ اسود کا استلام کرتے ہیں یا نہیں؟ بوسہ دیتے ہیں، دینا چاہتے ہیں، کیوں معیوب نہیں؟ اس لئے کہ ہم پتھر کی تعظیم نہیں کر رہے ہیں، یہ تعظیم اس لئے ہے کہ یہ تعظیم تعمیلِ حکمِ خدا ہے۔ خداوند عالم اگر ایک ناقہ کی تعظیم کا حکم دیدے، کہہ دے ناقۃ اللہ۔ اب اللہ سے منسوب ہو گیا، یہ اس کی تعظیم نہیں ہے، یہ خدا کی تعظیم ہے۔ آدم کو سجدہ کروایا، سجدۂ غیر خدا واقعاً

کب جائز ہے؟ مگر بدنصیب ابلیس نے محض سجدے کو دیکھا یعنی اپنی توحید کے مسئلے میں اتنا تشدد پسند، میں ایسا مومن ہوں، سجدۂ غیر سے اتنا بچنے والا ہوں کہ خداوند تو بھی کہے گا تو نہیں کروں گا۔ یہ غلط بات ہے۔ بے شک اگر خدا نہ کہے تو بھی نہ کرے اور اگر وہ کہے تو کیوں نہ کرے۔ سجدۂ غیرِ خدا جائز نہیں بلکہ واجب ہے جبکہ حکمِ خدا ہو۔ ''حکمِ مولا از ہمہ اولیٰ''۔

بجا آوریٔ حکمِ خدا از حد ضروری ہے ورنہ یہ مصداق ہوگا۔ بارالہا تجھے تو مانتا ہوں مگر تیری بات نہیں مانتا۔ آپ کو تو مانتا ہوں مگر یا رسولؐ اللہ میں آپ کی بات نہیں مانتا۔ تو کسی کا ماننا اُس کی بات ماننا ہے، بات کا نہ ماننا اُس کا نہ ماننا ہے۔

مسجد کی تعظیم اور تکریم ہم پر واجب ہے، حالانکہ ہم اتنے بے شعور تو نہیں جو اس کی حقیقت کو نہ سمجھتے ہوں، اس در و دیوار میں نہ سماعت ہے، نہ بصارت ہے، نہ شعور ہے، یہ سب جمادات ہیں۔ مگر ہماری یہ تکریم اُن اجزاء کی بناء پر نہیں ہے جن سے یہ بنی ہے۔ اُس خطۂ ارض کی بناء پر نہیں ہے جس پر یہ تعمیر ہوئی ہے، یہ خانۂ خدا ہے۔ یہ تعظیم خدا کی ہو رہی ہے۔ ان حضرات کا ذکر اسی لئے ذکرِ خدا ہے۔ خدا خود بھی چاہتا ہے کہ میں ان کا ذکر کروں اور محض چاہتا ہی نہیں ہے، کرتا ہے اور ایک ہی کتاب میں نہیں۔

" ذٰلِکَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرَاتِ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ "

''ہم ان کا ذکر توریت میں کر چکے ہیں، ہم ان کا ذکر انجیل میں کر چکے ہیں''۔

ہمارا اُن سے وعدہ اور اُن کا ہم سے وعدہ، یہ وہ وعدہ ہے جو توراۃ میں، انجیل میں آچکا اور آج تو آخری بار قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن جامی شواہد نبوہ میں جو واقعہ تحریر کرتے ہیں زمانہ خلافت علی مرتضیٰ کا، میں اُس واقعہ کو بیان کروں گا تو طول ہو جائیگا۔ اُس واقعہ نے صاف یہ بتایا ہے کہ قرآن سے پہلے خدا کی کوئی کتاب ایسی آئی ہی نہیں جس میں حضرات محمدؐ و آلِ محمدؐ کا ذکر نہ ہو۔ کبھی کوئی آیت خدا ایسی آئی ہی نہیں جو ان کے ذکر سے خالی ہو۔ گویا کتاب خدا کیلئے یہ امر لازم ہے کہ ان کا ذکر ہو۔

اگر ان کا ذکر ہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کتابِ خدا کہی جائے ورنہ کتاب ہی کتاب ہے، کتابِ خدا نہیں ہے۔ اور میں لفظِ کتابِ خدا میں اتنی وسعت دیکھتا ہوں، ان کے ذکر کے لازم ہونے کے لئے کہ خداوند عالم نے نماز کو بھی ایک جگہ قرآنِ مجید میں کتاب کہا ہے۔ نماز کو خداوند عالم نے کتابِ موقوت کہا ہے، وہ کتاب جس کے اوقات کا تعین کر دیا گیا۔ تو نماز بھی ایک کتاب ہے۔ بہرحال کتابِ خدا کیلئے ضروری ہے کہ ان حضراتؑ کا ذکر ہو، یہ کتاب (نماز) اگر ان کے ذکر کے بغیر ہو گی تو کتابِ خدا نہ ہو گی۔

اُس واقعہ کے آخر میں مولانا عبدالرحمٰن جامی نے شواہد النبوۃ میں فرمایا ہے کہ علی مرتضیٰ سجدۂ خدا میں ہیں اور اُس سجدہ میں بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ:

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَجْعَلْنِیْ مَنْسِیًّا وَّجَعَلَنِیْ فِیْ کُتُبِهٖ مَذْکُوْرًا"

"خداوندا! شکر ہے تیرا کہ تو نے مجھے کبھی کسی زمانے میں بھی فراموش نہیں کیا۔ تو اپنی ہر کتاب میں مجھے یاد کرتا رہا"۔

یاد کئے جانے کے لائق تھے، یاد کئے جاتے رہے اور جب ان بندوں کی طرف سے خدا کی یاد اتنی وسیع اور غیر محدود ہو کہ یہ کھڑے ہوتے ہیں تب خدا کو یاد کرتے ہیں، بیٹھے ہوئے ہیں تب خدا کو یاد کرتے ہیں، کروٹیں بدلتے ہیں تو خدا کو یاد کرتے ہیں۔

سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہے:

"یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ"

"قائم ہیں تب یادِ خدا میں، قاعد ہیں تب یادِ خدا میں ہیں، بستر پر کروٹیں بدلتے ہیں، ذکرِ خدا سے خالی نہیں"۔

بندے ہو کر جب ان کی زندگی کا کوئی لمحہ ذکرِ خدا سے خالی نہ ہو تو خداوند عالم یہ اہتمام نہ کرے؟ ہمیشہ میرے یاد کرنے والے ہیں تو میں بھی انہیں یاد کرتا رہوں۔ آئتیں بھی تو یہی کہہ رہی ہیں قرآنِ مجید کی، جو ہمیں بھولے گا، ہم اُسے بھولیں گے، جو ہمیں یاد کریگا، ہم اُسے یاد کریں

گے اور یہیں سے یہ لفظ کہنا چاہتا ہوں کہ خدا کی راہ میں دینے والے، جان دینے والے، مال دینے والے، اپنے آرام کو قربان کرنیوالے ان گنت ہیں۔ پچھلی امتوں میں بھی ہیں، پچھلے زمانوں میں بھی ہیں اور اس امت میں بھی بہت سے ہیں جنھوں نے خدا کی راہ میں جانیں دی ہیں، جنھوں نے خدا کی راہ میں مال دیئے ہیں مگر میں دعوے سے یہ لفظ کہنا چاہتا ہوں کہ بہت سے ہیں خدا کی راہ میں دینے والے مگر انداز سب کا ہمیشہ یہی رہا کہ کچھ خدا کی راہ میں دیا، کچھ اپنے لئے رکھا۔ خداوند عالم بھی یہ نہیں چاہتا کہ سب اپنا میری راہ میں دیدو:

"وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ"

"جو ہم نے دیا ہے اُس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دیتے ہیں ایمان والے"۔

خداوند عالم کُل نہیں مانگتا، کسی سے جزو مانگتا ہے اور وہ بھی ہمیں گراں گزرتا ہے، مگر دینے والے بہر حال اس دنیا میں ہیں اور اس دنیا میں تھے۔ جانیں بھی دی ہیں، مال بھی دیا ہے۔ مگر یہ چیز حقیقت ہے کہ کچھ دیا۔ یہ کون سا گھر ہے اس دنیا میں جس نے اپنے لئے کچھ نہ رکھا، جس نے خدا کی راہ میں سب کچھ دیدیا۔ مردوں نے بھی، خواتین نے بھی، بڑوں نے بھی، بچوں نے بھی۔ چھ مہینے کا بچہ بھی ہے اُن میں، رسولؐ کی نواسیاں بھی ہیں اُن میں، سب خدا کی راہ میں پیش کردیا۔ میری نظر میں تو یہ سماں پھر جاتا ہے کہ مظلومِ کربلا نے اپنی مقدس جنس، جس بھی قسم کی وہ جنس تھی، پوری جنس لاکر کربلا میں ایک بازار لگا دیا۔ خدا خریدار ہے اور امامؑ اپنے گھر کی ہر جنس لے کر آ گئے۔ یہی راز تھا کہ مکہ سے چلتے وقت ہر شخص کہہ رہا تھا کہ آقا نبیؐ زادیوں کو نہ لے جایئے۔ آقا رسولؐ زادیوں کو لے کے نہ جایئے۔ دل دھڑکتے تھے لوگوں کے، خدا جانے مآلِ سفر کیا ہو؟ انجامِ سفر کیا ہو؟ زیادہ تو واضح نہیں کرسکتے تھے، بُری خبر کا زبان پر لانا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو اہلِ دل تھے، اُن کا نظریہ یہ تھا کہ اگرچہ نبیؐ زادیوں کا قتل ہو جانا سہل بات تو نہیں ہے لیکن اگر یہ ہوتا ہے تو یہیں تک ختم ہو جائے۔ نبیؐ زادیوں کی اسیری، اُن کی بے ردائی، نبیؐ زادیوں کی دربدری کی نوبت تو نہ آئے۔

آقا نہیں ساتھ نہ لے جایئے۔ اب کہنے والوں کو کیا خبر کہ رازِ منصبِ امامت کیا ہے! امام یہ نہیں چاہتے کہ کچھ پیش کریں، کچھ بچالیں۔ خدا جانے اسلام پر کیسی مشکل آن پڑی ہے کہ سب خدا کی راہ میں۔ اور جو عزمِ حسینؑ ہے، وہی عزمِ زینبؑ ہے۔ ہر ایک کو جواب دیتے ہیں امام علیہ السلام اُس کے ظرف کے مطابق۔ کسی سے فرمادیتے ہیں کہ یہ میری بہنیں جو ہیں یہ میرے پاس میرے جدِّ نامدار کی امانتیں ہیں۔ میں اپنے نانا کی امانتیں کسے سونپ کر جاؤں۔ میں امین ہوں، ان کو ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔ کوئی طاقت نہیں ہے جو میری بہنوں کو مجھ سے اور مجھے ان سے چھڑادے۔ درمیان میں میرے اگر کوئی چیز جدائی ڈال سکتی ہے تو وہ میری شہادت ہے۔ میرے شہید ہونے کے بعد وہ مجھ سے جدا ہوں، میں بری الذمہ ہوں۔ کسی سے یہ بھی فرمادیا ہے کہ اگر نہ لے کے جاؤں گا تو قید کون ہوگا؟ اسیرِ ظلم وستم کون ہوگا؟ یقیناً یہ سب امامؑ کے دل میں ہے کہ شہیدوں کی شہادت کا فلسفہ سنائے گا کون؟ کربلا کے مظالم کی داستان کون بتائے گا؟ اور واقعاً اگر یہ چند قیدی نہ ہوتے تو بیان کرنے والے پھر یہ ظالم ہی تو ہوتے، مظلوم تو ختم ہوگئے۔ ظالموں ہی کو رہنا تھا، خدا جانے کس کس رنگ میں بیان کرتے اور کس کس باطل کا لوگوں کو یقین دلانا چاہتے! ان نگاہوں کو امامؑ نے ناظرِ احوال بنادیا۔ اللہ، اللہ۔ کوفہ کا بازار، درد دل سے اور دل سوختہ سے یہ لفظ نکلتا ہے کہ کوفے کا بازار ہے اور نبی زادیوں کا جلوس نکالا جارہا ہے، خدا جانے یہ توہین کس کی ہے؟ یہ دین کی توہین ہے یا نہیں؟ پیغمبرؐ کی توہین ہے یا نہیں؟ بے مقنع و بے ردا بحال تباہ راہی کوفہ ہے زینبؑ، اس کوفہ میں پہلے بھی آئی ہیں اور آئی ہی نہیں، رہی ہیں۔ یہ کوفہ کی شہزادی ہیں۔ شہزادی تو یہ عالم کی ہیں مگر کوفہ میں شہزادی کی حیثیت سے رہی ہیں۔

حضرات! یہ وہی زینبؑ ہیں جب کوفہ میں رہتی تھیں تو زنانِ کوفہ کو آرزو رہتی تھی شرفیابِ زیارتِ زینبؑ ہوں۔ مولائے کائنات امیرالمومنینؑ سے عرض کروایا جاتا تھا، مردوں کے ذریعے سے اجازت دیجئے، ہم قدم بوس ہوں۔ مستورات کی تمنا ہے، کہلاتی ہیں کہ ہم قدم بوس ہوسکیں۔ اور اجازت کے بغیر واقعاً کون آسکتا تھا۔ کبھی مسائل دریافت کرنے آتی ہیں، زینبِ کبریٰؑ سے،

کوفہ اور بی بی زینبؑ

کبھی درسِ تفسیر قرآن میں حاضری کا شرف ملتا ہے تو تمنا پوری ہوتی ہے۔ درد دل سے کہوں گا کہ اے زنانِ کوفہ! اب زینبؑ کی زیارت اتنی آسان ہے کہ نہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہے اور نہ خود تمہیں کہیں جانے کی ضرورت ہے۔ زینبؑ خود تمہارے گھروں کے سامنے سے نکل رہی ہیں۔ بیٹھے بیٹھے اپنے کوٹھوں پر زینبؑ کو دیکھ سکتی ہو اور اگر کوئی نہ پہچانے تو پہچان کروانے والا کوئی ظالم آواز بھی دے رہا ہے:

''اے کوفہ و شام کے رہنے والو! یہ خاندانِ رسالتؐ کے افراد ہیں''۔ اور اشارہ کر کے کہا جاتا ہے ''ھٰذا زینبؑ''۔ یہ زینبؑ ہیں۔ ''ھٰذا اُمُّ کلثومؑ''۔

الا لعنة اللّٰه علی القوم الظالمین

چودھویں

مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْاللّٰہَ وَکُوْنُوْامَعَ الصّٰدِقِیْنَ"

خداوند عالم کی یہ اعجاز بیانی ہے اور قرآن مجید کی یہ انتہائی بلاغت ہے کہ وہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معنی کہہ دیتا ہے۔ الفاظ کم سے کم اور مفہوم اتنا وسیع کہ جس کی وسعت تک تصورات پہنچ ہی نہیں سکتے۔ کلام کا عیب یہ ہے کہ بات لمبی چوڑی ہو اور اُس کا مفہوم کم سے کم ہو اور کلام کی خوبی یہ ہے کہ بات کم سے کم الفاظ پر مشتمل ہو اور وہ معنویت کا ذخیرہ ہو۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی بلاغت اور کلامِ خدا کی فصاحت جو اس درجہ تک ہو کہ وہ معجزۂ باقیہ ہو اور تمام عالم کے سامنے اس کو بے مثل ہونے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہو، اس کی تو خصوصیتِ خاص ہونا چاہیے، یہ کہ الفاظ کم سے کم ہوں اور معنویت کے ذخیرے زیادہ سے زیادہ ہوں۔ اس آیت میں بھی یہی شان دیکھ رہا ہوں کہ خداوند عالم نے دو جملوں میں تمام ابوابِ ہدایت کو رکھ دیا۔

"ایمان رکھنے والو! خدا سے ڈرو اور صادقین کی پیروی کرو"۔

جتنا بھی آپ سوچنا چاہیں، سوچیں اور سوچ کر اس پر نظر رکھیں کہ کون سی اب ہدایت باقی رہی جو اس میں نہ ہو۔ خدا سے ڈرو اور صادقین کی پیروی کرو۔ جو ماننے کی باتیں ہیں، اُن میں صادقین کی پیروی کرو، جو کرنے کے کام ہیں، اُن میں صادقین کی پیروی کرو۔ اسی طرح جو نہ کرنے کے کام ہیں، اُن میں صادقین کی پیروی کرو۔ غرضیکہ تفکر میں، تدبر میں، ایمان میں، عمل میں، ہر شے میں صادقین کی پیروی کرو تو تم اللہ کے فرمانبردار۔ اتقو اللّٰہ کہہ کر، کونو مع الصادقین تو بعد کا جملہ ہے، پہلے اتقوا اللہ ہے، ایمان رکھنے والو! خدا سے ڈرو۔

میں نے اکثر و بیشتر اپنے سامعین سے کہا ہے کہ بہت سے الفاظ کی طرح ہماری زبانوں پر بھی بہت سے جملے اس طرح استعمال ہوتے ہیں کہ ان میں کوئی نہ کوئی لفظ محذوف

ضرور ہوتا ہے مگر قرائن کی موجودگی کی بناء پر محذوف لفظ کو آشکارا کرنے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی اور سمجھنے والے اُس کا پورا مفہوم سمجھ جاتے ہیں۔ اگر کسی شخص سے ہم کہہ رہے ہیں کہ فلاں کھیل ہو رہا ہے، ہم بھی چلتے ہیں، تم بھی چلو۔ اور وہ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ چلوں تو مگر مجھے اپنے بڑوں سے، اپنے باپ سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ ہر شخص سمجھ جائیگا لیکن کیا یہ جملہ مکمل ہے کہ مجھے اپنے بڑوں سے، اپنے باپ سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ اس میں کوئی لفظ محذوف نہیں ہے۔ یعنی خیال بھی نہیں آسکتا یہاں کسی کو کہ کوئی لفظ محذوف ہو۔ جہاں کہنے والے نے کہا، اُس کا مفہوم سننے والے کو مکمل طور پر سمجھ میں آگیا۔ اب اُسے کیا تلاش ہے اس کی کہ ان لفظوں میں کوئی لفظ محذوف بھی تھا۔

مگر میں یہاں یہ بحث قائم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر یہ اپنے باپ سے واقعی ڈرتا ہے تو پھر اس کو باپ کے پاس بھی نہیں جانا چاہئے۔ جس سے کوئی ڈرتا ہے، پھر اُس کا قرب پسند نہیں کرتا۔ جس سے کوئی ڈرا کرتا ہے، اُس کا ذکر اور فکر بار بار نہیں کیا کرتا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ یہاں یہ لفظ محذوف ہے اور اُس کا مفہوم یہ ہے کہ میں اپنے باپ کی ناراضگی سے ڈرتا ہوں۔ باپ کی ذات سے ڈرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں اُس کی صورت سے ڈرتا ہوں، اُس کی آواز سے ڈرتا ہوں، اُس کی خوشبو سے ڈرتا ہوں، یہ مطلب نہیں ہوتا بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں اپنے باپ کی ناراضگی سے ڈرتا ہوں، غصے سے ڈرتا ہوں، اُس کی برہمی سے ڈرتا ہوں۔

تو حضرات والا خدا نے جو بار بار دہرایا ہے کہ خدا سے ڈرو، یہاں بھی یہ لفظ محذوف ہے۔ خدا کی ذات ایسی نہیں ہے کہ اُس سے ڈرا جائے اور اگر ذات واقعی اُس کی ایسی ہو کہ اُس سے ڈرا جائے تو پھر اُس کا نام بھی نہیں لینا چاہئے، پھر اُس کے گھر کی طرف قدم بھی نہیں اٹھانا چاہئے۔ اس کا تصور بھی کیوں قائم کیا جائے۔ تو ذات خداوندی سے ڈرانا کبھی مقصود نہیں ہو سکتا۔ ہمارا تو مقصد ہر عمل خیر میں قربۃً الی اللہ۔ ہم یہ نیک کام اس لئے کر رہے ہیں کہ خدا کی بارگاہ میں

ہمارا تقرب ہو جائے۔ ہم تو اُس کی قربت چاہتے ہیں۔ اُس سے دور نہیں رہنا چاہتے۔ تو جب قربت چاہتے ہیں تو فوراً ثابت ہو گیا کہ اُس کی ذات سے ہم ڈرتے تو نہیں۔ ہم تو اس کی قربت چاہتے ہیں۔ جہاں بھی یہ لفظ آئے گا کہ خدا سے ڈرو، ہمیشہ مفہوم یہ ہوگا کہ خدا کی ناراضگی سے ڈرو، خدا کے غضب سے ڈرو، خدا کی نافرمانی سے ڈرو۔ خدا نے اپنی ذات سے نہیں ڈرایا، اپنے ذکر سے، اپنے نام سے، اپنے گھر سے نہیں ڈرایا بلکہ جب بھی کہا کہ خدا سے ڈرو، اس کا منشاء یہ ہے کہ غضب خدا سے ڈرو، خدا کے قہر سے ڈرو، خدا کی نافرمانی سے ڈرو۔

اب اگر آیت کے یہ معنی نظر میں رکھ لیں کہ خداوند عالم یہ فرما رہا ہے کہ:

خدا کے بندو! ایمان رکھنے والو! خدا کے غضب سے ڈرو اور صادقین کی پیروی کرو"۔

تو پہلا جملہ آتے ہی یہ طے کر رہا ہے کہ صادقین کون ہیں۔ خدا کے غضب سے ڈرو اور صادقین کی پیروی کرو۔ تو صادقین وہ ہوئے جن پر خدا کا غضب نہیں ہے۔ خدا کی ناراضگی سے ڈرو اور صادقین کی پیروی کرو۔ تو صادقین وہ ہوئے جن سے خدا نہ ناراض ہوا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ خدا کی نافرمانی سے ڈرو اور صادقین کی پیروی کرو، تو صادقین وہ ہوئے کہ جو کبھی خدا کی نافرمانی کرنے والے نہیں۔

خدا کا غضب ہو کسی پر مگر صادقین پر نہیں۔ اُن کے تو ساتھ رکھا جا رہا ہے بلکہ یہ لفظ اگر کہہ دوں تو بالکل بجا ہوگا اور عین حقیقت ہوگا کہ خداوند عالم نے اپنے غضب سے بچتے رہنے کا حکم دے کر وہ ذریعہ بتا دیا کہ جو غضب خدا سے بچائے کہ اگر تم خدا کے غضب سے بچنا چاہتے ہو تو اس مراد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہی یہ ہے کہ صادقین کی پیروی کرو۔ اگر اس ذریعے کو اختیار کر لو گے تو غضب خدا سے محفوظ رہو گے۔ اگر یہ ذریعہ چھوڑ دیا تو خدا کے غضب سے بچ نہیں سکتے اور لفظ غضب وہی تو لفظ ہے، غضب ہوگا اگر میں نہ کہوں گا، یہ وہی لفظ غضب ہے جو سورۂ الحمد میں ملتا ہے۔ خداوند عالم نے دو گروہ کر دیئے ہیں۔ انعمت علیہم اور ہیں، مغضوب علیہم اور ہیں۔ دعا کرو بندو میری بارگاہ میں کھڑے ہو کر کہ خداوند عالم ہمیں اُن کی راہ پر چلا جنہیں تو نے انعام کیا ہے اور اُن

کی راہ سے بچا جن پر تیرا غضب ہوا، جو گمراہ ہیں۔

اور حضرات بڑی نکتہ رسی کی بات ہے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ نے بالائی نظر سے دیکھا تو میری بات کو آپ سمجھ نہیں سکیں گے۔

ایک بات کہنا چاہتا ہوں یہاں کہ پروردگارِ عالم نے انعام کا ذکر کیا ہے جن ہستیوں کیلئے، یہاں مجھے اس سے بحث نہیں کہ وہ کون ہیں؟ یہ میں نہیں بیان کر رہا ہوں اس وقت، مگر جن ہستیوں کیلئے انعام کا ذکر کیا ہے، نعمتوں کے نازل کرنے کا جن کیلئے ذکر کیا ہے، اُن کیلئے فرمایا اَنْعَمْتَ، اُن کی راہ پر چلا جن پر تو انعام کر چکا۔ یہ فعل ہے ماضی۔ جن پر تیرا انعام ہو چکا، اُن کی راہ پر چلا۔ لیکن آگے بڑھ کر روش کو بدل دیا جاتا ہے۔ اب آگے چل کر یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ اُن کی راہ سے بچا جن پر تو غضب نازل کر چکا ہے، وہاں فعل نہیں ہے تو پھر ماضی کہاں سے ہوتا، اُسے اسم رکھا۔ اسی طرح سے آگے چل کر یہ بھی نہیں کہا کہ اُن کے راستے سے بچا جو گمراہ ہو چکے، انعام کیلئے صیغہ ماضی ہے، مگر غضب کیلئے اور گمراہوں کی گمراہی کیلئے فعل نہیں ہے، اسم ہے۔

اسم وہ ہوتا ہے جو قیدِ زمان سے بری ہوتا ہے۔ جس میں کسی زمانے کی قید نہیں ہوتی۔ فعل میں زمانے کی قید ہوتی ہے اور جب وہ ماضی ہو جائے تو صرف گذشتہ ہی زمانہ رہا، پھر حال اور مستقبل بھی نہ رہا۔

تو انعام کے بارے میں خداوندِ عالم فعل ماضی کا استعمال کر کے بتا رہا ہے کہ انعام جن پر ہونا تھا، ہو چکا۔ اب لاکھ کوئی دامن پھیلائے، کوئی مستحق انعام نہیں ہے۔ اب اگر کوئی مستحق انعام ہونا چاہتا ہے تو یوں وہ ہمارے سامنے دامن نہ پھیلائے بلکہ جن پر انعام ہو چکا ہے، اُن کا دامن تھامے۔ ہمیں تو جن پر انعام کرنا تھا، کر چکے۔ اَنْعَمْتَ۔ تو نے جن پر انعام کیا ہے، اُن کی راہ پر چلا۔ ظاہر ہے کہ جب اُن کی راہ پر چلیں گے تو اُن کے وسیلے سے ہم بھی موردِ انعام ہو جائیں گے۔ اب ہمارے لئے انعام جو ہو سکتا ہے من جانب اللہ وہ اُن کے وسیلے سے۔ اُن پر انعام ہوا ہے بلا وسیلہ۔ خدا منعم ہے اُن کا اور وہ منعم علیہم ہیں۔ جن پر انعام ہو چکا اُن کی راہ پر چلا۔ اب

آگے چل کر یہ کیوں نہیں کہا کہ جن پر غضب ہو چکا، اُن کے راستے سے بچا۔ تائید لفظی تو اس صورت میں تھی کہ اگر انعمت ماضی ہے تو ضال کیلئے بھی صیغہ ماضی کا آجائے، غضب کیلئے بھی صیغہ ماضی کا آجائے۔ یہاں ماضی کا صیغہ نہیں رکھا۔

خداوند عالم یہ بتانا چاہتا ہے کہ سننے والو! یہ سمجھ لو کہ ضروری نہیں ہے کہ جن پر غضب نازل ہو چکا، مغضوب علیہم وہی نہیں ہیں، غضب نازل ہو بھی چکا ہے اور ہوگا بھی، گمراہ ہو بھی چکے ہیں اور آئندہ بھی گمراہ ہوں گے تو تم پچھلے ہی مغضوب علیہم سے بچنے کی کوشش پر اکتفامت کرنا، مغضوب علیہم اس کے بعد بھی ہیں، گمراہ ان پچھلوں کے بعد بھی ہیں۔

اور اس سے آگے اگر میں بڑھوں تو پھر کیا کہوں، کن لفظوں میں کہوں اور کس طرح آپ کے دلوں کی گہرائی میں اتاروں! انعمت میں تو قدرت نے انعام کو اپنا فعل قرار دیا (جن پر خداوندا تو نے انعام کیا) مگر مغضوب علیہم میں فاعل کو چھپا دیا، کس کا غضب؟ کوئی تصریح نہیں ہے، کون؟ کس نے غضب نازل کیا؟ کون غضب نازل کریگا؟ قدرت اشارہ کرنا چاہتی ہے کہ مغضوب قرار دینا صرف میرا ہی کام نہیں ہے بلکہ میرے اپنے اتنے مخصوص بندے ہیں کہ اُن کا غضب بھی جس پر ہو، وہ میرا ہی غضب ہے۔

"مَنْ اَغْضَبَهَا فَقَدْ اَغْضَبَنِیْ"

''فاطمہؑ میرے بدن کا، میرے وجود کا ایک حصہ ہے، جس نے اُسے غضبناک کیا، اُس نے مجھے غضبناک کیا، جس نے مجھے غضبناک کیا، اُس نے خدا کو غضبناک کیا''۔

تو مغضوب وہ بھی ہے جس پر خدا کا غضب ہو اور مغضوب علیہ وہ بھی ہے جس پر پیغمبر کا غضب ہو، مغضوب علیہ وہ بھی ہے جس پر بضعۃ الرسول غضبناک ہو، سب مغضوب علیہم ہیں۔ جس نے خدا کا راستہ چھوڑ دیا، وہ بھی گمراہ، جس نے نبی کا راستہ چھوڑ دیا، وہ بھی گمراہ۔ راستہ تو اصل میں ایک ہے۔ ہر ایک کے راستے کا چھوڑ دینے والا گمراہ، اس لئے مغضوب میں فاعل کو معین نہیں کیا گیا، یہ بتانے کیلئے کہ غضب میں میرے سوا بھی کوئی اور ہستیاں ہیں کہ جن کے غضب سے

کوئی مغضوب علیہ قرار پاتا ہے۔

حضرات! کہنا یہ ہے کہ اِتقوا اللہ، خدا کے غضب سے ڈرو اور صادقین کی پیروی کرو، پہلے ہی لفظ نے صادقین کے مفہوم کو سمجھانے کا میدان ہموار کر دیا کہ صادقین وہی ہو سکتے ہیں جو خود خدا کے غضب سے بچے ہوئے ہوں اور ایسے بچے ہوئے ہوں کہ جو اُن کی پیروی کرے، وہ خدا کے غضب سے بچ جائے۔ خدا کی نافرمانی سے ڈرو اور صادقین کی پیروی کرو۔ فوراً طے ہو گیا کہ صادقین وہ ہیں جو خدا کی نافرمانی کرنے والے نہیں ہیں بلکہ ایسے خدا کے مطیع ہیں کہ جو اُن کا مطیع ہو جائے وہ مطیع خدا کہلائے، خدا کا فرمانبردار کہلائے۔

صادقین کون ؟

حضرات والا! واقعاً اگر دین سچا ہے تو پھر ضروری ہے کہ جو اُس کا رہبر ہو، وہ بھی سچا ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دین سچا اور اُس کے رہبر سچے نہ ہوں۔ مدعی اگر سچا ہے تو اُسے سچے گواہوں کی ضرورت ہے۔

میں نے اشارہ کیا ہے کہ اگر مدعی جھوٹا ہے تو سچے گواہ اُس کیلئے زہرِ قاتل ہیں۔ وہ اُس کیلئے مفید نہیں ہیں۔ جھوٹے مدعی کیلئے فائدہ بخش گواہ جھوٹے ہی ہو سکتے ہیں۔ اگر جھوٹا مدعی سچے گواہوں کو جمع کر کے لے آئے تو وہ تباہی کا سامان پیدا کر دیں۔ دعویٰ جھوٹا تو جھوٹے گواہوں کی ضرورت ہے۔ سچے دعویٰ کیلئے سچے گواہوں کی ضرورت ہے۔ دین اگر سچا ہے تو رہبر سچے! اور کہا جا سکتا ہے کہ رہبروں کی سچائی سے دین کی سچائی ثابت ہوگی۔

مگر حضرات والا! یہ دنیا عجب عالمِ انقلاب ہے۔ کہنے والے جھوٹوں کو بھی سچا کہہ دیتے ہیں۔ جہاں سچوں کو سچا کہہ دیتے ہیں، وہاں جھوٹوں کو بھی سچا کہہ دیتے ہیں اور جہاں جھوٹوں کو سچا کہہ دیتے ہیں وہاں سچوں کو بھی جھوٹا کہہ دیتے ہیں۔ اعتبار نہیں ہے کسی کی زبان کا۔ کبھی حقیقت میں کہتے ہیں، کبھی مجاز میں کہتے ہیں۔ مجاز کا بھی تو ایک شعبہ ہے۔ یعنی کسی کو بنانے کی بات تو الگ رہی، بدنیتی کی باتیں تو الگ رہیں، میں اس وقت یہ کہہ سکتا ہوں کہ نیک نیتی سے بھی تو کسی کیلئے ایسے لفظ استعمال کئے جاتے ہیں جو حقیقت نہیں ہوتے۔ محض مجاز، رات دن کہنے والے ہمیں قبلہ

قبلہ و کعبہ

کہتے ہیں، قبلہ وکعبہ۔ یہ لفظ کہنے والے ہمیں حقیقتاً قبلہ کہہ رہے ہیں۔ اگر حقیقتاً قبلہ کہہ رہے ہیں تو وہ کافر ہیں۔ جو غیرِ کعبہ کو قبلہ کہے اور قبلہ ہی نہ کہے بلکہ کعبہ بھی ساتھ میں کہہ دے تو کعبہ محترمہ کے سوا کسی اور شے کو یا کسی اور شخص کو قبلہ ماننے والا مومن رہتا ہے کیا؟ مسلمان رہتا ہے؟ لیکن ہم اپنے بزرگوں کو بھی قبلہ کہہ دیتے ہیں، اپنے باپ دادا کو بھی قبلہ کہہ دیتے ہیں، اپنے عالموں کو بھی کہہ دیتے ہیں، اور یہ مثال میں نے اس لئے دی ہے کہ بد نیتی سے نہیں کہہ رہے ہیں، نیک نیتی سے کہہ رہے ہیں۔ کسی جعل سازی کیلئے نہیں کہہ رہے ہیں۔ تو ہماری بحث اسی صورت میں ہے کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم معنیِ حقیقت میں نہیں کہہ رہے بلکہ معنیِ مجاز میں۔

جب دنیا کے استعمالات کا یہ حال ہو کہ وہ مجاز میں بھی بہت کچھ کہہ بیٹھتا ہو تو ممکن ہے کہ مجازاً کسی کو صادق کہہ دے اور کہہ دے کہ میں تو معنیِ مجاز میں کہہ رہا ہوں۔ دنیا اگر صادق کہہ دے تو کہنے والے پہلے خود تو صادق ہوں۔ سند کسی کو وہی دے سکتا ہے جو خود باسند ہو۔ بے سند سے سند، وہ بے سندی کی سند ہے۔ جو صادق کسی کو کہیں، صدیق کسی کو کہیں، اصدق کسی کو کہیں، شوق سے کہیں مگر حضرات یہ سند جزو دین نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ کہنے والے کب مستند ہیں۔ پہلے وہ تو بتائیں کہ اُن کی صداقت کا ثبوت کیا ہے؟ لاکھ کہیں، دو لاکھ کہیں، کروڑ کہیں، دس کروڑ کہیں، ان گنت کہیں۔ تو کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔

مجھے بھی لاکھوں نے قبلہ کہا ہو گا مگر مجھ میں تو قبلہ کی ایک اینٹ بھی نہ آئی۔ ہاں سند دینے کا حق ہو جسے اور خود مقامِ صداقت میں کامل جو ہستی ہو، وہ کسی کو صادق کہہ دے تو یہ سند ہے۔

یہاں حضرات قرآن کہہ رہا ہے، دنیا نہیں کہہ رہی ہے، خود خدا کہہ رہا ہے۔ ایمان والو! صادقین کی پیروی کرو۔ اب اُن کی صداقت میں کیا شک ہے، خدا کے کہے ہوئے صادقین کی پیروی کرو۔ جنہیں خدا نے صادق کہا، اُن کی پیروی کرو۔

حضرات! ذوقِ نظر الگ الگ ہوا کرتا ہے۔ پسند کا ذوق بھی الگ ہوتا ہے۔ تعریفیں کرنے کا ذوق بھی الگ ہوتا ہے۔ خدا شاہد ہے کہ جب کوئی میرے کسی بیان کی تعریف کرتا ہے،

میرا دل پست ہو جاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یا اللہ! یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کیا جانتے ہیں ہم، کیا ہے ہمارے پاس! حقیقت امر یہ ہے کہ ذوقِ نظر الگ الگ ہوتا ہے، بندوں کا ذوق الگ ہے، قدرت کا معیار الگ ہے۔ آپ لاکھ قبلہ کعبہ کہیں، کچھ بھی نہیں بنتا۔ ہم اسی ناز میں رہیں گے، ضرور بخشے جائیں گے۔ ہمیں تو دنیا قبلہ کہہ رہی ہے، ہمیں تو لوگ کعبہ کہتے ہیں۔ بھلا قبلہ نہ بخشا جائے۔

مگر کبھی خیال بھی نہیں آسکتا اس کا، آپ لاکھ بڑھ چڑھ کر کہیں، کچھ بھی نہیں ہوتا اور وہ معبود یہی اگر کہہ دے کہ میرا بندہ ہے تو حضرات سرمایۂ افتخار ہے۔ لفظ کو نہ دیکھئے، کہنے والے کو دیکھئے۔ آسان ہے کہ خدا کسی کو، کسی فرد کو، کسی گروہ کو، صادق یا صادقین کہہ دے۔ کہنے والے پر نظر ڈالئے کہ کہنے والا کون ہے۔ آپ تو جتنا بھی بڑے سے بڑا کہیں، آپ کیلئے آسان ہے۔ اُس (خدا) کیلئے مشکل ہے۔ اس لئے کہ وہ ظاہر بین نہیں ہے۔ وہ غیب داں ہے۔ وہ باطن کا دیکھنے والا ہے۔ اُس کی نظر سے نہ ماضی مخفی ہے، نہ حال مخفی ہے، نہ مستقبل مخفی، نہ ظاہر مخفی، نہ باطن مخفی، وہ نیتوں کا دیکھنے والا، وہ عزائم کا پرکھنے والا، وہ ضمیروں کا جاننے والا، وہ اگر کسی کو صادق کہہ دے تو پھر کہنا پڑے گا کہ وہ اُسی کو صادق کہے گا جو ظاہر میں بھی صادق، جو باطن میں بھی صادق۔ ضمیر میں بھی صادق، نیت میں بھی صادق۔ ماضی میں بھی صادق، حال میں بھی صادق۔ مستقبل میں بھی صادق، لسانِ صدق ہوں کوئی، صداقت کی زبانیں ہوں تو خدا کہے کہ صادقین ہیں۔

یہاں بڑی پُر لطف بات کہنا چاہتا ہوں۔

حضرات! کچھ تو وہ ہیں کہ خداوند عالم نے جن کو اس آیت میں پکارا۔ یـا ایھـا الذین آمـنـو، اور کچھ وہ ہیں، آیت کے ایک پہلو پر جن کی پیروی کا ان سب کو حکم دیا۔ یہیں سے دو شعبے بنے۔ ایک شعبہ وہ سب جن کو پیروی کرنا ہے، ایک شعبہ بس صرف وہ کہ جن کی پیروی کرنا ہے۔ پہلے شعبے میں تو ان گنت ہیں۔ دائرۂ ایمان میں جو اس وقت تھے، انہیں بھی پکار لیا، جو اُن سے پیدا ہوئے، انہیں بھی پکارا۔ جو اُن میں پیدا ہونے والوں سے پیدا ہوئے، انہیں بھی پکارا۔ آج ہم ہیں، ہمیں بھی آیت پکار رہی ہے۔ صدہا برس تک عالم رہتا ہے، نسلیں آتی ہیں مومنین کی، ایمان

والوں کی، مسلمانوں کی، آیت کا خطاب ہر ایک ہی سے ہے۔ کوئی گن تو نہیں سکتا، جتنے افراد ہیں انہیں سب کو پکار کر کہا کہ تم سب صادقین کی پیروی کرو، تو الگ الگ شعبے ہو گئے۔ ایک طرف وہ جنہیں پیروی کرنا ہے، ایک طرف وہ جن کی پیروی کرنا ہے۔ یہیں سے یہ بات کھل کر آگئی کہ پیروی کرنے والے سب کے سب اور ہیں اور پیروی کیئے جانے والے ان سب سے الگ تھلگ ہیں۔ اُن کی حیثیت یہ ہے کہ اُن کی پیروی ہو، ان کی حیثیت یہ ہے کہ یہ پیروی کرتے رہیں۔ میں اس کی مثال دے کر سمجھانا چاہتا ہوں تا کہ بات پورے طور پر ذہن میں آجائے۔

بچوں سے ہم کہتے ہیں کہ تمہیں بزرگوں کا کہنا ماننا چاہئے۔ جملہ غلط تو نہیں ہے۔ نوجوانوں سے، اپنے بچوں سے، نونہالوں سے ہم کہتے ہیں کہ تمہیں بزرگوں کا کہنا ماننا چاہئے۔ اس جملے کے معنی تو جو کچھ ہیں، وہ ہیں لیکن کلام کا یہ عنوان سب سے پہلے یہ بتا رہا ہے کہ کہنے والا جن کو کہہ رہا ہے، انہیں بزرگ نہیں مانتا۔ بزرگ انہیں کہہ رہا ہے کہ جن کا کہنا انہیں ماننا ہے۔

میں پورے مجمع سے کہتا ہوں کہ آپ حضرات کا فرض ہے کہ آپ علمائے دین کا احترام کریں۔ اس جملے کے معنی تو جو کچھ ہیں، سو ہیں لیکن یہ ثابت ہو گیا کہ میں جن سے کہہ رہا ہوں، انہیں عالم نہیں کہہ رہا۔ میں علماء انہیں کہہ رہا ہوں جن کا انہیں احترام کرنا ہے۔ یہ اُس زمرے میں شامل نہیں ہیں۔

خداوند عالم کا دنیائے ایمان سے خطاب کر کے فرمانا کہ تمام ایمان رکھنے والو! تم سب کا فرض ہے کہ تم صادقین کی پیروی کرو۔ اس جملے کا عنوان ہی یہ بتا رہا ہے کہ خداوند عالم نے جن سے کہا ہے، پہلے انہیں یہ بتانا چاہا کہ تم صادقین نہیں ہو۔ صادقین وہ ہیں جن کی تمہیں پیروی کرنا ہے۔ کوئی جھول نہیں ہے میرے اس بیان میں، بالکل صریح بات ہے۔ خداوند عالم نے جن کو پیروی کرنے کیلئے کہا، ان کو صادقین نہیں مانا بلکہ یہ مانا کہ تم صادقین نہیں ہو اور جنہیں صادقین کہا، اُن پر کسی کی پیروی نہیں ہے، وہ کسی کے پیچھے چلنے والے نہیں ہیں۔ وہ تو ساری امت کے آگے آگے چلنے والے ہیں۔ صادقین الگ ہیں تم سے، تم الگ ہو اُن سے۔

اب میں ایک مومن کہلانے کی حیثیت سے خداوند عالم سے پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ بارالہا! تو نے ہماری صداقت پر ایسی کاری ضرب کیوں لگادی؟ کیا ہم میں سچائی نہیں ہے؟ اور اگر ایک مجھ میں نہیں ہے تو مجھ سے بہتر افراد موجود ہیں، ہر زمانے میں رہے ہیں، خصوصاً اُس زمانے میں حضرات! جن کے زمانے میں آیت اُتر رہی ہے۔ وہ تو بڑے مراتب کے حامل ہیں۔ تو نے تو سب ہی کی صداقت پر ضرب کاری لگادی۔ ہم تک تو آیت اُن کے وسیلہ اور واسطے سے پہنچی ہے، آیت کا حکم سننے کیلئے پہلے تو وہی تھے۔ ہمیں بھی اگر آیت نے پکارا ہے، میں منطقی لفظ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں بھی اگر آیت نے پکارا ہے تو انہی کے بھروسے پر پکارا ہے۔ یعنی پہلے مخاطب تو وہی ہیں۔ اگر کوئی بھی سننے والا نہ ہوتا تو آیت پکارتی کس کو؟ ہم ناپید تھے۔ پکارا گیا ہے ہمیں تو انہی کی بناء پر، کچھ سامنے ہیں "وَ آخَرِيْنَ مِنْهُمْ" کچھ بعد میں آئیں گے۔ پہلا خطاب اُن سے ہے اور پہلا خطاب جن سے ہوتا ہے تو پہلی ذمہ داری بھی اُن ہی پر ہوتی ہے۔ سب سے پہلے تعمیل کا موقع بھی اُن ہی کو ہے۔ فرمانبردار بنیں یا نافرمان بنیں۔ یہ پہلا موقع انہیں کیلئے ہے۔

بارالہا! ہم میں مع اُن کے کوئی بھی صادق نہیں ہے! تو نے ہر ایک کی صداقت پر ضرب کاری لگائی، حالانکہ بڑے بڑے مخلصین بھی ہیں، بڑے بڑے متقین بھی ہیں، چھوڑیے منافقین کو! میں تو مومنین کو کہہ رہا ہوں۔ صداقت پر تو اُن کی بھی ضرب کاری ہے جنہیں پیروی کرنا ہے، اُن میں کوئی صادق نہیں ہے۔

صادقین وہ ہیں جن کی پیروی کرنا ہے۔ بارالہا! یہ کیا ہو رہا ہے؟ بڑے اچھے حضرات گزرے اور "گزرے" تو اب کہہ رہے ہیں ہم، اس وقت تو تیرے سامنے تھے، یعنی قرآن کے سامنے موجود تھے۔ تو نے کسی کو بھی صادق نہ مانا، کوئی بھی سچا نہیں۔ تو جواب قدرت ہوگا کہ انکار صداقت مطلقہ نہیں ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ سننے والوں میں اور آیت کے مخاطبین میں صداقت بالکل ہی نہیں ہے۔ صداقت تم لوگوں میں بھی ہے درجہ بدرجہ۔ تم کبھی سچے ہو، کبھی جھوٹے ہو، کسی وقت سچے ہو، کسی وقت جھوٹے ہو۔ کبھی راہ صداقت پر ہو، کبھی راہِ غیر صداقت

پر۔ غیر معصوم ہو، گناہ کرتے ہو تم جس وقت، کیا اس وقت بھی تم سچے ہو؟ بتوں کی پرستش کر رہے تھے تم جس وقت، کیا اس وقت بھی تم سچے تھے۔ تمہارا حال تو بدلتا رہتا ہے، کبھی سچے ہو، کبھی نہیں ہو۔

یہ بات تو قدرت کی ہمیں ماننا پڑے گی، اس لئے کہ ہم بہر لحہ تو صادقین نہیں ہیں، کیا غیر معصوم یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میری زندگی کا کوئی لحہ بھی منافی صداقت نہیں ہے۔ صداقت کا تعلق قول ہی قول سے تو نہیں ہوتا، فعل و عمل سے بھی تو ہوتا ہے۔ صادق القول اگر کہا جا سکتا ہے تو صادق الفعل بھی تو کہا جا سکتا ہے۔ گناہ کرتے وقت کوئی گنہگار سچا نہیں ہے۔

ہمارا حال یہ ہے کہ ہم کبھی سچے، کبھی نہیں، کبھی کچھ ہیں، کبھی کچھ۔ کبھی اچھے ہیں، کبھی بُرے ہیں۔ بارالہا! یہ تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ہم ہر حالت میں صادق نہیں ہیں۔ ہر لحہ ہم صادق نہیں ہیں، جن کی پیروی کا تو نے ہمیں حکم دیا ہے، وہ کیسے ہیں؟ جواب قدرت ہوگا کہ تو خود اپنے حال سے اندازہ کر لے، تجھے پیروی کا حکم دیا ہی اس لئے ہے کہ تو کبھی سچا، کبھی جھوٹا، تو جن کی پیروی کا حکم دیں، وہ تیرے حسب حال نہیں ہو سکتے۔ وہ تجھ جیسے نہیں ہو سکتے کہ کبھی سچے، کبھی جھوٹے۔ یہ وہ ہیں کہ بہر حال صادق۔ جن کا ماضی بھی صداقت، جن کا حال بھی صداقت، جن کا مستقبل بھی صداقت۔ ظاہر ہو، باطن ہو، قول ہو، فعل ہو، تفکر ہو، تدبر ہو، نیت ہو، تصور ہو، ضمیر ہو، یہ پیکرِ صداقت ہیں۔ ان کے حالات بدلتے نہیں رہتے۔ اس لئے اے بندے! تجھ سے کہا جا رہا ہے کہ تو اپنی خامیوں کو ان کے اتباع سے دور کر۔ اپنی کمزوریوں کو ان کی قوت صداقت کے طفیل میں دور کرتا رہ۔ ان کا تقرب حاصل کر۔ ان کا تقرب میرا تقرب ہوگا۔ ان کا تقرب صداقت بخش ہوگا۔ سچائی پیدا کرنے والا ہوگا۔

صادقین وہ حضرات ہیں کہ جن کی صداقت کذب سے مخلوط نہیں ہے۔ ہمارا کذب صداقت سے مخلوط، ہماری صداقت کذب سے مخلوط۔

میں تو یہ کہوں گا کہ اگر عالم کی خاک چھان کر بھی آپ بڑے سے بڑا جھوٹا تلاش کر لیں

تو ایسا جھوٹا آپ کو کوئی نہیں مل سکتا کہ جس نے زندگی میں کبھی سچ ہی نہ بولا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ خالص جھوٹا ملنا بھی بڑا مشکل ہے، جھوٹوں کا سردار ہی کیوں نہ ہو، مگر کوئی نہ کوئی کلمۂ سچ زندگی میں کبھی نہ کبھی زبان پر آیا ہے اور کسی نہ کسی وقت زبان سے نکل ہی جاتا ہے کہ میں تم سے افضل تو نہیں ہوں، میں تم سے بہتر تو نہیں ہوں۔

پھر حضرات! خالص سچے کا ملنا بھی بڑا مشکل ہے۔ پیروی کرنے والے ان گنت کو شمار ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اُن سے کہا جارہا ہے پیروی کرنے کیلئے مگر جن کی پیروی کرنا ہے، وہ صادقین اس امت میں ہاتھ کی انگلیوں کے پوروں پر گننے کے لائق ہیں۔ پندرہواں آپ کو نہیں ملے گا۔ بس چودہ ہیں۔ ایک ہاتھ کی انگلیوں پر انہیں گن لیجئے۔ پندرہواں سچا نہیں ہے کوئی تو پھر پندرہواں پورہ بھی نہیں ہے کوئی انگلیوں میں۔ گنتی کے ہیں وہ صادق کہ جن کی صداقت کمال صداقت ہے۔

حضرات والا! جنہیں خدا صادق کہہ دے، خود تو انہوں نے نہیں کہا کہ ہم صادق ہیں۔ خود اگر انہوں نے کہا ہوتا تو وہ اپنی صداقت کے ذمہ دار خود ہوتے۔ علیؑ نے تو نہیں کہا تھا کہ میں کل فتح کئے بغیر نہیں آؤں گا۔ اگر اس بات کا نبھانا اُن کے ذمہ ہو جاتا، وہ نبھائے جو کہے۔ انہوں نے تو نہیں کہا کہ ہم صادق ہیں۔ صداقت کی حفاظت کی ضمانت ان کے ذمہ تو نہیں ہے۔ کہنے والا کوئی اور ہے جو صادقین کہہ رہا ہے۔

تو جو کہہ رہا ہے وہی ان کی صداقت کا ذمہ دار ہے اور اس حد تک ذمہ دار ہے، لاکھ باتوں کی ایک بات کہہ دوں کہ اس حد تک ذمہ دار ہے کہ اب اُس کے صادقین کہنے کے بعد یہ صادق رہتے ہیں تو وہ صادق رہتا ہے، اور اگر یہ صادقین نہیں رہتے تو انہوں نے نہیں کہا تھا کہ ہم صادقین ہیں، اگر یہ صادقین نہیں رہتے تو کہنے والا صادق نہیں ہے۔ اب ان کی صداقت خدا کی صداقت ہے۔

چنانچہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اپنی صداقت کو پرکھنے کیلئے اور ظاہر کرنے کیلئے غیب کی بھی ان حضرات نے کچھ کچھ خبریں دی ہیں۔ یہ میں جانتا ہوں اور مانتا ہوں کہ جتنا جانتے تھے، اُتنی

خالص جھوٹا ملنا بہت مشکل / خالص سچا ملنا بہت مشکل

انگلیوں کی پوروں پر گننے کے لائق

جو صادق کہے وہ ذمہ دار

فتح کیے بغیر

واہ

غیب کی خبریں

خبریں نہیں دیں۔ اس لئے کہ زمانہ ان کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر کہیں کہیں، خال خال جسے کہتے ہیں، یہ انہی حضرات میں سے کسی فرد کا ذکر ہے کہ خبر دی ہے کہ میرے بعد میری ایک زوجہ برسرِ جنگ ہوگی علیؑ سے۔ متواترات میں سے ہے یا نہیں ہے۔ غیب کی خبر ہے یا نہیں۔ مگر کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ کچھ آثار دیکھ کر، کچھ اطوار دیکھ کر، کچھ رنگ دیکھ کر اندازاً کہہ دیا تھا۔

مگر اندازہ کیجئے، اس کے بعد ایک جملہ اور ہے کہ وہ اونٹ پر اسوقت سوار ہوگی، اونٹنی پر نہیں کہا گیا، اتنا تک بتا رہا ہے بتانے والا کہ سواری اس وقت اونٹ کی ہوگی۔ حواب کا چشمہ جب آئیگا تو اُس کے اونٹ پر وہاں کے کتے بھونکنے لگیں گے۔ یہ اندازے کی بات تو نہیں ہو سکتی۔ کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ یہ اندازے سے کہہ دیا ہے۔ ایسی خبریں دی ہیں۔ پھر کیا ممکن ہے کہ ان صادقین میں سے کسی کی دی ہوئی خبر غلط ہو جائے۔ انؑ کی دی ہوئی خبر غلط ہو جائے تو خدا نے خبر دی ہے انؑ کے صادق ہونے کی۔ خبر کس کی غلط ہوگی؟ ایسی ایسی خبریں، راستہ چلتے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے، اُن کو بھی اگر گنا جائے، اور کسی کتاب میں جمع کیا جائے تو وہ بھی دفتر بے پایاں ہے۔

چنانچہ تمام علمائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ آنحضرتؐ نے اور آپؐ کے بعد علی مرتضیٰ نے علی الاعلان خبر دی ہے کہ حسینؑ کربلا کے میدان میں شہید ہوں گے اور میدانِ کربلا سے رسولؐ خدا تو نہیں گزرے کبھی، مگر علی مرتضیٰ گزرے ہیں۔ صفین کے راستے میں جب وہ میدان آیا ہے تو وہاں کی خاک اٹھا کر چومتے ہیں، چیخیں مار مار کر روتے ہیں۔ ریشِ انور پر آنسو بہتے ہیں۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ سرکارؑ! بات کیا ہے؟ رونے کا سبب کیا ہے؟ تو آپؑ ارشاد فرماتے ہیں کہ آلِ محمدؐ کا خون یہیں بہے گا۔ یہ زمین آلِ محمدؐ کے خون سے رنگین ہوگی، تر ہوگی اور سینچ جائے گی اور آلِ محمدؐ کا خون اس زمین میں جذب ہو جائیگا۔

میرے مولائے کائنات علیہ السلام فرماتے ہیں کہ گویا میں وہ پورا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ میں بتا سکتا ہوں کہ خیمے کہاں نصب ہوں گے! لڑائی کس مقام پر ہوگی! یہ بھی بتا

سکتا ہوں کہ اُن کی سواری کے اونٹ یا گھوڑے کس جگہ باندھے جائیں گے یا رکھے جائیں گے۔ مجھے ایک ایک جز ومعلوم ہے۔

اللہ، اللہ۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ مظلوم کربلا کو نام کربلا کا انتظار تھا۔ ورنہ جناب حُر سے جو یہ اصرار کرتے رہے ہیں کہ مجھے کچھ تو آگے بڑھنے دے۔ جسے شہید ہونا ہے اور شہادت جس کا مالِ کار ہے، اُسے کسی جگہ کے انتخاب کی پھر کیا ضرورت ہے۔

مگر جب مدینے میں داخل ہوئے ہیں رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو ظاہر ہے کہ وہاں کے لوگ داعی تھے آپؐ کے اور میزبان تھے آپؐ کے اور وہ صدہا تھے، ہر شخص کی تمنا ہے کہ ورودِ اجلال میرے گھر ہو۔ میرے مہمان ہوں۔

اب اندازہ کیجئے کہ اگر کسی باخلق مہمان کیلئے مجمع، ہر فرد چاہتا ہو، ہر انسان چاہتا ہو کہ یہ میرا مہمان ہو تو خلقِ عظیم کا مالک کیا کرے! کس کا دل رکھے، کس کا دل توڑے، کس کی دعوت کو قبول کرے، کس کی دعوت کو مسترد کرے۔

قدرت نے یہ مشکل بڑی احسن وجوہ سے آسان کر دی اور سرکارِ دوعالم نے ارشاد فرمایا کہ میرے ناقے کی مہار کو مت پکڑو، اسے چھوڑ دو، یہ ماموُر من اللہ ہے، جہاں خدا کو مجھے ٹھہرانا ہے، یہ وہیں پہنچ کر خود بخود بیٹھ جائے گی۔

اب واقعتاً یہ ایک ایسی میزان تھی جس میں کسی کو حرف زدن کا، دم مارنے کا موقع ہی نہ رہا۔ مہار کو چھوڑ دیا گیا اور وہ اونٹنی چلتے چلتے ابوایوب انصاری کے دروازے پر بیٹھ گئی۔ سب خاموش ہیں۔

یہاں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ جس اونٹنی پر سوار ہیں، وہ اونٹنی منشائے الٰہی کی جاننے والی ہے، وہ ماموُر من اللہ ہے۔ اُن کا مرتبہ سوچئے، جس جانور پر نبیؐ سوار ہوں، اُس کا یہ عرفان اور جس کو نبیؐ خود اپنے اوپر سوار کریں، راکبِ دوشِ رسولؐ ہے کوئی، پشتِ رسولؐ کی زینت ہے کوئی، میں نے یہ شان، یہ موقع ہجرت پر رسولِ اکرم کی سواری کی دیکھی ہے یا پھر مظلومِ کربلا کا رہوار:

چلتے چلتے جو رُکا اَسپ تو حضرتؑ نے کہا
کوئی بتلائے کہ اس دشت کو کیا کہتے ہیں
آئی ہاتف کی ندا گھوڑے سے اترو شبیرؑ
یہ ہے وہ دشت جسے کرب و بلا کہتے ہیں

وہی میدانِ کربلا ہے، وہی نقشہ ہے جو مولائے کائنات علیہ السلام نے خود اپنے لفظوں میں کھینچا تھا کہ میرا فرزند حسینؑ اس سرزمین پر اعلان کرتا ہوگا، استغاثہ کرتا ہوگا کہ:

''انا ابن محمد المصطفیٰ وانا عطشان، انا ابن علی المرتضیٰ وا ناعطشان، انا ابن فاطمة الزهرا وا ناعطشان''۔

برابر استغاثہ کرے گا، پیاس کا ذکر کرے گا مگر کوئی قطرۂ آب دینے والا نہ ہوگا۔ آ گیا وہ وقت، بیکسی کا عالم ہے اور تنہا میرا امامؑ! کبھی نانا کا نام لیتا ہے، کبھی باپؑ کا نام لیتا ہے، بتاتا ہے کہ کس نانا کا نواسہ ہوں، کس باپ کا بیٹا ہوں، کس ماں کا فرزند ہوں، مگر کس کو رحم آتا ہے؟ اتنا جتنا امامؑ اپنے آپ کی پہچان کرواتے جاتے ہیں، اُتنا اُتنا تیروں کا مینہ آپ پر برستا جاتا ہے۔ تیروں کی شمار نہ رہی۔ اتنی مہلت بھی نہیں کہ بدن پر لگتے ہوئے تیروں کو ہاتھ سے نکال دیں۔ جب تیروں پر تیر برسے، خدا جانے کتنے تیر برس گئے۔ بے شمار تیر اور ایک جسمِ اقدس۔ تیروں کا شمار نہ رہا، ہاتھ سے نکال نہیں سکتے۔ مشہور یہ ہے، روایات میں آیا ہے کہ امامؑ نے اپنے ہاتھ سے تین تیر نکالے ہیں۔ تقریر کرتے ہوئے، پیاس کا ذکر کرتے ہوئے، ایک تیر تالو پر لگا، امامؑ نے اس تیرِ ظلم کو نکال کر پھینکا ہے۔ پیشانیٔ اقدس پر تیر لگا، امامؑ نے اس تیر کو بھی نکالا ہے۔ تیر نکلنے پر خون بہنے لگا، امامؑ نے بہتے ہوئے خون کو پونچھنے کیلئے دامنِ قبا اٹھایا۔ خون کو پونچھ رہے تھے، دامن اٹھا ہوا تھا۔ کسی نے اُسی حالت میں امامؑ کے سینے پر تیر مارا۔ یہ تیر قلبِ اقدس پر لگا اور اتنا بھاری تیر لگا سامنے سے اور امامؑ نے پشت سے کھینچا۔ تیر نکال رہے ہیں اور کہتے جاتے ہیں:

''بِسْمِ اللّٰهِ وَ بِاللّٰهِ وَ عَلٰى مِلَّتِ رَسُوْلِ اللّٰه''

اس آخری تیر کے بعد سوارِ دوشِ محمدؐ سے گھوڑے پر سنبھلا نہیں جاتا۔

بلند مرتبہ شاہ زصدر زیں افتاد
اگر غلط نہ کنم عرش بر زمین افتاد

ضمیر کہتا ہے کہ نانا نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے ہوں گے، ماں نے گود میں لینے کی کوشش کی ہوگی۔ اللہ، اللہ۔ وہ بے شمار زخموں کا زخمی گھوڑے سے گر رہا ہے، زمین تک پہنچتا نہیں، اُن تیروں نے روک لیا ہے، جو جسم میں پیوست تھے۔

ہزاروں درود و سلام ہوں اُس زخمی پر جس کا جنازہ تیر اٹھائے ہوئے ہیں۔

الا لعنة اللّٰه علی القوم الظالمین

" مولانا شہید کی تقریریں ہوں یا تحریریں، دونوں میں قدر مشترک آپ کا منفرد طرزِ استدلال اور سلاستِ زبان اور بیان ہے۔ استدلال اس درجہ محکم و مستحکم کہ ہر مخالف دلیل کے لیے برہان قاطع اور ہر معترض کو قائل کردینے والا۔ سلاستِ زبان و بیاں اس درجہ دلکش، دل پسند کہ ہر سامع اور ہر قاری کے قلب و ذہن کو مسخر کرنے کے لیے تمام تر قوتوں کی حامل "

(ہادی نقوی صاحب مدظلہٗ)

" فنِ تحریر اور فنِ تقریر دونوں ہی محمدؐ و آلِ محمدؐ کے علوم کی تبلیغ کے سلسلہ میں کام آتے رہے ہیں۔ ایسے علماء اور ادباء کم ہی نظر آئے جو بیک وقت دونوں فنون پر دسترس رکھتے ہوں۔ دورِ جدید میں علامہ علی نقی مرحوم کے بعد مولانا سیّد محمد جعفر شہید نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے مفاہیم قرآنی نہایت واضح اور تفصیلی رنگ سے آشکار کیے ہیں "

(سیّد وحید الحسن ہاشمی)

" مولانا سیّد جعفر زیدی شہید کی مجالس کا یہ مجموعہ، جو اُن کی پوتی محترمہ انجم مسعود صاحبہ نے نہایت جانفشانی اور عرق ریزی سے ترتیب دیا ہے، نہ صرف مومنین کے ذوقِ عزا کی تسکین بلکہ علماء و خطباء کے ذوقِ خطابت کی تربیت کا نہایت عمدہ سامان ہے "

(سیّد نیاز محمد ہمدانی)